’’چہارسُو‘‘

..... جلاوطنی اور سلطنت .....

کامیو کے "اجنبی" سے کون فکشن کا رسیا واقف نہیں ہوگا۔سارتر کی طرح کامیو بھی وجودیت کا پرچارک، مفکر اور تخلیق کار ہے۔۔۔لیکن اس کی کہانیوں کے مطالعے کے دوران اس کی فکر سمندر کی لہروں کی طرح لپک لپک کر قاری کے منہ پر چھینٹے نہیں اڑاتی۔۔۔کامیو کی ہر کہانی بڑا خاموش سمندر ہے۔جس میں اس کی فکر زیریں سطح پر ہمکلام ہوتی ہے لیکن اوپری سطح پر کہانی کی گرفت اپنے رنگ دکھاتی جاتی ہے گویا داخل اور خارج ساتھ ساتھ ہیں جس میں سوائے قاری کی اعلی ذوقی کے کوئی شے حائل نہیں ہوسکتی، یہی وجہ ہے کہ فکشن کا ایک ''مضبوط قاری'' اس کے دونوں پہلوؤں کا احساس کرسکتا ہے۔مضبوط قاری سے مراد وہ قاری جو خواتین ڈائجسٹ اور سطحی کہانیوں سے نکل کر دنیا کے معیاری ادب کا کافی حد تک مطالعہ کر چکا ہو، ورنہ کامیو کی یہ کہانیاں ایک عام قاری کے لیے بوریت کا باعث ہوں گی۔ایسی کہانیاں جن کا، شاعری کے برعکس، تجزیہ کرتے ہوئے اہل نقد ونظر کو بھی پسینہ آجائے۔اس مجموعے کی کہانیاں بہت پائے کی کہانیاں ہیں۔۔۔جنھیں شوکت نیازی نے خوبصورتی سے اردو قالب میں ڈھالا ہے۔۔۔

..... اعجاز روشن

..... اردو نظم کے نئے آفاق .....

ڈاکٹر جواز جعفری تخلیقی انہماک رکھنے والے اصیل شاعر ہیں مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان کے پیش رو نظم نگاروں نے جہاں اپنی نظم نگاری کا اختتام کیا، جواز جعفری نے وہیں سے آغاز کیا ہے۔ان جیسے اعلیٰ فکری وفنی معیار کی مثال معاصر (نثری) نظم کی روایت میں نظر نہیں آتی اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے پانچ نظمیہ مجموعوں میں پابند، معرا اور آزاد نظم موجود نہیں جب کہ دیگر نثری نظم نگاروں نے جز وقتی طور پر پابند، معرا اور آزاد ہیت کو شامل کیا ہے۔یوں معاصر نظم نگاروں کی صف میں ڈاکٹر جواز جعفری فل ٹائم نظم نگار واقع ہوئے ہیں۔یہ اختصاص انہیں غیر روایتی شاعر کے طور پر سامنے لاتا ہے۔آزاد نظم کو آغاز میں ن۔م۔راشد اور میراجی جیسے بڑے شاعر مل گئے اس لیے یہ ہیت جلد مقبول ہوگئی نثری نظم میں یہ اعزاز ڈاکٹر جواز جعفری کو حاصل ہوا ہے۔ان سے متاثر ہوکر متعدد غزل گو شعرا نثری نظم نگاری کا آغاز کر چکے ہیں۔ڈاکٹر جواز جعفری وہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے اپنی اور اپنے بعد آنے والے شعراء کی نسلوں کے علاوہ اپنے سینئرز کو بھی متاثر کیا ہے۔

..... ڈاکٹر ساحل سلہری

..... ملکہ نسیم کی شعری کائنات .....

ملکہ نسیم کی شاعری سے پرانی شناسائی ہے ملاقاتیں شاید ایک دو ہی ہیں اودے پور اور جودھ پور کی ملاقاتیں یاد ہیں اس وقت معظم بھائی باحیات تھے ملکہ صاحبہ سے ملاقات ہوئی تو ویسا ہی پایا جیسا میں نے سوچا تھا ان کی شخصیت اور شاعری میں کوئی مغایرت نظر نہیں آئی بہت خلوص اور محبت سے ملیں ان کی شاعری میں جو شستگی ہے وہی شائستگی ان کی شخصیت میں ہے زمانہ طالب علمی میں انہیں پڑھا تھا اس لیے ان کی ذات سے عقیدت سی ہوگئی تھی۔اودے پور میں معظم بھائی نے ان کا مسودہ دیا تھا وہ چاہتے تھے کہ میں بھی کچھ لکھوں مگر میں کچھ مجبوریوں اور مصروفیات کی وجہ سے نہیں لکھ سکا مجھے بڑی ندامت ہو رہی ہے کہ معظم بھائی کی خواہش کا احترام نہیں کر پایا ملکہ نسیم کی شعری کائنات چھپ کر آئی تو میری ندامت اور بڑھ گئی۔مجھے ملکہ نسیم کی شاعری بہت پسند ہے اس کتاب کے اوراق الٹے تو ان کی غزلیات کے انتخاب پر نظر پڑ گئی شعر پڑھتا گیا سر دھنتا گیا کیا غضب کی شاعری ہے ہر مصرع بولتا ہوا سا:

بادباں درد کے کھل جائیں گیپلکوں پہ تری
میری آنکھوں میں سمندر کی کہانی رکھ دے

توبہ وہ انتظار کا عالم نہ پوچھیے
پلکوں پہ اشک بن کے تمنا ٹھہر گئی

شدت تشنہ لبی آج کہاں لائی ہے
پیاس صحرا کی سمندر میں اتر آئی ہے

تمام دن کی تھکن قید کر کے آنکھوں میں
ڈھلی جو شام ترا انتظار کرتے رہے

میں ڈاکٹر شاہینہ تبسم کی مرتب کردہ کتاب ملکہ نسیم کی شعری کائنات پڑھ رہا ہوں جلد ہی ملکہ نسیم کی شاعری پر لکھ کر معظم بھائی کی محبتوں کا قرض تو نہیں اتار پاؤنگا ہاں ان کی محبتوں کو خراج پیش کرنے کی ضرور کوشش کرونگا۔

..... حقانی القاسمی

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۳۳،شمارہ:جنوری،فروری۲۰۲۴ء

بانی مدیرِاعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِسالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیرِ مسؤل

گلزار جاوید

○☆○

مدیرانِ معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

آمنہ علی

رابطہ:537/D-1، گلی نمبر18،ویسٹریج-III،راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:8730433-8730633-51-(92+)

موبائل:0558618-336-(92+)

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

متاعِ چہارسو

سرِورق، پسِ ورق ــــــــ شعیب حیدر زیدی
تزئین ــــــــ عظمٰی رشید
کمپوزنگ ــــــــ محمد عبداللہ

قرطاسِ اعزاز

خوش گواری کی خوبیانیاں ــــــــ معین نظامی ۵
سائیں کمال خان شیرانی ــــــــ نجیبہ عارف ۶
براہِ راست ــــــــ گلزار جاوید ۸
ریگ زاروں کا سفر ــــــــ فاری شا ۱۷
فیضانِ نظر ــــــــ محمد سلیم الرحمٰن ۲۰
نجیبہ عارف کی افسانوی تشکیل ــــــــ مبین مرزا ۲۳
تیرگی کا علامتی بیانیہ ــــــــ کامران شہزاد ۲۶
میٹھے نلکے ــــــــ انوار احمد ۲۷
راگنی کی کھوج ــــــــ سلمٰی اعوان ۲۸
تصوف میں ڈوبی آپ بیتی ــــــــ نعیم الرحمٰن ۳۰
سونے کی گڑیا چاندی کے بال ــــــــ حمید شاہد ۳۴
من سے من کا ملن ــــــــ سلیم سہیل ۳۶
عقل و دلیل کی بات ــــــــ ڈاکٹر ضیاء الحسن ۳۷
جستجو کا ثمر ــــــــ شکیل خان ۴۰
ایک جھوٹی کہانی میں ــــــــ فرخ ندیم ۴۱
علمی و ادبی جہات ــــــــ ڈاکٹر بی بی امینہ ۴۴
خلوت کی سماں بندی ــــــــ عطیہ سکندر علی ۴۷

افسانہ

جھوٹی کہانی ــــــــ نجیبہ عارف ۵۰

ناول کا باب

مکھوٹا ــــــــ نجیبہ عارف ۵۳
کلماتِ حسن ــــــــ فرحان افتخار ۵۷

ربِ سماوات

نسیمِ سحر، عارف نقوی ۵۸

افسانے

جنبشِ لب ــــــــ شہناز خانم عابدی ۵۹
نیا رواج ــــــــ مشتاق احمد وانی ۶۲
دو لاکھ روپے کا چیک ــــــــ عمران عاکف ۶۴
جمیلہ ــــــــ ولاء جمال العسیلی ۶۵
تماش بین ــــــــ وسیم عقیل ۶۷

مشقِ تغافل

میلا رام وفا، نسیم سحر، پرتپال سنگھ، قیصر نجفی، ایوب خاور، اسلم راہی، اشرف جاوید، فیصل عظیم، ڈاکٹر ریاض احمد، نبیل احمد نبیل۔ ۶۹

افسانے

کیڑے مکوڑے ــــــــ تابش خانزادہ ۷۴
سائنس دانوں کا قبرستان ــــــــ توصیف تبسم ۷۵
ٹابلیٹ ــــــــ جبیں نازاں ۷۹
قوتِ پرواز ــــــــ رئیس صدیقی ۸۱
نئی فیکٹری ــــــــ ذاکر فیضی ۸۲

دوستی کے سراب

نوید سروش، نذیر فتح پوری، سہیل ضرار خلش، ڈاکٹر قطب سرشار، تصور اقبال، اکمل شاکر، فرح کامران، اصغر شمیم، طارق قمر، ارشد سعید، مادھو کوشک، مہناز انجم، غلام حسین ساجد، سبھاش گپتا شفیق، شازیہ اکبر۔ ۸۹

ناول

خاکِ شفا ــــــــ پیرزادہ آلِ انوار ۹۴

حقیقت کا شعور

عبداللہ جاوید، جواز جعفری، ثروت زہرا، فرح کامران، فیصل عظیم، علی شاہد، نزہت شاہ، پریتی اگیات۔ ۱۰۸

آئینۂ فن

ایک معدوم کہانی ــــــــ سعید اختر ملک ۱۱۲

ایک صدی کا قصہ

چندولال شاہ ــــــــ دیپک کنول ۱۱۴

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین ــــــــ وجیہ الوقار ۱۱۸

قرطاسِ اعزاز

ڈاکٹر

نجیبہ

عارف

کے نام

خوش گواری کی خوبانیاں

سلیمہ کہاں ہو
کھوٹا کی رانی سلیمہ کہاں ہو
کھوٹا بھی کیا راج دھانی ہے
لمبی کہانی ہے
جس کے خم و پیچ کے ہر رگ و پے میں
تم ہو
کہیں تم وہی تو نہیں ہو
جسے ایک مدت سے مَیں جانتا ہوں
جسے دور کے ایک نزدیکی سائے کے مانند
پہچانتا ہوں
مجھے جان پہچان سے سیکڑوں نوری سالوں کی دوری پہ
جن جو گیا رنگ پہنے ملنگوں کے ڈیرے پہ
اک اجنبیت ملی تھی
وہیں ایک بدلے ہوئے بھیس میں
ایک گدڑی میں لپٹی ہوئی واقعیت ملی تھی

سنو
لفظ و معنی کے ایسے پہاڑی علاقوں میں رہنا
جہاں خوش گواری کی خوبانیاں
قافلے سے بچھڑ جانے والے مسافر کے منہ میں
کچھ اس طرح گھلتی ہوں
جیسے بتاشے
سنو، تشنگی کے احاطے میں
تم سطر در سطر جھرنوں کی لے بن کے بہنا
جسے سہنا مشکل لگے، وہ نہ سہنا
جہاں جو بھی جی چاہے کہنا
گلہری نہ بننا
گلہری کو پہلے پہل مَیں نے
بچپن کی دل چسپ حیرت میں دیکھا تھا
لیکن پھدکتی ہوئی اس شرارت کی معصوم آنکھوں کی
بے معنویت سے نا متفق تھا
گلہری نہ بننا

(معین نظامی)

سائیں کمال خان شیرانی

نجیبہ عارف

باوجود اس کے کہ سائیں کمال خان شیرانی پختونخوا ملی پارٹی کا بنیادگزار تھا اور میں ایک ٹھیٹ پنجابی۔۔۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک سوشلسٹ تھا اور میں پکی عقیدے والی۔ مجھے کارل مارکس کی بہت سی باتیں پسند ہیں لیکن ایک دو نہیں بھی پسند۔۔۔ اور باوجود اس کے کہ میں اُس سے کبھی ملی نہ اسے دیکھا، نہ اس کے بارے میں کچھ سنا، نہ جانا، نہ میں کبھی بلوچستان گئی، نہ کبھی وہ سنگلاخ چٹانیں دیکھیں، نہ انگور کی بیلوں سے چھتے ہوئے اس کے مہمان خانے کی پتھریلی سلوں کے صوفے پر نیم دراز ہو کر سورج کے رخ پر رکھ کر وہ کتابیں پڑھیں جو دنیا بھر سے اُس کے پاس پہنچ جاتی تھیں۔۔۔ پھر بھی مجھے اس سے شدید اور گہری وابستگی محسوس ہو رہی ہے۔

محبت کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے، ورنہ شاید محبت ہی کہہ دیتی۔ لیکن میں کون سا بلوچستان کے دور دراز پہاڑوں کی درزوں میں روشنی کی طرح رہنے والے لوگوں میں سے ایک ہوں کہ جو سوچوں بلا جھجک کہہ ڈالوں۔ میں تو ایک ''متمدن'' معاشرے کی فرد ہوں جہاں الفاظ پر ہی نہیں، جذبوں پر بھی روک ٹوک ہوتی ہے، کاٹ چھانٹ ہوتی ہے، پوچھ گچھ ہوتی ہے۔ جہاں ہر شے کو اعتدال کے بندی خانے میں رکھنے کی پابندی ہوتی ہے، جہاں، زندگی کو ایک خاص ڈھب سے گزارنے، مخصوص اور طے شدہ راستوں سے کبھی نہ اترنے اور معمول کو جاری رکھنے کی رسم لازمی نبھانی پڑتی ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ کیا شے ہے جس کی طرف میرا دل سینے سے نکل کر، ہمک ہمک کر، بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے کسی عمر قید کے قیدی کو اپنے بھولے بسرے وطن کی جھلک دکھائی دے جائے، جیسے کسی چالیس دن کے روزہ دار کو اپنے پسندیدہ کھانے کی مہک ستائے یا جیسے کوئی خواب میں اپنی کھوئی ہوئی جنت کا منظر دیکھ لے۔

آخر کون تھا سائیں کمال خان شیرانی؟۔

میں نے تو پہلی بار اس کا نام سنا ہے، بلکہ پڑھا ہے۔ ہوگا کوئی، مجھے کیا۔ لیکن یہ پہلی بار کی آشنائی اس قدر دل گیر کیوں کرتی ہے؟ کیا وہ سچ مچ ویسا ہی تھا جیسا ڈاکٹر شاہ محمد مری نے اسے لکھ ڈالا ہے یا یہ ڈاکٹر صاحب کے قلم کی جادو بیانی ہے؟ مگر شاہ محمد مری بھی تو نرا ڈاکٹر نہیں ہے۔ وہ بھی تو انہی پہاڑوں کی مضبوط پناہ گاہوں سے ابھرا ہوا سورج ہے جو بلوچستان کے ماتھے پر جھومر کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔

بلوچستان۔۔۔ جہاں میں کبھی نہیں گئی۔ لیکن جس کا نام سنتے ہی میرا دل اس کی طرف لپکتا ہے۔ کیوں؟ یہ میں نہیں بتا سکتی۔ بلوچستان کیوں میرے اندر ہل چل مچاتا ہے اور جب کہیں کوئی بلوچستان میں خون بہاتا ہے، گولی چلاتا ہے، بم پھاڑتا ہے تو میرا دل کیوں کٹ کر رہ جاتا ہے، یہ میں نہیں جانتی۔ لیکن یہ میں ضرور بتا سکتی ہوں کہ بلوچستان کا شاہ محمد مری اپنے اکھڑ لفظوں اور قدرے تلخ لہجے کے باوجود اپنے اندر بہتی میٹھے چشموں جیسی سچائی کو نہیں چھپا سکتا۔ وہ بڑا صاف گو اور منہ پھٹ بننے کا شوقین ہے لیکن اس کے لفظوں سے دردمندی کی لپٹیں اٹھتی ہیں اور انسان دوستی کی آنچ سے اس کا سارا اکھڑ پن پگھل کر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے وطن کی چٹانوں کی طرح سنگلاخ ہونے کا ناٹک کرتا ہے لیکن صاف نظر آتا ہے کہ اندر سے چنبیلی کے پھول کی طرح نازک اور شرمیلے جذبوں سے مہک رہا ہے۔

میں یہ سب باتیں کیسے کہہ سکتی ہوں جب کہ میں نے صرف ایک بار لاہور میں ایک بڑے ہال کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر، اسے دور سٹیج پر کھڑے بولتے دیکھا اور سنا ہے۔ وہ ادیبوں اور شاعروں کو کھری کھری سنا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ زبان ادیب اور شاعر نہیں بناتے، زبان صحرا میں اونٹوں کی نکیل پکڑ کر چلنے والے ساربان بناتے ہیں، زبان جنگل میں بھیڑیں چرانے والے چرواہے بناتے ہیں۔۔۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ میں نے یہ جملے اپنی کمزور یادداشت کے سہارے لکھے ہیں۔ اس وقت تک مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ شاہ محمد مری کون ہے؟ لیکن اس کی اپنی نثر میں ایک ایسا جادو تھا جیسا صحرا کی شاموں اور ستاروں بھرے آسمان میں ہوتا ہے۔ بالکل خالص، بناوٹ اور سجاوٹ سے پاک، قدرتی مناظر کی طرح تصنع سے خالی اور جمال سے لبالب۔ سچے شاعروں اور اصلی ادیبوں کی تخلیق جیسا۔

مجھے اس کی نثر نے، اس کے بیساختہ اور مختلف سے لہجے نے اور اس کی تلخ نوائی نے چونکا دیا اور میں نے ادھر ادھر سے پوچھا،

''کون ہے یہ؟''

اسلام آباد واپسی کے لیے جہاز میں بیٹھی تو اگلی نشست پر وہ بھی براجمان تھا۔ میں نے اس کا فون نمبر لے لیا۔ پھر اس کا رسالہ ''سنگت'' ملا۔ اور باقاعدگی سے ملنے لگا۔ تب کچھ کچھ اس کے گن کھلے۔ پھر اس نے کبھی کبھی اپنی کتابوں کا تحفہ بھیجنا شروع کیا۔ میں تو پہلے ہی اس کی نثر کی مداح تھی۔ اور بھی قائل ہو گئی۔ لیکن آج جو ہوا، وہ اور ہی تھا۔ اس کی چار کتابیں تو دو تین دن سے آئی رکھی تھیں اور میں نے ہمیشہ کی طرح فرصت کے وقت کی امید میں میز پر رکھ چھوڑی تھیں۔ لیکن آج جب میں دفتر سے گھر آئی تو دل اداس تھا۔ میں کوئی کام نہیں کرنا چاہتی تھی، اور اپنا دل بہلانا چاہتی تھی۔ بغیر کسی خاص وجہ کے، میں نے ڈھیر میں سب سے اوپر رکھی کتاب اٹھالی۔ کتاب کا نام تھا ''سائیں کمال خان شیرانی''۔ یہ اس کی سیریز ''عشاق کے قافلے'' کی انیسویں کتاب تھی اور اس کتاب کا یہ تیسرا ایڈیشن تھا۔ میں نے اس سیریز کی ایک آدھ کتاب پہلے بھی پڑھی تھی۔ بغیر کسی خاص توقع کے میں نے کتاب کھول لی اور پڑھنے لگی۔ پہلے چند صفحات ہی نے مجھے حیران کر دیا۔ باندھ لیا۔ میں نے کتاب ختم کیے بغیر ہاتھ سے نہیں رکھی۔ کسی کتاب کے ساتھ یوں جڑ کے رہ جانا، کم عمری میں اکثر ہوا کرتا تھا لیکن پھر میں کبھی

کبھار کے سوا اس لطف سے محروم ہوتی گئی۔ یقیناً اس میں قصور میرا ہی ہوگا، کتابوں کا نہیں۔ اس کتاب کے صفحات سے ایک انسان ابھرا۔ سچ مچ کا انسان مگر داستانوں کے کردار جیسا مافوق الفطرت اور دیومالائی انسان، سائیں کمال خان شیرانی۔ کیسا عجیب انسان تھا وہ۔ ایسے انسان تو خوابوں اور کتابوں ہی میں ملتے ہیں۔ کتنا خوش قسمت ہے شاہ محمد مری جسے اس کی رفاقت نصیب ہوئی۔ بدنصیبی تو میری ہے کہ مجھ سے ملنے سے پہلے ہی وہ مرگیا۔

مجھے تو ہمیشہ سے یہ چاہ رہی ہے کہ ایسے انسانوں کو ملوں، ان کی چھاؤں میں بیٹھوں، ان کی باتیں سنوں اور اپنے سوالوں سے ان کا سر کھاؤں، جو کاغذوں میں نہیں، حرفوں اور لفظوں میں نہیں، باتوں اور حکایتوں میں نہیں، شعروں اور تصویروں میں نہیں، اپنے خون کی سچائی میں جی کر دکھاتے ہیں۔ جو وہ سب کچھ کر پاتے ہیں جو کرنے کو ان کا جی چاہتا ہے۔ جو اس طرح جی سکتے ہیں جس طرح جینے کو وہ بہتر اور برتر خیال کرتے ہیں۔ خواہ اس کے لیے انھیں اپنی پکی نوکریوں سے استعفیٰ دینا پڑے، خواہ گھر کا چولہا جلانے کے لیے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانی پڑیں، خواہ دیواروں پر دونوں ٹانگیں رکھ کر فرش کی سلوں پر لیٹ کر سورج کی روشنی میں اپنی پسندیدہ کتابیں پڑھنی پڑیں۔

میں جانتی ہوں کہ یہ سب کچھ ایک رومانی خواب کی طرح غیر حقیقی ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ایسی افسانوی زندگی اتنی آسان نہیں ہوتی۔ اس میں صرف کتابیں اور خواب نہیں ہوتے۔ انگور کی بیلوں سے گھرے اور چھتے ہوئے مہمان خانے کا تصور کتنا ہی رنگین اور خواب ناک معلوم ہوتا ہو، لیکن اس کا مستقل حصہ بن جانا اتنا رنگین نہیں ہوسکتا۔ انگور کی بیلوں سے سانپ بھی لپٹ جاتے ہیں اور پتھر کی سلوں پر کمر بھی تختہ ہوجاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود زندگی اپنے سامنے کچھ خواب تو رکھتی ہے جو اسے آگے بڑھنے کی امید میں مبتلا رکھتے ہیں۔ شاہ محمد مری نے اپنی کتاب میں ایسے دیوانے کی تصویر کھینچی ہے جیسے دیوانے شہروں میں نہیں ملتے۔ ایک ایسا شخص جو اپنے سامنے ایک آدرش رکھتا ہے۔ پھر اس آدرش کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ پرانی کہانیوں کے کسی سورما لکڑ ہارے کی طرح شہزادی کے سوالوں کا جواب ڈھونڈنے۔ تہی دست، ننگے پاؤں، بے آسرا، بے وسیلہ۔ اس کی شہزادی پوچھتی ہے، سب انسان برابر کیوں نہیں؟ حقوق میں، سہولت میں، زندگی کے برتاؤ میں؟ وہ سب انسانوں کے لیے برابری ڈھونڈنے نکل پڑتا ہے۔

اس کی شہزادی کہتی ہے، لوگ جو کہتے ہیں وہ کرتے کیوں نہیں؟ وہ خاموش ہوجاتا ہے اور کچھ کہنے کے بجائے کچھ کر کے دکھانے لگتا ہے۔ وہ نعرے نہیں لگاتا، اپنے خیالات اور نظریات کی نمائش نہیں لگاتا، اپنے ارادوں کا اعلان اور اظہار نہیں کرتا۔ بس خاموشی سے انھیں جینے لگتا ہے۔ وہ جی کر بتاتا ہے کہ یہ ہے میرا نظریہ۔ ایسے جینا چاہیے۔ یہ انداز نبیوں اور رسولوں کی سنت ہے۔ اس سنت کو سب بھولتے جاتے ہیں۔ نبی اور رسول کے ماننے والے بھی۔ اور نبی اور رسول کو نہ ماننے والے بھی۔ مگر وہ اس سنت کو زندہ کر جاتا ہے۔ اپنے نظریے، اپنے یقین کی مٹی سے اپنی زندگی کا ڈھانچا اسارتا ہے۔ خود اپنے ہاتھ سے اپنی تعمیر کرتا ہے اور ایک نمونہ بنا کر چھوڑ دیتا ہے۔ یہ نمونہ ہاتھ میں لے کر گھر گھر نہیں جاتا کہ دیکھو، لوگو، میں نے یہ عمارت اساری ہے۔ تم بھی میری پیروی کرو۔ بس اطمینان اور شانتی کے ساتھ، اپنی مشقت سے حظ اٹھاتا ہوا، وہ اپنی طرح کی زندگی جی کر دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔ دنیا دیکھتی رہ جاتی ہے۔

مجھے اسی اطمینان بھری زندگی کی تلاش ہے۔ ایسی زندگی جس میں انسان کو تسلی ہو کہ اس نے اپنی ہمت بھر کوشش کر ڈالی ہے۔ جو ڈھونڈنا تھا، وہ ملا یا نہیں، مگر اسے ڈھونڈنے میں پوری جان ماردی ہے۔ خود کو اپنی محبت میں پوری تسلی اور دلجمعی سے کھپایا ہے۔ بغیر کسی خوف کے، بغیر کسی لالچ کے، بغیر کسی شک وشبہے کے۔

کیسا عجیب تھا سائیں کمال خان شیرانی اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس کا نام میرے سامنے لکھا ہوا ہے۔ اس کی سفید داڑھی، دانا آنکھوں اور شکنوں بھری پیشانی والے چہرے کے عین اوپر۔ جلی حروف میں سائیں کمال خان شیرانی۔ لیکن میں جب بھی اسے پڑھتی ہوں تو کہتی ہوں سائیں کرم خان شیرانی۔ وہ کمال خان تھا، مجھے معلوم ہے۔ لیکن میرے اندر کوئی اسے کرم خان کیوں کہہ رہا ہے، میں نہیں جانتی۔ ضرور کرم سے اس کی روح کا کوئی گہرا رشتہ ہوگا۔ ہمارے گاؤں میں مائیں پیار سے اپنے بیٹے کو کہتی ہیں، کرماں آلا (کرموں والا)۔ سائیں بھی کرموں والا تھا۔ بلکہ کرموں والا ہے۔ اگر وہ ''تھا'' ہوگیا ہوتا تو اس کا کرم میرے کرموں پر کیسے سایہ فگن ہوتا۔

ژوب کے عیسیٰ خان کا بیٹا کمال خان پہلے ایک پہاڑی گاؤں کرم میں پڑھنے گیا تھا۔ زلزلے سے تباہ شدہ کوئٹے کا سنڈیمن ہائی سکول اس وقت پشین میں منتقل ہوچکا تھا اور اس میں صرف سکالرشپ حاصل کرنے والے بچوں کو داخلہ ملتا تھا۔ اسی سکول سے کمال خان نے میٹرک کی سند بھی حاصل کی اور اقبال کی شاعری سے محبت کے اشتراک نے اسے دو ایسے دوست بھی عطا کیے جن سے زندگی بھر محبت اور نظریاتی اشتراک کا رشتہ قائم رہا۔ یہ دوست تھے خدادادا اور ماما عبداللہ جمالدینی۔ پھر وہ اور جمال دینی دونوں علی گڑھ جاتے جاتے، اسلامیہ کالج پشاور پہنچ گئے۔

اسلامیہ کالج پشاور کی شاندار عمارت اس وقت ایک عظیم الشان درس گاہ کا رتبہ حاصل کرچکی تھی جہاں شام محمد مری کے الفاظ میں ''خطے کے چند قابل ترین اساتذہ متعین تھے''۔ ان میں سے ایک استاد کا نام صاحب زادہ ادریس تھا جو جسمانی معذوری کی وجہ سے وہیل چیئر پر بیٹھ کر چلتا پھرتا تھا۔ صاحب زادہ صاحب نے پشاور اور اردگرد کے دیہات سے آئے لڑکوں کو؛ جن کے گاؤں میں نہ دھوبی ہوتا نہ نائی؛ گورکی اور گوئٹے، ہیگل اور اینگلز، رسل اور برنارڈ شا کی لت ڈال دی۔ انھیں سوچنا اور سوال کرنا سکھا دیا۔ سائیں کمال خان شیرانی اور اس کے دوست جمال دینی کے ذہنوں پر صاحب زادہ کی لگائی ہوئی مہر زندگی بھر کوئی نہ مٹا سکا۔ ان کے نظریات اسلامیہ کالج کی فضا میں خوب پختہ ہوگئے اور وہ انقلاب

باقی صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ کیجیے

براہِ راست

وطن عزیز میں خواتین کی عزت و احترام کی نسبت بلند بانگ دعوے کیے جاتے ہیں مگر عددی اکثریت کے باوجود خواتین کو ان کا جائز حق دینے کی بابت عملی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ دور نہ جایئے اردو ادب میں خواتین کی تعداد آبادی کی مناسبت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس قدر قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود خواتین اہلِ قلم کو جان جوکھم میں ڈال کر اپنا آپ منوانا پڑتا ہے۔

آج کی نشست ایک ایسی باہمت، پُر جوش اور پُر عزم خاتون ڈاکٹر نجیبہ عارف کے اعزاز میں سجائی گئی ہے جنھوں نے مرد ساختہ معاشرے میں تمام رکاوٹوں اور مشکلات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کر کے یہ ثابت کر دیا:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

آیئے ڈاکٹر نجیبہ عارف کے قلمی کمالات کے بغور مطالعے کی روشنی میں نہ صرف ان کے جائز مقام کا تعین کیا جائے بلکہ زبانی طور پر نصف بہتر کی فضول خرچی کرنے کے بجائے خواتین اہلِ قلم کی راہ میں حائل تمام دشواریوں کو دُور کرنے کی سبیل نکالی جائے۔

---- گلزار جاوید

☆ حسبِ روایت اور حسبِ ضرورت گفتگو کا آغاز آبائی تعلق اور خاندانی زعما کے حوالے سے کیا جائے تو بہت سے معاملات کی خود بہ خود عقدہ کشائی ہو جائے گی؟

☆☆ میرا تعلق اس طبقے سے ہے جسے عوام کہا جاتا ہے۔ یوں تو خاندان کے کئی افراد نامور بھی ہوئے اور دولت و طاقت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوئے مگر یہ سب کچھ ان کی اپنی محنت و کوشش کا نتیجہ تھا، کسی خاندانی یا نسلی جاگیر یا منصب کی دین نہیں تھا۔ البتہ خود میرے لیے میرے خاندان کی حیثیت بہت اہم ہے۔ والد کی طرف سے ہم کشمیری النسل ہیں اور ہماری گوت میر ہے۔ خاندان کی کچھ شاخیں بٹ بھی کہلاتی ہیں۔ دادا میر رحمت علی اپنے خاندان کے ہمراہ امرتسر سے ہجرت کر کے سرگودھا میں آباد ہوئے اور یہیں وفات پائی۔ وفات سے بہت پہلے نابینا ہو گئے تھے اور مرتے دم تک امرتسر دوبارہ جانے کے خواب دیکھتے رہے۔ والد میر ظفر علی نے جوانی کے ایام والدین اور بہن بھائیوں کی دیکھ بھال میں بسر کر دیے اور چالیس سال کی عمر میں شادی کی۔ ہم بہن بھائی کشمیری اور امرتسری روایت سے زیادہ مانوس نہیں ہو سکے کیوں کہ ہماری پرورش خوشاب میں اپنے ننھیال کے زیرِ اثر ہوئی، جہاں میری والدہ ہدیہ شاہ گرلز ہائی سکول میں استاد تھیں۔

میرے نانا سید شاہ محمد ہشیار پور کے سید گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان میں صوفیانہ روایت بہت مضبوط رہی ہے۔ خاندان کے جد امجد کا انڈیا میں مزار ہے جو اب تک عقیدت مندوں کا مرکز ہے۔ نانی کا تعلق وادیٔ سون سکیسر کے مردم خیز خطے کے اعوان قبیلے سے تھا۔ ان کا گاؤں انگہ شاہ بلاول ہے جو زندگی بھر ہمارا بھی گاؤں رہا۔ معروف شاعر احمد ندیم قاسمی بھی انگہ سے تعلق رکھتے تھے اور دُور کے رشتے سے نانی کے کزن تھے۔ نانی کے دادا، بابو نور حسین اپنے زمانے کے صوفی بزرگ کے طور پر جانے جاتے تھے اور گاؤں میں ان کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ گاؤں سے باہر ایک پہاڑی پر ان کی عبادت گاہ اب بھی نور حسین کی ڈل کے نام سے معروف ہے اور یہاں لوگ دعاؤں کی قبولیت کے لیے جاتے ہیں۔ ان کے چار بیٹوں میں سے تین مجذوب فقیر ہوئے۔ صرف ایک بیٹے حاجی فیض محمد نے متاہلانہ زندگی گزاری۔ وہ بچپن میں ہی گھر سے بھاگ کر پہلے کراچی اور پھر سعودی عرب سے ہوتے ہوئے عراق چلے گئے تھے۔ وہیں انھوں نے ایک عراقی عورت سے شادی کر لی اور بچوں کی پرورش کی۔ میری نانی نے اپنی ابتدائی زندگی عراق میں گزاری۔ ہمارے نانا سے ان کی شادی بھی عراق ہی میں ہوئی اور وہیں پہلے دو بچے بھی پیدا ہوئے، جن میں میری امی بھی شامل تھیں۔ بعد میں عربی بولتا ہوا یہ خاندان بغداد سے کراچی منتقل ہو گیا اور میری والدہ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کراچی میں ہوئی۔

اس تفصیل کا مقصد یہ بتانا ہے کہ میری رگوں میں دوڑنے والا خون بہت سی قوموں اور نسلوں کی خصوصیات کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ یہ میری زندگی کی ایک اہم حقیقت ہے اور میں اس کا اثر اپنے مزاج اور شخصیت پر بھی دیکھتی ہوں۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ مجھے اپنے سے مختلف لوگ، خواہ یہ اختلاف رنگ و نسل کا ہو یا عقیدے اور ثقافت کا، اجنبی نہیں لگتے بلکہ میری نظر ہمیشہ ان مشترک پہلوؤں پر ٹک جاتی ہے جو انھیں اور باقی سب انسانوں کو ایک رشتے میں پرو دیتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مجھے زندگی میں یکسانیت اور ٹھہراؤ سے بہت الجھن ہوتی ہے۔ مسلسل سفر میری زندگی کی منزل ہے اور اگر اس کا موقع نہ ملے تو مجھ میں احساسِ ناکامی و محرومی پیدا ہو جاتا ہے۔

☆ کچھ تعارف بچپن اور نوعمری کے مشاغل کا ہو جائے تو گفتگو آگے بڑھانے میں آسانی ہو جائے گی؟

☆☆ پڑھنا، پڑھنا اور صرف پڑھنا۔ میری زندگی بہت کم عمری میں کتاب سے جڑ گئی تھی۔ یہ کتاب مجھے میری امی نے پکڑائی تھی۔ امی سمجھتی تھیں کہ انسان کی

زندگی بلکہ آخرت میں بھی کامیابی کا دارومدار صرف اور صرف تعلیم ہے۔ وہ خود اپنی خواہش کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرسکی تھیں اور میٹرک کے بعد ایس وی کر کے ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی تھیں اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ ان کے بچے بہت پڑھیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب بچوں کے حقوق اور ان کی دلچسپیوں کو سمجھنے کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ کھیلنے کودنے کی اجازت ملتی تو تھی مگر کم کم۔ چھوٹے شہروں میں نہ تو پارک ہوتے ہیں نہ باغ، نہ تفریح کے دیگر ذرائع۔ دیگر شہروں کے سفر کچھ نہ کچھ کرنے کا موقع ملا تو پہاڑوں، جنگلوں اور دریاؤں کی کشش نے دل و دماغ کو جکڑ لیا۔ یوں میرا بچپن انھی دو کاموں میں گزر گیا۔ کتابیں، رسالے، اخبار، حتیٰ کہ بقول امی، جس کاغذ کی پڑیا میں سودا آتا اسے بھی کھول کھول کر پڑھنا؛ اور ان پہاڑوں، جنگلوں اور دریاؤں کے خواب دیکھنا، جو رسائی سے باہر کسی اور دنیا کا حصہ تھے۔

☆ شاعری آپ کا پہلا عشق کب اور کیونکر ٹھہرا نیز اُس کے اظہار کے طریقے کیا تھے؟

☆☆ شاعری سے بھی امی ہی نے متعارف کروایا تھا۔ وہ خود تو شعر نہیں کہتی تھیں مگر ان کی بیاض میں اس دور کے سب اہم شعرا کے کلام کا نمونہ مل جاتا تھا۔ جب انھوں نے مجھے تختی پر خوش خط لکھنا سکھایا تو اقبال اور حالی کے اشعار ہی سے ابتدا کی تھی۔ پھر چھٹی جماعت سے میں نے تحت اللفظ شعر خوانی اور بیت بازی کے مقابلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا اور بلا مبالغہ ہزاروں شعر یاد کر لیے۔ ویسے بھی اس زمانے میں شاعری ہمارے سماجی ماحول کا لازمی حصہ تھی۔ اور تو اور گھریلو عورتیں بھی تکیوں اور میز پوشوں پر کشیدہ کاری سے شعر کاڑھا کرتی تھیں۔ بسوں اور تانگوں پر بھی شعر لکھے ہوتے۔ روز صبح اسمبلی میں منظوم دعائیں دہرائی جاتیں جن میں سے مقبول ترین دعا علامہ اقبال کی تھی: ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' اس نظم کے اشعار غیر محسوس طریقے سے بچوں کی زندگیوں کا منشور بن جایا کرتے تھے۔ اس صورت حال میں ناممکن تھا کہ شاعری سے دلچسپی پیدا نہ ہوتی۔ چنانچہ ساتویں جماعت میں پہلا شعر کہا۔ پھر کئی نظمیں بھی سکول کے زمانے میں لکھیں مگر افسوس کہ راز فاش ہونے کے ڈر سے وہ بیاض ایک دن خود ہی پھاڑ کر پھینک دی۔ اس کا ملال اب تک ہے۔

☆ موقع کی مناسبت سے پہلا افسانہ لکھنے کے اسباب اور دو صد روپیہ انعام وصول کرنے کی روداد بھی بیان فرما دیجیے؟

☆☆ یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ امی نے پڑھنے کی لت تو لگا دی تھی مگر ہمارے مطالعے کو اپنی نگرانی سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھیں۔ انھیں اندازہ نہیں تھا کہ جن بوتل سے باہر نکل چکا ہے۔ امی ہمیں کوئی رسالہ دیتیں اور کہتیں یہ لو، بچوں کی کہانی پڑھ لو اور میں بچوں کی کہانی والے صفحے پر انگلی رکھتی اور پہلے صفحے سے آخری صفحے تک پورا رسالہ چاٹ ڈالتی۔ امی نے ساتویں جماعت میں نسیم حجازی کے ناول پڑھنے کی اجازت دی مگر انھیں پتا ہی نہیں چلا کہ میں اس سے پہلے ہی اس زمانے کے زنانہ رسائل میں چھپنے والے تمام رومانوی افسانے پڑھ چکی تھی جو ہماری خالہ سیدہ زینت آرا کی ملکیت تھے کیوں کہ وہ بھی ان دنوں ان رسالوں کے لیے افسانے لکھا کرتی تھیں۔ سو اندھا دھند اتنے افسانے پڑھنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک روز، جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی اور بہ مشکل تیرہ سال کی تھی، میں نے بھی ایک افسانہ لکھ ڈالا۔ یہ افسانہ بالکل اسی طرح کا تھا جیسے ان دنوں زنانہ رسالوں میں چھپا کرتے تھے۔ اب ڈر یہ تھا کہ امی نے افسانہ پڑھ لیا تو وہ پوچھیں گی، تمھیں ان باتوں کا کیسے پتا چلا اور اگر ان پر یہ راز کھل گیا کہ میں انھیں دھوکا دے کر ہر قسم کے افسانے پڑھتی رہی ہوں تو بہت ڈانٹ پڑے گی، بلکہ ہوسکتا ہے مار بھی پڑ جائے۔ چنانچہ مابدولت نے اپنے افسانے والی کاپی رضائیوں کے ڈھیر میں چھپا دی۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ میری چھوٹی بہن نوشی پراسرار انداز میں اس رضائیوں والے کمرے میں بار بار آ جا رہی ہے۔ میں ٹھٹھک گئی اور پھر بے چین ہو کر خود بھی اس کمرے میں داخل ہوگئی۔ دیکھا کہ ایک چارپائی پر رکھے رضائیوں کے ایک ڈھیر پر وہ چڑھی بیٹھی ہے۔ مجھے کمرے میں آتا دیکھ کر اس نے اس ڈھیر میں غوطہ لگایا اور امبیوں یعنی کچے آموں کا ایک چھوٹا سا ذخیرہ وہاں سے نکال کر اپنی مٹھیوں میں دبوچ لیا۔ میں بھی اسے غوطہ لگاتے دیکھ کر گھبرا کر اپنے افسانے والی کاپی نکال چکی تھی۔ دونوں نے اپنا اپنا خزانہ سنبھال لیا تو ہنسی چھوٹ گئی۔ خیر بہن کو افسانہ دکھایا تو اس نے فوراً بلیک میل کیا کہ امی کو بتائے گی کہ باجی نے بڑوں والا افسانہ لکھا ہے۔ میں نے ڈر کے مارے اسی وقت افسانے کے پرزے پرزے کیے اور چھت پر جا کر منڈیر سے نیچے کھلے میدان میں بکھیر دیے۔ پھر بھی بہن نے بلیک میل کرنا جاری رکھا۔ کچھ دن تو میں اس کی باری پر آٹا گوندھتی رہی لیکن آٹا گوندھنا مجھے ہمیشہ سے مشکل لگتا ہے۔ آخر میں نے کہہ دیا کہ بے شک امی کو بتا دے۔

یوں امی کو بھی اس واردات کا علم ہوگیا۔ البتہ افسانہ وہ نہیں پڑھ سکیں کیوں کہ اس کے تو پرزے پرزے ہو چکے تھے۔ انھوں نے مجھے تو کچھ نہیں کہا، مگر ہمارے سکول کی ہیڈ مسٹریس مس ثریا عنایت کو، جن سے ان کے گہرے مراسم تھے، بتا دیا کہ میں کن کاموں میں جا پڑی ہوں۔ یہ میری زندگی کا فیصلہ کن موڑ تھا۔ مس ثریا عنایت نے، اللہ انھیں ابد تک اپنی رحمتوں سے نوازے، نہ صرف امی کو قائل کیا کہ وہ میری حوصلہ افزائی کریں بلکہ خود بھی مجھے بلا کر شاباش دی اور کہا کہ افسانہ لکھ کر انھیں دکھاؤں اور پھر ''ماہنامہ حور'' میں چھپنے کے لیے بھیجوں۔ یوں اگلے چند ماہ میں یہ افسانہ دوبارہ لکھا گیا، میڈم کو دکھایا گیا اور پھر امی کی اجازت سے ''ماہنامہ حور'' میں چھپنے کے لیے بھیجا گیا۔ اشاعت پر اسے ادارۂ حور کی طرف سے دو سو روپے انعام بھی ملا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور ماہنامہ حور میں تسلسل سے پانچ چھے افسانے چھپ گئے۔ لیکن اس کے بعد اس قسم کے افسانوں سے ہمیشہ کے لیے جی اچاٹ ہوگیا۔ ایک تو کالج میں پہنچ کر ادبی کتابوں سے شناسائی ہوگئی تھی اور ''آوازِ دوست'' اور ''سفر نصیب'' جیسی کتابوں نے مطالعے کا مزاج بدل دیا تھا، دوسرے شدید جذباتی تحریروں سے الجھن ہونے لگی تھی۔ حالانکہ اب ان افسانوں کو دیکھتی ہوں تو اس عمر میں زبان کا استعمال، ذخیرۂ الفاظ اور کہیں کہیں جملوں کی فکری معنویت دیکھ کر ٹھٹھک جاتی ہوں۔ اس بات کا بھی احساس ہوتا

ہے کہ انسان کی عمومی بے بسی اور زندگی اور موت کا اسرار پہلے افسانے سے لے کر اس نوع کے آخری افسانے تک مسلسل میرا موضوع رہے ہیں۔شاید میں نے بچپن ہی سے زندگی کو بہت سنجیدہ معاملہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔مگر اس بات کو ایک نوع کی خود کلامی ہی سمجھیں، یہ کوئی تجزیہ نہیں۔

☆ آپ کے افسانوں میں انتظار حسین، حسن منظر اور خالدہ حسین کی جھلک بتلانے والے کس امر کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔ میں اس بات کا کیا جواب دے سکتی ہوں۔اپنے حوالے سے میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ جن فکشن نگاروں سے میں اوائل عمری میں متعارف اور بہت زیادہ متاثر ہوئی ان میں قرۃ العین حیدر کا نام سر فہرست ہے۔ آج بھی وہی میری پسندیدہ ترین فکشن نگار ہیں۔ انتظار حسین صاحب کو پڑھنے سے پہلے میں نے کرشن چندر، بیدی، غلام عباس، عصمت چغتائی، منٹو، احمد ندیم قاسمی، جمیلہ ہاشمی، الطاف فاطمہ اور ان کی بہن نشاط فاطمہ کو پڑھا تھا اور متاثر بھی ہوئی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ ممتاز مفتی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، مسعود اشعر، عرش صدیقی، انتظار حسین کا مطالعہ کیا۔ خالدہ حسین، حسن منظر، نیر مسعود اور اسد محمد خان بعد میں زیر مطالعہ آئے۔ مگر شعوری طور پر کسی کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ یہ سچ ہے کہ جن ادیبوں کا انسان مطالعہ کرتا ہے ان کے اثرات غیر شعوری طور پر اس کے فکر و اظہار پر پڑتے ہیں۔یقیناً مجھ پر بھی پڑے ہوں گے۔ اگر قاری کو ان بڑے افسانہ نگاروں کا کوئی رنگ میری تحریر میں نظر آئے تو میرے لیے باعث اعزاز ہے لیکن یہ میری کوشش رہی ہے نہ خواہش۔

☆ ''یہ جدید طرزِ احساس کے زائیدہ افسانے ہیں۔'' اوّل مبین مرزا صاحب نے کس حوالے سے جدیدیت پر زور دیا، دوئم آپ کے افسانوں کی نسبت لارنس کا ذکر کیوں ضروری گردانا گیا؟

☆☆ میرا خیال ہے کہ یہ بات بھی مبین مرزا صاحب ہی سے پوچھی جانی چاہیے۔ ویسے انھوں نے اپنے مضمون میں اس بات کا مدلل جواب دے رکھا ہے۔ میں سمجھتی ہوں لکھنے والے کو نقاد کی رائے میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ نقاد تخلیق کو relive کرتا ہے اور اس کا تجربہ اپنے طور پر کرنے کے بعد اس کے بارے میں رائے قائم کرتا ہے۔ اپنی تخلیق کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کا وقت تخلیق کے عمل کے دوران ہوتا ہے۔ جب ایک بار تخلیق کا عمل مکمل ہو جائے تو معاملہ قاری پر چھوڑ دینا چاہیے اور اس پر آنے والی تنقیدی آرا میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ لارنس کے حوالے سے مبین مرزا صاحب نے صرف یہ لکھا ہے کہ ان افسانوں کو پڑھ کر لارنس کی اس بات کا اثبات ہوتا ہے کہ ایک فکشن نگار بیک وقت کئی زندگیاں جیتا ہے۔ اس بات کا تعلق انھوں نے میرے بیشتر افسانوں میں واحد متکلم راوی کی موجودگی سے جوڑا ہے۔

☆ حقیقت افسانے سے قریب تر ہوتی ہے یہ تو سنا مگر عجیب تر کی اصطلاح پہلی بار آپ کے حوالے سے دیکھا اور سُن کر سوال اٹھانے کی جرأت کر رہا ہوں؟

☆☆ غالباً آپ سلیم الرحمان صاحب کے جملے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو انھوں نے ''راگنی کی کھوج میں'' کے بارے میں لکھا ہے۔ ایک انگریزی کہاوت ہے: fact is stranger than fiction۔ انسان افسانے سے تحیر خیز واقعات کی توقع رکھتا ہے اور زندگی کے حقائق کو جانا بوجھا سمجھتا ہے لیکن زندگی کے واقعات بعض اوقات افسانے سے بڑھ کر حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ ''راگنی کی کھوج میں''، ان واقعات پر مشتمل ہے جو حقیقی زندگی میں گزرے ہیں مگر شاید انھیں محسوس ہوا ہو کہ اس میں استعجاب کا عنصر زیادہ ہے اس لیے انھوں نے اس کہاوت کا حوالہ دیا۔

☆ کسی بھی تخلیق کار کو اپنے عصر کے بڑے فنکار کے مماثل یا مشابہہ گردانا باعث اعزاز ہوا کرتا ہے۔ ورجینا وولف سے آپ کے افسانوی مجموعہ ''بیٹھے نکّے'' کو ملانا یا کسی طرح کی مماثلت تلاش کرنا آپ کے خیال میں کس حد تک درست عمل ہے؟

☆☆ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں نے شعوری طور پر کسی بھی فکشن نگار کی تقلید نہیں کی۔ اگر کسی کو میرے فکشن میں کسی معاصر یا پیش رو ادیب کا عکس نظر آتا ہے تو اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے، اور وہ یہ کہ ایک زمانے میں یا قریبی زمانے میں زندہ رہنے والے لوگوں کو ایک جیسا عہد، ایک جیسے مسائل اور ایک جیسی فکری فضا میسر آتی ہے۔ اس عصری مماثلت کے باوجود ان کے زاویہ نظر میں فرق ہو سکتا ہے اور وہ ادبی اعتبار سے بڑے اور چھوٹے بھی ہوتے ہیں۔ مگر اس فرق کے ہوتے ہوئے بھی ان کا ذہنی و فکری سفر کچھ نہ کچھ مماثل بھی ہو جاتا ہے، یہ مماثلت طرز فکر و احساس کی ہوتی ہے، سوانحی حالات کی نہیں۔ حساس قاری اور نقاد اس مماثلت کو محسوس کر لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ورجینا وولف نے خواتین کے حوالے سے روحِ عصر کی جس شدتِ احساس کے ساتھ ترجمانی کی ہے، ان کا عہد اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ خاص طور پر خواتین لکھنے والیاں کسی نہ کسی سطح پر دردِ مشترک کا تجربہ کرتی رہی ہیں۔ میں نے یہ تجربہ اپنے طور پر کیا ہے، تقلید کے طور پر نہیں۔

☆ ممتاز مفتی سے تعارف اور تعلق سے تحقیق تک کے سفر کی مختصر روداد بیان فرمائیے؟

☆☆ ممتاز مفتی صاحب سے زمانہ طالب علمی میں، ان کی کتابیں پڑھ کر خط کتابت کے ذریعے رابطہ ہوا۔ خاص طور پر ان کا ناول ''علی پور کا ایلی'' مجھے بہت پسند آیا۔ میں اسے اردو کے اہم ناولوں میں سے ایک سمجھتی ہوں۔ آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ اور بھی بہت سے ادیبوں کی تحریریں پڑھی تھیں تو ان سے رابطہ کیوں نہ کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ممتاز مفتی کی تحریریں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان سے بلا تکلف رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ ان تحریروں میں ایک خاص طرح کی دوستانہ، اپنائیت بھری اور کھلی ڈلی فضا محسوس ہوتی ہے۔ ایسے لگتا تھا کہ ان سے اپنی بات کی جا سکتی ہے۔ کچھ عرصہ خط کتابت کے بعد ایک روز میں اور میرا بھائی ٹرین میں بیٹھ کر ان سے ملنے اسلام آباد بھی گئے تھے۔ پھر شادی کے بعد جب میں اور عارف اسلام آباد منتقل ہوئے تو ان سے میل ملاقات بڑھ گئی۔ خاص طور پر عارف نے بہت وقت ان کے ساتھ گزارا۔ ان سے مل کر ہم بھول ہی گئے تھے کہ کسی بہت

بڑے ادیب سے مل رہے ہیں۔ان کی شخصیت میں نئے اور نوآموز لکھنے والوں کے لیے ہی نہیں، اپنے عام قاری کے لیے بھی محبت، ہمدردی اور انس کے ایسے عنصر تھے جو باقی ادیبوں کے ہاں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ایسا لگتا تھا وہ اپنے ملنے والوں کے دکھ اور تکلیفیں اپنا لیتے ہیں۔وہ ادیب سے بڑھ کر ایک دردآشنا، پرخلوص دوست اور رہنما لگتے تھے۔یہ ان کی شخصیت کا خاص وصف تھا جس کا تجربہ ان سے ملنے والے کم وبیش سبھی کو ہوتا رہا۔ان کی وفات کے بعد جب میں نے پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا تو میرے استاد ڈاکٹر صدیق شبلی نے تجویز دی کہ ممتاز مفتی کے فکری ارتقا پر مقالہ لکھوں کیوں کہ میری رسائی ان کے ذاتی کاغذات اور دیگر دستاویزات تک بہ آسانی ہوسکتی تھی۔یہ تجویز مجھے بھی پسند آئی۔یوں تحقیق کا یہ سفر طے ہوا۔

☆ ''راگنی کی کھوج میں'' ممتاز مفتی کا حوالہ کن معنی اور مفہوم میں لینا مناسب ہوگا؟

☆☆ میرا خیال ہے میں نے یہ بات اس کتاب میں تفصیل سے لکھی ہے۔ ''علی پور کا ایلی'' اور ممتاز مفتی کی کئی دیگر تصانیف پڑھ کر جو بات مجھے نمایاں نظر آئی وہ یہ تھی کہ انھوں نے جدید عہد کے ایک دنیادار انسان کے اندر پیدا ہونے والی روحانی تڑپ اور ترفع حاصل کرنے کی خواہش کو موضوع بنایا ہے۔ایسا شخص جو اپنی زندگی کو مکمل طور پر کسی صوفیانہ تجربے کے لیے وقف کر دینے پر تیار نہیں۔زندگی اور اس کی دلچسپیاں اسے اپنی طرف بلاتی ہیں اور وہ ان سے دامن نہیں چھڑا سکتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ایک روحانی پیاس بھی ہے۔وہ زندگی کو عقل کے پیمانے پر پرکھنا چاہتا ہے یہاں تک کہ روحانی تجربے کو بھی عقل کی مدد سے سمجھنا چاہتا ہے کیوں کہ اس کی تربیت ہی اس نہج پر ہوئی ہے۔مادے اور روح کے درمیان یہ کشمکش اس کی زندگی کو اذیت ناک بنائے ہوئے ہے اور وہ اس اذیت سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔غالب نے جدید عہد کے انسان کی اس کشمکش کو اس وقت بیان کر دیا تھا جب یہ ابھی عام آدمی کا تجربہ نہیں بنی تھی:

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

نوعمری میں انسان کو ایک شارٹ کٹ کی تلاش ہوتی ہے۔مجھے بھی روحانی ارتقا کے لیے ایک شارٹ کٹ کی تلاش تھی۔میرا خیال تھا کہ مفتی جی مجھے کوئی شارٹ کٹ بجھا دیں گے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا اور اب میں سمجھتی ہوں کہ بالکل ٹھیک کیا۔وہ نہ خود میرے لیے بابا بنے نہ کسی اور بابے کو ریفر کیا۔البتہ دوست اور ہم درد بن کر ضرور دکھایا۔

☆ ہماری اطلاع کے مطابق ممتاز مفتی نے آپ کو Attraction Intellectual کے حوالے سے جو تاکید کی تھی اوّل اُس تاکید سے باخبری فطری بات ہے دوئم اُس تاکید پر عمل درآمد کے نتائج جاننا بھی ضروری ہو جاتا ہے؟

☆☆ یہ تاکید ایک عمومی نصیحت تھی اور افسوس کہ میں ان کی کسی نصیحت پر عمل نہیں کر سکی۔میری انا کی خاردار جھاڑی مجھے کسی کی نصیحت قبول کرنے ہی نہیں دیتی تھی۔مجھے اپنے تجربوں کی آگ سے اپنی روشنی تلاش کرنے کی ٹھرک تھی۔

☆ تصوف کی جانب آپ کا رجحان اور کمال وتمام کی جستجو کے نتائج سے ہمیں اور ہمارے قارئین کو باخبر کیجیے؟

☆☆ یہ چند الفاظ میں کہہ دینے کی بات نہیں۔میرے ابو ایک شعر اکثر دہرایا کرتے تھے:

بھیکا بات اگم کی، کہن سنن میں نا
جو جانے سو نا کہے، جو کہے سو جانے نا

میں اس بارے میں جو کچھ کہہ سکتی تھی، اپنی کتاب ''راگنی کی کھوج میں'' کہہ چکی ہوں۔جو نہیں کہا گیا، وہ بھی اسی کے اندر سے نکل سکتا ہے۔

☆ آج کی نشست میں اپنے مرشد کی نشان دہی کیجیے جنھیں کھوجنے کی پُراسرار کوشش کا تذکرہ جناب رؤف پاریکھ نے بڑے دلچسپ پیرائے میں کیا ہے؟

☆☆ یہ کھوج کسی پراسرار عمل کا نتیجہ نہیں تھی۔یہ ایک بالکل ظاہری اور دکھائی دینے والی، سمجھ میں آنے والی، بلکہ نظر آنے والی کوشش تھی جو غالب کے اس شعر کی عملی تفسیر رہی ہے:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

جہاں تک مرشد کی نشان دہی کا تعلق ہے اس بارے میں کوئی یک طرفہ دعویٰ کرنا تو محال ہے البتہ ''راگنی کی کھوج میں'' اسی سوال کے جواب میں لکھی گئی ہے کہ میں کیسے اور کن راستوں سے گزر کر حضرت عبیداللہ درانیؒ کی شخصیت سے شناسا ہوئی حالانکہ اس وقت تک ان کے وصال کو کئی سال گزر چکے تھے۔یہاں شناسا کا لفظ رسمی طور پر استعمال کیا گیا ہے۔انسان زندگی بھر اپنا شناسا بھی نہیں ہوسکتا، کجا یہ کہ کسی روحانی طور پر بے حد ارتقا یافتہ شخصیت کو سمجھ سکے۔البتہ وجدانی سطح پر کچھ نہ کچھ حسبِ توفیق اور استطاعت کھُل جائے تو اسے محض عطا ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

☆ اُن سوالات کے جوابات بھی آج کی گفتگو میں عطا کیجیے جو ''بابوں'' کی جستجو وتلاش میں آپ کے دل ودماغ میں جگہ پاتے رہے؟

☆☆ یہ سوال ایسے نہیں جن کے جوابات کی گائیڈ بک تیار کی جاسکے۔ہر شخص کا اپنا سفر ہوتا ہے اور اس سفر کے دوران اپنے تجربات، اپنے امکانات اور اپنی توفیقات کے مطابق جواب اس پر کھلتے ہیں۔اس سفر کا کوئی مختصر راستہ یا شارٹ کٹ نہیں ہے۔اس میں زندگی صرف کرنا پڑتی ہے۔اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر ایک کو ایک جیسا جواب ملے۔جیسی کسی کی تلاش ہوتی ہے، ویسی ہی اس کی یافت ہوتی ہے۔اس سفر کی منزل کیا ہے، کوئی نہیں جانتا۔اس راستے پر چلنا ہی شاید اس کی منزل ہے۔چلے بغیر یہ راستہ کسی پر کھل سکتا ہے نہ آسان ہوسکتا ہے۔

☆ کیا ہی اچھا ہو کہ موقع کی مناسبت سے قاضی سعید صاحب سے ملاقات اور معاملات کے علاوہ ہومیوپیتھی کے ڈپلومہ اور اس سے استفادہ پر بھی روشنی ڈال دی جائے؟

☆☆ قاضی احمد سعید سے ملاقات بظاہر اتفاقات کے ایک سلسلے کا نتیجہ ہے مگر اتنی عمر گزارنے کے بعد مجھ پر یہ کھلا ہے کہ اتفاق کچھ بھی نہیں ہوتا۔

بہرحال مجھے یہ اعزاز ملا کہ میں ان کے مفت دواخانے پر چار سال تک پڑیاں باندھتی رہی۔ ہومیوپیتھی ڈپلومے سے بس یہی فائدہ اٹھایا ہے۔

☆ ''میں تو تمہیں خدا کے حوالے بھی نہ کروں اور تم ایک انسان کے ہاتھ پر بیعت کر آئی ہو'' ان جملوں کے خالق اور آپ کا ردِعمل جاننا آپ کے قاری کا حق تو بنتا ہی ہے؟

☆☆ یہ جملہ میرے شوہر نے کہا تھا جب میں نے اچانک ایک جگہ بیعت کر لی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کی محبت کے اظہار کا ایک طریقہ تھا۔ چوں کہ وہ اظہار سے زیادہ اخفا پر یقین رکھتے ہیں اس لیے مجھے ان کی بات کے اصل معنی سمجھ کر فطری طور پر بے حد خوشی ہوئی تھی۔

☆ آپ کے بارے ایک تاثر خصوصیت کے ساتھ محسوس کیا جاتا ہے کہ آپ تحقیق، تنقید، تخلیق یا ترجمہ غرض کسی موضوع پر طبع آزمائی کریں، تصوف کا ذکر کسی نہ کسی طور آ ہی جاتا ہے؟

☆☆ کم از کم تنقید و تحقیق کے حوالے یہ تاثر درست نہیں۔ دراصل ہمارے ہاں رائے قائم کرتے ہوئے کسی لکھنے والے کو اس کی کلیت میں دیکھنے کا رواج نہیں ہے۔ جس نے جو جز دیکھا یا پڑھا، اسی کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کر لی۔ میں نے ادب کے مابعد الطبیعیاتی رجحان کے حوالے سے چند ایک مقالات ضرور لکھے ہیں لیکن ان کی تعداد دیگر موضوعات کے مقابلے میں چار پانچ فیصد سے زیادہ نہیں۔ فکشن اور شاعری پر لکھے گئے ایسے تنقیدی مضامین تعداد میں زیادہ ہیں جن میں تکنیک، ہیئت، رجحانات، نظریات اور موضوعات کے حوالے سے مباحث ملتے ہیں۔ تحقیق کے حوالے سے زیادہ تر قدیم مخطوطات کی دریافت کی ہے اور ان کی ترتیب و تدوین کا کام کیا ہے۔ ان میں زیادہ تعداد تو اٹھارھویں صدی کے سفرناموں کی ہے۔ کچھ دیگر مخطوطات بھی ملے ہیں جن میں تذکرہ، داستان، لطائف و ظرائف، دستاویزات اور مکتوبات شامل ہیں۔ ان سب کو ایک ایک کر کے ترتیب دینے کا کام جاری ہے۔ اسی طرح فکشن اور سفرناموں میں بھی یہ موضوع خال خال ہی نظر آتا ہے۔ البتہ تصوف میرے لیے ذاتی دلچسپی اور مطالعے کا موضوع ضرور رہا ہے۔ اس حوالے سے میرے ذہنی و روحانی سفر کی داستان ''راگنی کی کھوج میں'' بیان کی گئی ہے۔ عکسی مفتی کی جس انگریزی کتاب کا ترجمہ میں نے ''اللہ۔ ماورا کا تعین'' کے نام سے کیا ہے اس میں بھی تصوف اور سائنس کا امتزاج ملتا ہے۔ اہم صوفیانہ متون کے مزید کچھ تراجم کا منصوبہ بھی میرے پیشِ نظر ہے۔ اگر توفیق ہوئی تو ان شاءاللہ پیش رفت ہو گی۔ مختصر یہ کہ تصوف میری دلچسپی کا موضوع ہے اور اس سے اعلانِ لاتعلقی مقصود نہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کم از کم اب تک تنقید، تحقیق اور بیشتر تخلیقی ادب کا یہ غالب اور نمائندہ موضوع نہیں رہا۔

☆ آپ کے ہاں شاعری کو پہلا عشق گردانا جاتا ہے جب کہ احباب نے ساری توانائیاں آپ کے تصوف اور ناول پر صرف کرنا ضروری جانا؟

☆☆ شاعری کو میں اتنی توجہ نہیں دے سکی جتنی دینی چاہیے اور جتنی یکسوئی کا یہ فن تقاضا کرتا ہے، وہ بھی مجھے میسر نہیں رہی۔ بعض اوقات تو کئی برس تک ایک شعر بھی نہیں ہو سکا۔ اس کی مختلف وجوہ ہو سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شاعری بہت بڑا فن ہے۔ اس کے لیے اپنے اندر بہت گہرا اترنا پڑتا ہے؛ تب کہیں جا کر مصرع تر کی کوئی صورت بنتی ہے۔ میں تنقید و تحقیق کی طرف نکل آئی تو شاعری سے میرا رشتہ کمزور ہوتا گیا۔ پھر اس میں کچھ توفیق کی بھی بات ہوتی ہے۔ بہرحال میں اسے اپنی ہی کوتاہی سمجھتی ہوں۔ جہاں تک احباب کی توانائیوں کے تصوف اور ناول پر صرف ہونے کی بات ہے تو یہ بات درست ہے کہ ''راگنی کی کھوج میں'' کو سب سے زیادہ پذیرائی ملی اور بیشتر قارئین نے شاید یہی ایک کتاب پڑھی ہے۔ چوں کہ اس کا موضوع تصوف ہے تو زیادہ تبصرے بھی اسی تناظر میں ہوئے۔ ''نوادرِ کاظمہ''، قصیدہ بردہ شریف کے منظوم ترجمے پر بھی کافی بات ہوتی رہی۔ افسانوں کا مجموعہ ''میٹھے نلکے'' اور ناول ''مکھوٹا'' پچھلے دو سال کے دوران میں شائع ہوئے ہیں۔ جن احباب نے انھیں پڑھا اور رائے دی، میں ان کی شکر گزار ہوں۔ عام قاری کی دلچسپی کی اصناف یہی ہیں۔ تنقید و تحقیق تو متعلقہ شعبے کے سنجیدہ طالب علم اور استاد ہی پڑھتے ہیں۔

☆ سلیم الرحمٰن صاحب نے آپ کے ناول کے حوالے سے لیئر ڈوسی اور بابرامیک کلنٹوک کا حوالہ دینا آپ کے خیال میں کیوں ضروری جانا؟

☆☆ محمد سلیم الرحمان صاحب نے ''راگنی کی کھوج میں'' کے مقدمے میں یہ حوالہ ایک خاص نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے دیا ہے۔ بار برامیک کلنٹوک نے جینیٹکس (Genetics) میں نوبل انعام حاصل کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ''بنیادی طور پر ہر شے واحد ہے۔ کوئی طریقہ ہی نہیں جس کے ذریعے سے آپ چیزوں کے مابین لکیریں کھینچ سکیں۔ یہ ہم ہیں جو ان ذیلی تقسیموں کو تشکیل دیتے ہیں۔ یہ تشکیلات حقیقی نہیں ہیں۔'' ایک ماہر جینیات نے جس بات کو شواہد کی مدد سے بیان کیا ہے وہی بات صوفیہ کرام صدیوں سے دہراتے چلے آئے ہیں۔ سلیم الرحمان صاحب نے اسی نکتے کو اجاگر کیا ہے۔

☆ کچھ لوگ ''راگنی کی کھوج میں'' کی کامیابی و کامرانی میں آپ کے شوہر نامدار جناب عارف جمیل کا ذکر خیر لازم و ملزوم کیوں گردانتے ہیں؟

☆☆ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ لوگ اس کتاب کے حوالے سے ایسا کیوں سمجھتے ہیں۔ مگر میرے لیے تو زندگی کی ہر کامیابی و کامرانی میں عارف کی محبت اور توجہ شامل رہی ہے۔ انھوں نے مجھے خوشی اور اطمینان کی زندگی سے آشنا کیا۔ مجھ پر اعتبار کیا، میرے ناز اٹھائے اور ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی۔ اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ میری ہر کاوش میں وہ برابر کے شریک ہیں۔ یہ صرف ایک کتاب کی بات نہیں۔

☆ آپ کے ناول ''مکھوٹا'' میں سانحہ مشرقی پاکستان کا ذکر جس درد مندی اور کرب سے کیا گیا ہے اُس میں اُن بے خانماں لوگوں کا دُور دُور تک ذکر نظر نہیں آتا جنھیں دنیا ''بہاری'' کے نام سے یاد کر کے بری الزمہ ہو جاتی ہے؟

☆☆ بہاریوں کا ذکر اس ناول میں موجود ہے۔ اگرچہ اس ناول کا موضوع یہ نہیں ہے۔ ہجرت، سقوطِ مشرقی پاکستان اور بہاری کیمپوں کا ذکر اس ماحول کے بیان میں آتا ہے جس میں اس ناول کا مرکزی کردار پروان چڑھتا ہے

اور یہ تمام واقعے اس کی ذہنی وفکری تشکیل میں اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ واقعات ناول کے مرکزی قصے سے مربوط نہیں ہیں لیکن مرکزی کردار کی ذہنی فضا سازی میں پس منظر کا کام کرتے ہیں۔ درحقیقت قومی اور معاشرتی سانحے انسانی شخصیت پر براہ راست اثر انداز نہ بھی ہوں تو بھی انسان کے افکار، اعمال اور کردار پر اپنے نقوش ضرور چھوڑتے ہیں اور اسے ایک مخصوص رخ عطا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے وہ ناول میں بھی موجود ہیں۔

☆ اکثر احباب کو آپ کے ناول ''کھوٹا'' کی بابت کئی طرح کے تحفظات کا اظہار کرتے دیکھا اور سنا گیا ہے۔ کبھی آپ کے مشاہدے یا مطالعے میں اس طرح کے واقعات آتے ہیں تو آپ کا ردِعمل کیا ہوتا ہے؟

☆☆ مجھے سچ مچ علم نہیں کہ کس قسم کے تحفظات کا اظہار کیا گیا ہے۔ کم از کم میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں آئی۔ احباب نے ناول پر جو تبصرے کیے ہیں وہ اس رائے یا تاثر پر مبنی ہیں جو انھوں نے ناول پڑھ کر قائم کی۔ مثال کے طور پر کچھ احباب نے کہا کہ اس میں لسانی فلسفے کا استعمال کیا گیا ہے۔ کچھ نے کہا کہ وجودیت کے اثرات ہیں۔ میری اس ضمن میں واضح رائے یہ ہے کہ فکشن نگار اپنی ایک دنیا تخلیق کرتا ہے۔ پڑھنے والا خود اپنے راستے سے اس دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ ضروری نہیں یہ وہی راستہ ہو جو مصنف نے چنا ہو۔ ناول ہو یا کوئی اور تخلیق اور مصنف سے اس کا جو بھی معاملہ رہا ہو؛ قاری سے آزادانہ رشتہ قائم کرتی ہے۔ لکھنے والے کو قاری کی رائے میں مداخلت کرنے یا کچھ سمجھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ قاری اور تخلیق کے درمیان آنے سے گریز کرنا چاہیے۔

☆ آپ کے ناول ''راگنی کی کھوج میں'' کی نسبت شکیل صاحب نے کن معنوں میں ایک جہان کی دریافت کا ذکر کیا ہے؟

☆☆ یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔

☆ آگے چل کر شکیل صاحب آپ کے والدین کو دو مخالف سمت کے مسافر بتلا کر ابہام پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں؟

☆☆ یہ بات تو میں نے خود اس کتاب میں لکھی ہے کہ میرے والدین کی شخصیتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔ ایک سب آگ، ایک سب پانی کی مثال تھے وہ دونوں۔

☆ اسے ہماری کم علمی کہیے یا کم فہمی سے تعبیر کیجیے۔ آپ کی تنقیدی جہات سے ہم اُتنے باخبر نہیں جتنا ہونا چاہیے تھا یا ہے؟

☆☆ میرا خیال ہے اس میں بھی میری ہی کچھ کوتاہی ہے۔ دراصل اب تک میرے مضامین کے صرف دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے بھی ایک کا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے اور دوسرے کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ ان کے علاوہ متعدد مضامین و مقالات پاکستان اور بیرون ملک مختلف جرائد و مجلّات میں شائع ہوتے رہے ہیں مگر ابھی تک انھیں کتابی صورت میں مجتمع کرنے کا اہتمام نہیں ہو سکا۔ شاید اسی وجہ سے صرف وہی لوگ یہ مقالات پڑھ پاتے ہیں جنھیں کسی ضرورت کے تحت یہ جرائد و مجلّات دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ اب انھیں کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے؛ دیکھیں کب پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

☆ ہر چند افتخار عارف صاحب نے آپ کی تنقیدی کاوشات کے ضمن میں جناب حسن عسکری، پروفیسر گوپی چند نارنگ، سلیم احمد اور پروفیسر وارث علوی صاحبان کا ذکر کرتے ہوئے آپ کی تنقید کو محترمہ ممتاز شیریں کی تنقید کا تسلسل گردانا ہے؟

☆☆ افتخار عارف صاحب، ایک صاحب مطالعہ اور صاحب نظر شخص ہیں۔ ان کی عنایت ہے کہ انھوں نے توجہ سے میرے تنقیدی مضامین پڑھے۔

☆ بہت سے لوگ یہ کہتے بھی سنے گئے ہیں کہ ماہر لسانیات ہونے کے باوجود اس موضوع کو بلاوجہ ناول میں ٹھونسا گیا جس کے سبب قاری جوں جوں آگے بڑھتا ہے ووں، ووں اکتاہٹ کا شکار ہوتا ہے؟

☆☆ پہلی بات تو یہ کہ لسانیات ایک تخصیصی شعبہ ہے اور میں اس علم کی ماہر نہیں۔ ادبی تناظر میں لسانیاتی مطالعات سے کچھ نہ کچھ آگاہی حاصل کرنے کی کوشش ضرور رہی ہے مگر اس کا اظہار مقالات میں ہو تو ہو، ناول میں ٹھونسنے کی کوشش پر معاذ اللہ۔ البتہ زبان اور اس کے عجائب پر غور کرنا میرے ذہنی سفر کا لازمی حصہ رہا ہے۔ انسان کی ذہنی تشکیل وارتقا میں زبان کس طرح فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے؛ یہ بات مجھے ہمیشہ سے مسحور کرتی ہے۔ یہ کیا بوالعجبی ہے کہ زبان اظہار کا ذریعہ ہے مگر اظہار کے ساتھ ساتھ اخفا کا کام بھی کرتی ہے۔ ہم سب اس بات کا تجربہ رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود صرف اظہار کو اہم جانتے ہیں اور اخفا کو عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ بات سمجھنے کے لیے کسی لسانی فلسفے کا علم ضروری نہیں، یہ ہمارے اپنے ذہنی تجربے کا ثمر ہے۔ اس کا اظہار اگر ناول میں کہیں ہوا ہے تو نظریے کے طور پر نہیں، تجربے کے طور پر ہوا ہے۔ پھر بھی میرے نزدیک قاری یا نقاد اپنی رائے قائم کرنے میں آزاد ہے۔

باقی رہی بات اکتاہٹ کی تو اس سلسلے میں مجھے دو طرح کے ردِعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ احباب نے، جن میں ناول کے تربیت یافتہ اور صاحبِ رائے قاری اور نقاد شامل ہیں، ناول کے دوسرے اور تیسرے حصے کو اہم تر قرار دیا، جب کہ کچھ قارئین نے پہلے حصے میں دلچسپی ظاہر کی اور دوسرے تیسرے حصے سے مایوسی کا اظہار کیا۔ میرے لیے دونوں آرا بے حد اہم ہیں۔ لکھنے والا یقیناً اس لیے لکھتا ہے کہ اس کا لکھا کہیں پہنچ جائے۔ لیکن میرے لیے ایک بڑی ترغیب یہ بھی ہے کہ لکھتے ہوئے مجھے خود اپنی گرہیں کھولنے اور سرا ڈھونڈنے میں مدد ملتی ہے۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ لکھنے کے بعد تخلیق کو قاری کے حوالے کر دینا بہتر لگتا ہے۔ وہ جو بھی رائے قائم کرے، سرِ تسلیم خم ہے۔

☆ بارِ خاطر نہ ہو تو ہمارے قارئین کی دلچسپی کے پیشِ نظر اپنی تحقیقی جستجو اور طلب وتڑپ سے آگاہی دے دیجیے؟

☆☆ تحقیق میں اپنی دلچسپی کے موضوعات اور کام کے بارے میں مختصراً میں پہلے ہی ایک سوال کے جواب میں بتا چکی ہوں۔ اس سلسلے میں ایک بات اور کہہ سکتی ہوں کہ مجھے قدیم مخطوطات کی تلاش ودریافت اور ترتیب وتدوین کا کام گڑے مردے اکھاڑنے جیسا بے معنی اور بے ثمر نہیں لگتا۔ مجھے اس شغل میں ماضی سے ایک زندہ

رشتہ قائم کرنے کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے روایت کے ٹوٹے ہوئے تسلسل کی کوئی کڑی مل گئی ہو، کوئی تار جڑ گیا ہو۔ کسی گم شدہ، بھولی بسری تحریر کا یکا یک حال میں جی اٹھنا صرف ایک کتاب یا دستاویز کا دائرۂ علم میں شامل ہو جانا نہیں ہے بلکہ ایک پورے ماحول کا پھر سے جی اٹھنا ہے۔ تاریخ کے کچھ حقائق کا، ایک عہد کے ذہنی سفر کا، زندگی کو دیکھنے، برتنے اور سمجھنے بوجھنے کے ایک اسلوب کا پھر سے بامعنی ہو جانا ہے۔ اسے ماضی پرستی نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ حال کی معنویت کا تعین کرنے کے لیے ماضی کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ویسے تو ماضی حال اور مستقبل دراصل ہماری اپنی تعبیرات ہیں۔ وقت ایک لامتناہی شے ہے اور اس کا ہر نقطہ اپنی جگہ اہم اور معنی خیز ہے۔ قدیم مخطوطات میں میری دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ یہ میرے لیے وقت کے تسلسل کے ظاہر ہونے کا مرحلہ ہے۔

☆ آپ کے بے پناہ کام اور اصناف پر لکھی گئی تنقید یا ناقدین عصر سے آپ کے ہاں کس قدر تسلی یا اطمینان پایا جاتا ہے؟

☆☆ لکھنا لکھانا میرے لیے ایسا شغل ہے جو اپنی جزا آپ ہے۔ عام طور پر لوگ ایسی باتوں پر یقین نہیں کرتے مگر میرے لیے یہ ایک بنیادی حقیقت ہے کہ لکھنے والے کو جو اجر ملنا ہوتا ہے، وہ لکھنے کے دوران ہی مل جاتا ہے، باقی باتیں اضافی ہیں۔ میں انھیں ہوس شمار کرتی ہوں اور اس ہوس سے دامن بچانا چاہتی ہوں۔

☆ قصیدہ بردہ شریف کا ترجمہ، کس کیفیت، خواہش اور احساس کے زیر اثر کیا گیا اور اب تک ہونے والے تراجم میں آپ کے ترجمہ کو کس طرح کا اختصاص اور انفرادیت حاصل ہے؟

☆☆ میرے لیے اس ترجمے کو صرف یہ اختصاص حاصل ہے کہ یہ مجھ سے سرزد ہوا ہے۔ یعنی مجھے یہ شرف مل گیا کہ میں بھی اس کے مترجمین میں شامل ہو گئی۔ اس سے پہلے قصیدہ بردہ شریف کے جتنے بھی تراجم ہوئے ہیں سب اپنی اپنی جگہ نہایت اہم اور قابلِ قدر ہیں۔ میرے ترجمے کا مقصد پہلے تراجم پر کوئی اضافہ کرنا، ان کی اصلاح و تصحیح کرنا یا ان سے بہتر کام کرنے کی خواہش نہیں؛ بس ان میں شامل ہونے کی خواہش ہے۔

☆ لسانیات کی تھیوریز کو ناول میں برتنے کے خیال کے پیچھے کیا حکمت پوشیدہ ہے اور اس سے کس طرح کے نتائج حاصل کرنا مقصود تھے یا ہے؟

☆☆ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ یہ بات میرے تصور میں بھی نہیں کہ میں نے لسانیات کی کسی تھیوری کو برتا ہے۔ اگر ایسا کوئی مقصد ہو، اور اس سے کچھ نتائج حاصل کرنا مقصود ہو تو اس کے لیے مقالہ لکھا جانا چاہیے۔ ایک دو جگہ پر زبان کی بوالعجبیوں پر کچھ فقرے ضرور سرزد ہوئے ہیں مگر وہ کسی تھیوری کا اطلاق نہیں، کردار کا تجربہ ہیں۔

☆ نقاد کے قلم سے نکلے تخلیقی مواد پر طرح طرح کے شبہات اور تحفظات رکھنے والوں کے لیے آپ کے خیال میں صافی وشافی جواب کیا ہونا چاہیے؟

☆☆ بس یہی جواب ہونا چاہیے کہ

؎ وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں

مگر سچ تو یہ ہے کہ مجھے ایسے نقادوں کا سامنا نہیں رہا جنھوں نے شکوک وشبہات یا تحفظات کا اظہار کیا ہو۔ کم از کم مجھ تک ایسی باتیں نہیں پہنچتیں۔ یا شاید میں نے کوشش ہی نہ کی ہو کہ ہر ایک کا ردِ عمل معلوم کروں۔ بہر حال ہر شخص اپنی رائے رکھنے میں آزاد ہے۔ اگر کوئی جینوئن تخلیق کار ہے تو اسے ان باتوں کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ اچھا کام خود اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ اچھا کام نہ کیا اور شہرت مل گئی تو وہ ایک نہ ایک دن شرمندگی کا باعث بنتی ہے۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ کوئی اچھا کام سرزد ہو جائے، اس کا اعتراف ہو یا نہ ہو، یہ ضمنی بات ہے۔

☆ ایک منٹ ٹھہر کر، تھم کر اور سوچ کر بتلایئے کہ خاتون ہونے کے باوجود آپ کو فیمنسٹوں سے خدا واسطے کا بیر کیوں ہے؟

☆☆ خدا کی پناہ! میں نے یہ کب کہا یا لکھا ہے کہ مجھے فیمنسٹوں سے بیر ہے۔ ہرگز ہرگز بیر نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ فیمنسٹ نقطۂ نظر کو درست طور پر پیش کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اسے غلط تناظر میں دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ خواتین کو محض جسم یا جنس سمجھنا اور اس کے ذہن وشعور کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا آج تک ہمارے معاشرے کی خو رہی ہے۔ برابر انسان ہونے کی تو بات ہی چھوڑیے، وہ محض ایک باشعور انسان کے طور پر بھی نہیں دیکھی جاتی۔ عورت کی عزت کرنے کے جتنے دعوے کیے جاتے ہیں، وہ سب اپنے گھر کی عورتوں تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ماں، بہن، بیٹی اور کبھی کبھار بیوی کے سوا جتنی خواتین نظر آتی ہیں ان کے بارے میں کوئی بھی گھٹیا بات کہہ دینا، شرمناک اشارہ کر دینا، کوئی پست درجے کا لطیفہ سنا دینا ہمارے سماج کا روزمرہ کا معمول ہے۔ یہی نہیں، ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے حقوق ادا کرنا بھی ہمارا معمول نہیں ہے۔ وراثت میں اس کا حصہ غصب کرنا، فیصلہ سازی سے دور رکھنا اور معاشرتی زندگی میں اس کے کردار کو محدود سمجھنا یا رکھنا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اس معاملے میں میں فیمنسٹ نقطۂ نظر کی حامی ہوں۔ البتہ میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ اپنے معاشرتی حقوق حاصل کرنے کے لیے عورت کو مرد بننا لازم نہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ معاشرے میں اپنی حیثیت منوانے کے لیے یہ ظاہر یا ثابت کرنے میں لگ جائے کہ وہ بھی درحقیقت میں ایک مرد ہی ہے۔ عورت، عورت رہتے ہوئے ایک باعزت اور اہم مقام اور کردار کی حامل ہے۔ اس کا نسائی رُخ اس کے لیے تہمت نہیں، عزت کا باعث ہے۔ اس پر شرمندہ ہونے یا اسے ترک کر کے کوئی اور شناخت حاصل کرنے کے بجائے اسی اپنے نسائی پہلو پر فخر ہونا چاہیے۔

☆ منشی پریم چند سے لے کر نجیبہ عارف تک ہزاروں نہیں تو سینکڑوں افسانہ نگار گزرے ہیں۔ آپ کو فقط بانو قدسیہ کے حوالے سے خلا کیوں نظر آتا ہے؟

☆☆ یہ سوال آپ کو کیسے سوجھا ہے؟ میں نے اس قسم کی کوئی بات کہی ہے نہ لکھی ہے۔ بانو قدسیہ ہوں یا پریم چند یا کوئی اور، میں واضح طور پر سمجھتی ہوں کہ ایک پہلو سے دیکھا جائے تو ہر شخص کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے اور لکھنے والا ہمیشہ اس مقام پر متمکن رہتا ہے۔ خلا تو تب پیدا ہو جب لکھنے والا ہی نہیں، اس کی لکھت بھی دنیا سے غائب ہو جائے۔ لہٰذا ایک طرف تو جب تک کسی کی تصانیف موجود

ہیں اور بامعنی طور پر موجود ہیں، تب تک اس کا خلا پیدا ہی نہیں ہوتا۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جسے ہم سب فانی انسان دنیا میں اپنا مقام کہتے ہیں اس کی حیثیت پانی کے ایک بلبلے سے زیادہ نہیں۔ دنیا کے اس بحرِ بے کنار میں ازل سے لاکھوں کروڑوں بلبلے پیدا ہوتے ہیں اور اگلے ہی لمحے سطحِ سمندر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ کیا کبھی سمندر کی سطح پر کوئی خلا پیدا ہوا ہے؟ ہم سب اور ہماری یہ کمزور سی کوششیں، بقائے دوام بھی پالیں تو کتنی دیر زندہ رہ سکیں گی؟ چند ہزار سال؟ کائنات کے اس بے کنار سمندر میں یہ چند ہزار سال بھی ایک بلبلے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن یہ چند ہزار سال بھی کس کو نصیب ہوتے ہیں۔ سو زندہ رہنے، باقی رہنے اور خلا پیدا کر جانے کی حسرتیں سراسر بے سود ہیں۔ زندگی کے یہ چند سال ہی کارآمد طریقے سے گزر جائیں تو بہت ہے۔

☆ حمید شاہد کی اس بات نے ہمیں نہ صرف چونکا دیا بلکہ ہماری جستجو کو مہمیز بھی دی کہ ''مسلمان ہونا آپ کے ہاں شعوری سطح پر ایک سرگرمی بن جاتا ہے؟''

☆☆ مجھے معلوم نہیں کہ اس بات سے ان کی کیا مراد ہو سکتی ہے۔ خود اپنے حوالے سے بتا سکتی ہوں کہ میں اپنے مسلمان ہونے کے عمل پر مسلسل غور و فکر کرتی رہتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ مسلمان ہونے کا کیا مطلب ہے اور میں کیوں مسلمان ہوں؟ شاید انھوں نے اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہو۔

☆ ڈاکٹر صاحبہ! ایک نہایت حساس اور سلگتا ہوا موضوع ہمارا نظامِ تعلیم ہے جو ہر گزرنے والے دن کے ساتھ نہ صرف زوال پذیر ہے بلکہ نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ نہ صرف امتحانات میں نہایت منظم طریقے پر امیدوار کو کمک پہنچائی جاتی ہے بلکہ منہ مانگی قیمت پر اُمیدوار کی پسند کے نہ صرف نمبر دیے جاتے ہیں بسا اوقات تو امیدوار تک تبدیل کر دیے جاتے ہیں یا بلا کسی امتحان کے ڈگری تک کا کاروبار نہایت زور و شور سے جاری و ساری ہے؟

☆☆ جی ہاں، میں آپ سے متفق ہوں۔ یہی نہیں بلکہ بے حد احساسِ ناکامی کا شکار بھی ہوں۔ مجھے لگتا ہے ہمارے تعلیمی نظام کا ڈھانچہ بری طرح بکھر رہا ہے بلکہ بڑی حد تک بکھر چکا ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے منڈیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ یہ باقاعدہ ایک کاروبار ہے جہاں طالب علم صارف یا کلائنٹ ہے۔ اس معاملے میں میرا دل بہت دکھا ہوا ہے اور میں صفحات کے صفحات لکھ سکتی ہوں۔ لیکن پھر سوچتی ہوں کہ ان میں سے کون سی بات پوشیدہ ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ کیا ہو رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ایک سوچے سمجھے طریقے سے ہو رہا ہے۔ جو بات مجھے دکھائی دے رہی ہے وہ فیصلہ سازوں کو بھی تو نظر آ رہی ہو گی مگر وہ اس بحران سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں کر رہے۔ وہ دن دور نہیں جب یہ نظام ہمارے سر پر آسمان کی طرح ٹوٹ کر گر پڑے گا۔ اس کے آثار اب واضح دکھائی دے رہے ہیں۔ میں مالی اعتبار سے ایک زیادہ مفید شعبہ ترک کے شعبۂ تعلیم سے وابستہ ہوئی تھی۔ اس وابستگی کے پس پشت ایک خواہش، ایک خواب تھا۔ مجھے اُس ترک کا افسوس نہیں، اس حاصل پر غم ہے جو میرے خوابوں کی تعبیر سے الٹ نکلا۔ مجھے لگتا ہے اب اصلاح کا وقت گزر چکا ہے۔ اب ایک نئی تعمیر کی ضرورت ہے۔ ایک یکسر نئے نظام کی ضرورت ہے جس کی بنیاد درست ہو۔

☆ حال ہی میں بہاولپور یونیورسٹی میں جو شرمناک واقعہ میڈیا کے توسط سے منظرِ عام پر آیا ہے اُس کے بعد کئی تعلیمی اداروں کے ذمہ دار لوگوں نے نام اخفا رکھنے کی شرط کے ساتھ کئی بڑے تعلیمی اداروں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے اسے واقعہ نہیں کاروبار سے تشبیہہ دی جو نہایت منظم طریق پر ہو رہا ہے؟

☆☆ یہ صورتِ حال واقعی شرمناک ہے اور ایک دن میں پیدا نہیں ہوئی۔ جب ہم اپنے معاشرے سے اخلاق و اقدار کی اہمیت ختم کر دیں گے اور اپنی نئی نسل کی شخصیت کی تربیت کرنے کے بجائے اسے سوشل میڈیا کے چوک پر نہتا چھوڑ دیں گے تو اس کا مغلوب ہونا لازمی ہے۔ سوشل میڈیا ہی نہیں، اور بھی کئی ذرائع ہیں جو نئی نسل کی ذہن سازی میں اہم ترین اور تیز ترین کردار ادا کر رہے ہیں۔ مثلاً اشتہارات کی صنعت ہماری ترجیحات کا تعین کر رہی ہے اور ہمارے خوابوں کو پائیڈ پائپر کی طرح اپنے پیچھے لگا لینے میں ماہر ہے۔ ہم اپنے بچوں کو ان سے چھپا کر نہیں رکھ سکتے مگر ان کی ذہنی تربیت تو کر سکتے ہیں۔ یہ کام پہلے خاندان کے بزرگ کر لیتے تھے، کچھ اچھے مولوی بھی کرتے تھے، اور استاد تو کرتے ہی تھے۔ اب بزرگ آؤٹ ڈیٹڈ ہو گئے ہیں، مولوی اور استاد کی ترجیحات بدل گئی ہیں اور معاشرے میں ان کا مقام بھی پہلے جتنا مؤثر نہیں رہا۔ نتیجہ یہ ہے کہ:

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا

☆ ایک طرف ہم یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ادب اور معاشرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے مگر جب وطنِ عزیز کی جانب نظر دوڑاتے ہیں تو کئی طرح کی بندر بانٹ، ناانصافی اور ظلم کے بازار میں اہلِ قلم دُور، دُور تک نظر نہیں آتے؟

☆☆ معاشرے کا ہر طبقہ اپنے اپنے طور پر اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ سپاہی تلوار سے کام لیتا ہے، لوہار ہتھوڑے سے اور سرجن نشتر سے۔ جب ہم اہلِ قلم کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ادیب کا ہتھیار اس کا قلم ہے۔ معاشرے میں اس کے کردار کا اندازہ اس کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے اب بھی ظلم اور ناانصافی پر قلم اٹھایا جاتا ہے اور آواز بلند کی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا اثر نہیں ہو رہا۔ یہ اثر کیوں نہیں ہو رہا، اس کے کئی اسباب ہیں۔ ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

☆ یہ ہی حال عالمی معاملات کا ہے جن کے زیرِ اثر ہماری معیشت، معاشرت، سیاست اور ادارے تیزی سے تنزلی بلکہ تباہی کی جانب ڈھلے جا رہے ہیں مگر اہلِ علم اور اہلِ ادب کے کان پر جُوں تک نہیں رینگ رہی؟

☆☆ میں سمجھتی ہوں ہمارے ادیبوں نے قومی اور عالمی، دونوں طرح کے معاملات پر بہت زوردار ردِعمل ظاہر کیا ہے۔ حال ہی میں کراچی کے ایک ادبی جریدے ''مکالمہ'' کے مدیر مبین مرزا نے یکے بعد دیگرے کئی اداریوں میں معاصر قومی اور عالمی صورتِ حال پر سلگتے ہوئے سوال اٹھائے ہیں۔ اس سے پہلے مرحوم آصف فرخی نے اپنے رسالے ''دنیا زاد'' کے کئی خصوصی نمبر، عراق، افغانستان اور دیگر اہم عالمی واقعات کے حوالے سے شائع کیے اور مسلسل ایسی تخلیقات شامل کیں جو ایک طرح سے ادیب برادری کا مجموعی ردِعمل کہلائی جا سکتی ہیں۔ حال ہی

میں حسین مجروح نے سائبان کے نام سے ایک تحریک چلانے کا اعلان کیا ہے۔ مظہر سلیم مجوکہ، اقبال نظر اور آپ خود اپنے سوالوں کے ذریعے ان مسائل کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ فکشن کی طرف دیکھیں تو اسد محمد خان اور حسن منظر کے فکشن میں ہمیں اپنے معاشرے کے ناسور، خواہ وہ دیسی ہوں یا ولایتی، صاف دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں خاص طور پر حسن منظر کے ناول ''حبس'' کا ذکر کرنا چاہوں گی جو مسئلہ فلسطین کو موضوع بناتا ہے۔ حمید شاہد کے افسانوں کے مجموعوں، بالخصوص ''سُور گ میں سور'' اور ''مرگ زار'' میں سماجی صورت حال کا دردمندانہ بیان ہے۔ ۹/۱۱ کے ردعمل میں ہمارے ہاں جو فکشن لکھا گیا ہے وہ ادبی اعتبار سے تو زیادہ یا کم اہم ہوسکتا ہے لیکن یہ ضرور ظاہر کرتا ہے کہ ہمارا ادیب معاصر صورت حال سے بے خبر یا بے نیاز نہیں۔ یہی حال شاعری کا ہے۔ کشور ناہید کی نظموں کا ایک مجموعہ ''وحشت اور بارود میں لپٹی ہوئی شاعری'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے اور اپنی وضاحت آپ ہے۔ ضیاً الحسن کا مجموعۂ کلام ''آدھی بھوک اور پوری گالیاں'' اس نظام کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ ذیشان ساحل نے اپنی شاعری کو نعرہ بننے سے بھی بچایا اور مسائل سے بے بہرہ بھی نہیں رکھا۔ معین نظامی اپنی نظموں سے معاصر صورت حال کی الم ناکی پر گہرے طنز کے ذریعے شعور پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ حارث خلیق کی نظموں میں طبقاتی تقسیم میں جکڑے معاشرے کے خلاف سخت احتجاج ملتا ہے۔ ناصر عباس نیر اپنے مقالات اور افسانوں کے ذریعے استحصالی نظام کے چیتھڑے الگ الگ کر کے دکھانے کا کام کر رہے ہیں۔ یہ محض چند ایک نام ہیں جو بغیر کسی کوشش کے، فوری طور پر ذہن میں آ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی ادیب اور شاعر ہیں جن کے ہاں کبھی راست تو کبھی استعاراتی انداز میں قومی اور عالمی مسائل کا اظہار ملتا ہے۔ یہاں فہرست سازی مقصود نہیں۔ صرف اپنی بات کے حق میں چند مثالیں پیش کی ہیں۔

☆ آخیر میں چلتے چلتے یہ بتلا دیجیے کہ جس لگن، محنت اور شوق سے آپ نے ادب اور شاعری کے علاوہ دیگر کئی شعبوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک مالا میں پرو کر کڑی ریاضت بلکہ جہاد کیا ہے اُس کے عوض مستقبل سے آپ کی اُمیدیں کیا ہیں؟

☆☆ اس کے برعکس مجھے تو لگتا ہے کہ میں نے زندگی کو ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اس زیاں کاری سے نجات مل جائے اور یہ زندگی کسی کام آ جائے تو مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔

☆ غالباً آپ پہلی خاتون چیئر مین اکادمی ادبیات تعینات ہوئی ہیں۔ آپ سے قبل جتنے بھی چیئر مین آئے، بلند بانگ دعوؤں کے سوا کوئی ٹھوس اور بار آور کام نہ کر سکے۔ اس حوالے اہلِ علم اور اہلِ ہنر کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے آپ کے ارادوں اور منصوبوں کی بابت آگاہی ضروری ہو جاتی ہے؟

☆☆ اکادمی کا صدر نشیں ہونا میرے لیے بہت عزت کی بات ہے اور پہلی خاتون چیئر پرسن ہونا مزید باعثِ اعزاز ہے۔ اس تقرر کے جواب میں ملک بھر سے، بلکہ اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ دنیا بھر سے، اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں سے تعلق رکھنے والے اہل قلم نے جس طرح اپنی مسرت کا اظہار کیا ہے اور اس تقرر کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے اپنی حمایت کا یقین دلایا ہے اس نے جہاں ایک طرف میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے سرشار کیا ہے، وہاں احساسِ ذمہ داری کا ایک دباؤ بھی مجھے پہلے سے بڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میرے ادبی قبیلے نے مجھ سے بہت سی توقعات وابستہ کی ہیں اور میں ایک لمحے کے لیے بھی ان توقعات سے غافل نہیں رہ سکتی۔ میری کوشش تو یہی ہوگی کہ اپنی تمام تر استعداد بروئے کار لاؤں اور ادب، ادیب اور پاکستان کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں ادا کروں۔ میری خواہش ہے کہ اکادمی کے پلیٹ فارم سے پاکستان کی تمام زبانوں کے ادب کو نہ صرف قومی مرکزی دھارے میں شامل کیا جائے بلکہ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے مثبت چہرے کے طور پر پیش کیا جائے۔

ایک مدت سے پاکستانی قوم عالمی برادری میں اپنی پہچان کے ایسے مثبت حوالے کی تلاش میں ہے جو اس کے حقیقی چہرے کو اجاگر کر سکے۔ ادب یقیناً ہماری قوم کی قابلِ فخر شناخت بن سکتا ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کا ادب عالمی سطح پر پذیرائی حاصل کرے۔ اس کے لیے تراجم پر ترجیح دی جائے گی۔ بچوں اور نوجوانوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے اور اس کی نشوونما کرنے کے لیے مختلف اقدامات کرنا بھی میرے پیش نظر ہے۔ کتب کی اشاعت کے جدید تر طریقوں کا استعمال اب ناگزیر ہے، ادب کو ڈجیٹل صورت میں محفوظ کر کے اس کی بڑے پیمانے پر تشہیر و ترسیل کی جا سکتی ہے۔ بالخصوص ای بکس کا اجرا اس اعتبار سے اہم ہوگا کہ نہ صرف ادیبوں کو کتابوں کی اشاعت کے مالی بوجھ سے نجات ملے گی بلکہ کاغذ کے بڑھتے ہوئے استعمال کی روک تھام سے ماحول کا تحفظ بھی ہو سکے گا۔ ادیبوں کے تصنیفی حقوق کی حفاظت کے لیے بھی منصوبے وضع کرنے کی ضرورت ہے جس سے ادیبوں کے استحصال کا راستہ روکا جا سکے۔ اس سلسلے میں ادیبوں میں آگاہی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ وہ اپنے حقوق سے واقف ہوں اور ان کی حفاظت کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے ادبی ذخائر کو محفوظ بنانے کی ضرورت ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ قدیم مخطوطات سے لے کر ایسی اہم مطبوعہ کتب تک ان میں شامل ہیں جن کا ایک ہی ایڈیشن چھپا یا زیادہ ایڈیشن چھپے مگر اب وہ دستیاب نہیں اور سوائے چند ایک لائبریریوں کے، کہیں ان کا نام و نشان نہیں ملتا۔ ایسے نادر ذخائر کو ایک ڈجیٹل آرکائیول لائبریری کی صورت میں محفوظ کرنا بہت ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ہم رفتہ رفتہ اپنے ماضی سے کٹتے جائیں گے اور روایت کے تسلسل سے محروم ہو جائیں گے۔

یہ اور ایسی کئی اور باتیں ہیں جو دیوانے کے خواب کی طرح ایک عرصے سے دل و دماغ پر سوار رہی ہیں۔ اب اللہ سے دعا ہے کہ وہ ان خوابوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت بھی عطا کرے اور وسائل بھی۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتی کہ سب کچھ اسی طرح کر گزروں گی جس طرح سوچتی ہوں مگر یہ دعویٰ ضرور کر سکتی ہوں کہ اپنی سی ہر ممکن کوشش کروں گی۔

"ریگ زاروں کا سفر"

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے غزلیہ کلام سے منتخبہ

فاری شا (لندن)

زندگی، عشق و جوانی، رائگانی آخری شے ہے گنوانی، رائگانی
راستا، منزل، مسافت، رخت، راہی، ریگِ دریا ہو کہ پانی، رائگانی
شام کے پیروں سے لپٹی ہے تھکن سی رُخ پہ لکھّی ہے کہانی، رائگانی
جرعہ جرعہ کر کے جیون پی لیا ہے پیاس کی اب کیا سنانی رائگانی!
خواب کے دھندلے کناروں کی شبیہیں پھر یہ پلکوں کی گرانی، رائگانی
سوئی بن کے خوں میں بہتی جا رہی ہے آدمی کی یہ پرانی رائگانی
زندگی کا کینوس خالی پڑا ہے جانے کیسے ہے دکھانی رائگانی

..... ○ .....

☆

یہ زندگی ہے یا کوئی طلسم زا مکان ہے
خیال تک کے سامنے سوالیہ نشان ہے
ازل ابد کے درمیان گم قریب و دور سب
کہاں سے چل کے آئے تھے، یہ کون سا جہان ہے
نجانے کتنی وحشتوں نے گھیر رکھا تھا مجھے
مگر جو دل کے پاس ایک درد کی مچان ہے
یقین لڑکھڑا رہے ہیں زندگی کے بوجھ سے
مگر سفر کی آرزو ابھی تلک جوان ہے
عدو کو سونپ آئے ہیں متاعِ جان و آبرو
یہ ڈھال ، یہ نشان ہے، یہ تیر، یہ کمان ہے
سلگ رہے ہیں دل میں اب نئے نئے سے واہمے
کتاب بے اثر ہوئی ہے، خواب نیم جان ہے

○

☆

آئینے میں عکس ہو یا عکس میں ہو آئینہ
کون جانے کون کیا ہو، توڑ دیکھو آئینہ
ایک ہی صورت! مری تھی یا تری تھی کیا خبر!
خواب بخشا رات کو یا آئینوں کو آئینہ
ریگ زاروں کے سفر کا بس یہی انعام ہے
ریت کا ہر ایک ذرہ بن گیا لو آئینہ
اس کو دیکھوں یا چھپا لوں؟ توڑ ڈالوں؟ دوں جلا؟
مل گیا ہے جھٹپٹے میں شام کے جو آئینہ
کون صیقل کر گیا ہے پتھروں کے ڈھیر کو
کل تلک دیوار تھی جو آج ہے سو آئینہ
ہے حقیقت یا تخیل، واہمہ ہے یا گماں؟
زندگی کے ہاتھ میں اک بار تو دو آئینہ

○

جابجا اڑتے ہیں جگنو میری یادوں والے
جیسے بادل ہوں دُھنی روئی کے گالوں والے

دل کی جھیلوں پہ اتر آئے پرندے کتنے
پیارے پیارے میرے گم گشتہ خیالوں والے

آنکھ سے جلتے چراغوں کے رواں ہیں بجرے
آرزوؤں سے بھرے، گنگا کناروں والے

چھوٹی چھوٹی سی وہ خوشیاں کہ جو سرشار کریں
چھوٹے چھوٹے سے وہ غم گہرے کچوکوں والے

قلفی آتی تھی چونی کی ملائی والی
اور اکنّی پہ بھی خوش ہوتے تھے لچھوں والے

تین پیسے کی خریداری پہ ''جھونگا'' لینا
جھولی بھر دیتے تھے چاچا جی وہ پھلیوں والے

عیدی گننا، اسے بٹوے میں چھپا کر رکھنا
پھر دعا کرنا کہ آجائیں کھلونوں والے

اور اک بار ذرا زور سے جھولا دے دو
بھائی پیارے سے، ارے بھائی او جھولوں والے!

سانس لیتا ہوا سہ پہر کا گیلا آنگن
سوندھے سوندھے سے پیالے بھُنے دانوں والے

میٹھے میٹھے سے، سہیلی کے مہکتے رقعے
دل کی گہرائی سے نکلے ہوئے لفظوں والے

کھول کے پڑھنا ہزاروں دفعہ دن میں ان کو
عید کارڈوں پہ لکھے شعر وہ بچوں والے

سبز کاغذ میں لپیٹے ہوئے تحفے سارے
سرخ ربّن سے سجائے ہوئے پھولوں والے

نیلے کاغذ پہ اداسی کی وہ لمبی نظمیں
حاشیے سرخ، عنابی، ہری بیلوں والے

چاند تاروں سے گئی رات کو دل کی باتیں
صبح کو ڈھونڈتے پھرنا وہی سپنوں والے

کان آہٹ پہ لگے رہتے نجانے کس کی
آج تک آئے نہیں لوگ وہ خوابوں والے

..... ○ .....

☆

الفاظ کے امکانِ نہانی سے زیادہ
کہنی ہے کوئی بات معانی سے زیادہ

اک اور حقیقت ہے پس و پیشِ حقیقت
اک اور کہانی ہے کہانی سے زیادہ

اک سبز سی چھاؤں ہے خیالوں کی ڈگر پر
گنبد سا کوئی عرش مکانی سے زیادہ

اک رات کی شدت ہے مرے عرصۂ جاں میں
امکان کے ہر دورِ زمانی سے زیادہ

○

☆

بکھر گیا ہے ہر اک سو غبارِ ہجر و وصال
بسا ہو سانس میں جیسے دیارِ ہجر و وصال

قلم میں تاب ہے کس کے جو کھینچ پائے کبھی
گریز کرتے زمانوں کا بارِ ہجر و وصال

ادائے حسنِ زمانہ، شمارِ شام و سحر
فریبِ خوابِ تمنا، بہارِ ہجر و وصال

نگاہِ عشق! ریاضت ابھی کچھ اور سہی
کھلے گا دیر سے سرِّ مدارِ ہجر و وصال

○

نہ شرطِ زندگی ہو تم
نہ وجہِ بے دلی ہو تم

کھلا جو میرے ہاتھ پر
وہ زخمِ نا رسی ہو تم

وصال ہجر ہی نہیں
فراق وصل بھی ہو تم

کبھی کبھی تو یوں لگا
کہ اب بھی اجنبی ہو تم

گئے جنم کی میں صدا
ازل کی ان کہی ہو تم

میں چیخ ایک کونج کی
جوابی خامشی ہو تم

فشارِ لازوال سے
بچی کھچی خوشی ہو تم

جسے بھلا دیا ہے اب
وہ گمشدہ ہنسی ہو تم

بہت مہیب رات میں
دیے کی روشنی ہو تم

فریبِ روشنی بھی کیوں
ازل سے جب بجھی ہو تم

کہیں کہیں، کبھی کبھی
ذرا سا جی اٹھی ہو تم

کہیں نہیں وہ ایک پل
کہ پھول سی کھلی ہو تم

کسی قدیم عکس پر
غبار سی پڑی ہو تم

اتھاہ رات میں کہیں
صلیب سی گڑی ہو تم

یہ خواب یا سراب ہے
کبھی ہوں میں، کبھی ہو تم

.....○.....

روح کی پاسباں یہ چادر ہے
راحتِ قلب و جاں یہ چادر ہے

بے ٹھکانوں کا، بے سہاروں کا
دائمی آستاں یہ چادر ہے

ابرِ امید دشتِ ہستی میں
سایۂ لامکاں یہ چادر ہے

ریشمی لمس زندگانی کا
اک طلسمی جہاں یہ چادر ہے

دھاگے دھاگے میں کائناتیں ہیں
عینِ کون و مکاں یہ چادر ہے

سنگ ریزے تھے بسترِ دل پر
شکر ہے اب یہاں یہ چادر ہے

خاروگل سب سمیٹ لیتی ہے
کس قدر مہرباں یہ چادر ہے

زندگی سے گلہ نہیں جب سے
دھوپ میں سائباں یہ چادر ہے

خواب ٹانکے ہیں، دل پرویا ہے
آرزو کا نشاں یہ چادر ہے

کون کہتا ہے کور بینی ہے
دیدبانِ جہاں یہ چادر ہے

فیضانِ نظر

محمد سلیم الرحمٰن
(لاہور)

اصل شے تو گودہ ہے۔اس کے تحفظ کے لیے ارد گرد خول ہوتا ہے یا چھلکا۔گودا جان اور خول یا چھلکا جسم۔ایک کا تصور دوسرے کے بغیر مشکل ہے۔ کہتے آتے ہیں کہ بیش بہا تو گودا ہے۔خول یا چھلکا تو اس کی حفاظت پر مامور ہے۔بے پروائی سے دیکھا جائے تو یہی درست معلوم ہوگا۔

کون جانتا ہے کہ اس ہم زیستی میں دونوں کسی طور ایک دوسرے پر اثر انداز نہیں ہوتے! ظاہر کا کچھ جوہر رس کر باطن تک نہ پہنچتا ہوگا؟ باطن کی کوئی رچنا ظاہر سے گھلتی ملتی نہ ہوگی؟ جس خول یا چھلکے کو ہم پھینک دیتے ہیں وہ بھی اپنے میں کچھ کمالات رکھتا ہے۔''کمالِ ہم نشیں در من اثر کرد'' اسے حقیر نہ جانیے۔جدید طبیعیات بھی یہی کہتی ہے۔الف اگر ب پر اثر ڈالتا ہے تو لامحالہ ب بھی، کسی نہ کسی طرح الف پر اثر انداز ہوگی۔

نجیبہ عارف کی کتاب ''راگنی کی کھوج میں'' میں دو زندگیاں گودے اور خول کی طرح آپس میں پیوست ہیں۔ایک نجیبہ کی آپ بیتی، دوسرے ان کے مرشد محمد عبیداللہ درّانی کی زندگی کے حالات جو وقتاً فوقتاً ان کے سننے میں آئے اور جن کی تصدیق ظاہر میں بھی ہوتی رہی۔یہاں کیفیت کی بات یہ ہے کہ نجیبہ کی محمد عبیداللہ درّانی سے کبھی ملاقات نہیں ہوسکی۔جب ان کی عظمت سے آگاہی ہوئی تو وہ وصال فرما چکے تھے۔لیکن نجیبہ کی آپ بیتی میں جن واقعات اور محسوسات کا ذکر ہے ان سے سراغ ملتا ہے کہ آخر الامر ان کا درّانی صاحب سے اویسی انداز میں منسلک ہونا مقدر تھا۔سو انہوں نے نجیبہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔اپنی طرف بلا لینے کا عمل اچانک نہیں ہوا۔قدم بہ قدم تکمیل کو پہنچا۔خیال ہے کہ درّانی صاحب چاہتے تو یہ واردات، ایک تجلی کی مانند، لمحے بھر میں بھی مکمل ہوسکتی تھی۔لیکن وہ جو مصرع ہے ''دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر'' اسے ملحوظ رکھا جائے تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ظرف کے ایک معنی تو علامتی یا استعاراتی ہیں۔عام معنی میں اس سے برتن مراد ہے۔تو عطا کرنے والا یہ دیکھتا ہے کہ برتن میں سمائی کتنی ہے؟ ساخت کس وضع کی ہے؟ اگر جوہر اس میں بلا تأمل انڈیل دیا جائے تو چھلک تو نہ جائے گا؟ کہیں تحمل اور آہستگی کی ضرورت تو نہیں؟ چناں چہ درّانی صاحب نے آہستہ آہستہ شفقت سے راستے کے پیچ وخم سمجھا کر اپنے پاس بلایا ہے۔

ہر زندگی کا منصوبہ کہیں طے ہو چکا ہوتا ہے۔تمام واقعات، طرز حیات، ہنر، پیشہ، پسند، ناپسند، دوستیاں، دشمنیاں۔۔۔سب طے شدہ ہیں۔آپ کہیں گے کہ یہ تو جبر ہی جبر ہے، اختیار کہاں رہا۔یہ دونوں لفظ بھی ہم نے گھڑے ہیں اور سمجھتے ہیں ان کو معنی بھی ہم نے دیے ہیں۔اپنے فلسفوں اپنے ادب اور روز مرہ کے معمولات میں ہم ان معانی کو ڈھونڈتے رہتے ہیں اور کبھی کبھار، بہ زعم خود ڈھونڈ بھی لیتے ہیں۔لیکن دنیوی زندگی، اوّل تا آخر ایسا اسرار ہے جو اختیار اور جبر سے بہت آگے کی کوئی بات ہے اور ہماری سمجھ میں شاید کبھی نہ آسکے یا آ جائے تو بے حیثیت معلوم ہونے لگے۔یہ جانا بوجھا تجربہ ہے کسی چیز کی شدت سے تمنا ہو اور بڑے جتن کے بعد مل بھی جائے تو طلب کی بے مائیگی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

نجیبہ عارف کے دل میں بہت شروع سے طرح طرح کے سوال اُمنڈتے رہے۔اس لیے انہیں بابوں کی تلاش رہی، اس توقع پر کہ وہ تمام جواب فراہم کر دیں گے۔مشکلات کا حل سامنے لے آئیں گے۔لیکن یہ سوال اتنے بڑے بڑے تھے کہ ان کے تشفی بخش جواب مل نہیں سکتے تھے مثلاً ''میں کون ہوں؟'' یا ''میں کیوں ہوں'' جواب اس لیے نہیں مل سکتے کہ فرد کی پوری زندگی اس کا جواب ہوتی ہے اور جب زندگی یا زندگی کی کتاب ختم ہو جاتی ہے تو سوالوں میں کہیں کہیں جوابوں کے روزن روشن ہوتے نظر آنے لگتے ہیں۔شاید اس کے بعد نئے سوال درپیش ہوں، کسی نئی اور ہنوز ان جانی طلب سے واسطہ پڑے۔

نجیبہ کے والد بظاہر صوفی نہ تھے لیکن ان کے بھی ایک مرشد تھے جن کے لیے ان کے دل میں بے انتہا احترام بھی تھا اور عقیدت بھی۔والد کی باتیں نجیبہ کو حیران بھی کرتی تھیں اور پریشان بھی۔یہ بھی سمجھ میں آیا کہ جو ظاہر ہے صرف وہی زندگی نہیں۔پس پردہ بھی، تہ بہ تہ، بہت کچھ ہے جسے جانے پہچانے بغیر ایک مہیب تشنگی ستاتی رہتی ہے۔

یہی تشنگی نجیبہ کو ممتاز مفتی کے پاس لے گئی۔وہاں سے بظاہر کچھ نہ ملا۔مفتی صاحب کو ہومیوپیتھی سے لگاؤ تھا۔لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ مفتی صاحب کے ذریعے سے ہومیوپیتھی تک رسائی ہوئی ہومیوپیتھی سے قاضی احمد سعید سے شناسائی اور ان کے ہومیوپیتھی کے کلینک تک پہنچنے کا موقع ملا اور قاضی صاحب درانی صاحب کی طرف لے گئے۔غرض کڑیوں سے کڑیاں ملتی گئیں اور ایسے مقام پر پہنچ جانے کا قوی احساس ہوا جہاں، اور کچھ نہیں، ذرا اطمینانِ قلب تو حاصل ہوا۔ شاید کبھی اس سے آگے کی منزلیں بھی طے ہو جائیں۔

☆

یہاں درّانی صاحب کی حیات کے مختلف مراحل کا ذکر مقصود نہیں۔ تمام واقعات کا لُبِّ لُباب نجیبہ کی کتاب میں بہ طریقِ احسن موجود ہے۔میں اس پر اضافہ نہیں کرسکتا۔

شخصیت کے دو پہلو خصوصیت سے توجہ کے طالب ہیں۔اوّل درانی صاحب کی استقامت، دوسرے اطاعت۔جس چیز کی دھن سوار ہو جاتی تو پھر اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے چین نہ لیتے۔علی گڑھ میں ایک دن طے کیا کہ یونیورسٹی کا ایک انجینئرنگ کالج ہونا چاہیے۔ان دنوں ڈاکٹر سر ضیاء الدین

یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ درانی صاحب روز صبح کو ان کے دفتر کے باہر بنچ پر جا بیٹھتے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین آتے تو انہیں سلام کرتے۔

وہ پوچھے: ''کیسے آئے ہو؟''

یہ کہتے: ''جناب یہاں انجینئرنگ کالج بنایئے۔ یہاں کام کے لوگ پیدا ہونے چاہئیں۔ یہ افسر شاہی قوم کی تعمیر نہیں کرتی۔''

وہ ہنستے اور دفتر میں داخل ہو جاتے۔ ایک دو بجے دفتر سے باہر نکلتے تو درانی صاحب کو وہیں بیٹھا دیکھتے۔ درّانی صاحب اٹھ کر سلام کرتے اور اپنی بات دہراتے۔ پانچ چھ مہینے وہ روز آ کر چپڑاسیوں کے ساتھ بنچ پر بیٹھے رہتے۔ آخر ڈاکٹر ضیاء الدین نے کہا: ''بھئی تم نہیں مانتے تو سکیم بنا کر لاؤ۔''

اس طرح کی استقامت انسان میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ انکار، مسلسل انکار، کے سامنے ہار نہ مانے اور اپنی بات پر جو اس کے خیال میں بالکل صحیح ہو، اَڑا رہے۔ اور یہ خوبی درّانی صاحب میں بہ درجہِ اتم موجود تھی۔

اس مجوزہ کالج کے لیے سامان کی فراہمی کے سلسلے میں بارہا کلکتے گئے اور امریکی فوج، جنگ ختم ہونے کے بعد، جو سامان چھوڑ کر چلی گئی تھی، اس میں سے کام کی چیزیں بٹور کر لاتے رہے۔ اس دوران میں انہیں ایک ایسا تجربہ ہوا جسے ''وارداتِ قربِ موت'' (NDE) کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک روز ڈرائیور کے ساتھ مل کر ایکسرے کا بھاری ٹرانسفارمر جیپ سے اُتار کر نیچے رکھ رہے تھے کہ ڈرائیور نے سارا وزن درّانی صاحب پر چھوڑ دیا۔ انہوں نے اکیلے اسے اٹھا کر نیچے رکھا لیکن فوراً بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو ڈاکٹر سرنج ہاتھ میں لے پاس کھڑا تھا اور حیرت زدہ ہو کر بول اٹھا: ''خدایا، یہ تو جی اٹھا۔ تمہیں پتا ہے تم پورے ساڑھے تین منٹ تک قطعی طور پر مردہ تھے۔''

درّانی صاحب کا کہنا ہے کہ ان چند لمحوں میں وہ جس کیف، شادگی اور بے پایاں انبساط سے آشنا ہوئے اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ ''سارا عالم میں تھا اور میں سارا عالم۔''

کتاب کے آخر میں ایک رسالہ ''کہاں چلے سادھورے'' موجود ہے۔ درّانی صاحب نے اسے ۱۹۴۹ء میں انگریزی میں لکھا تھا۔ کتاب میں اس کا ترجمہ نجیبہ کے قلم سے ہے۔ یہ پیچیدہ تحریر ہے جس کی معنویت کی تک پہنچنا سہل نہیں۔ اس کا اختتام ''آخری بات'' پر ہوتا ہے جہاں ایک نوعمر سادھو کہتا ہے:

''وہ بے مثال ہے۔ اس ظاہری حقیقت کی دنیا میں اس جیسی، اس سے ملتی جلتی یا اس سے ماورا کوئی شے موجود نہیں۔ ہم صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ کیا نہیں ہے۔ یہ نہیں بتا سکتے کہ کیا ہے۔ مکان پھیل کر اتنا لطیف ہو جاتا ہے کہ معدوم ہو جاتا ہے اور زمان اس طرح جی اٹھتا ہے کہ صرف حیات باقی رہ جاتی ہے، زمان نہیں۔ لہٰذا نہ کہیں جانا ہے نہ کچھ کرنا ہے نہ کوئی منزل ہے۔ برہمن کا وہ مرکزی نقطہ جو میں ہے اور جس سے سفر کا آغاز ہوا تھا کہیں باقی نہیں رہتا اور جو باقی بچتا ہے اس کا کوئی نام نہیں ہوتا، بے شک تم اسے ہزاروں ناموں سے پکارو اور وہ سب نام سچے بھی ہوں۔۔۔ میں بالکل لاعلم ہوں لیکن پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے ہم ایک ہیں۔''

یہ وہی بات ہے جو لیری ڈوسی نے اپنی کتاب ''ذہنِ واحد'' میں ثابت کرنی چاہی ہے۔ یا genetics میں نوبیل انعام جیتنے والی باربرا میک کلنٹوک نے کہی ہے:

''بنیادی طور پر ہر شے واحد ہے۔ کوئی طریقہ ہی نہیں جس کے ذریعے سے آپ چیزوں کے مابین لکیر کھینچ سکیں۔ یہ ہم ہیں جو ان ذیلی تقسیموں کو تشکیل دیتے ہیں۔ یہ تشکیلات حقیقی نہیں ہیں۔''

یا جیسے معروف سائنس داں شرڈنگر کا قول ہے:

''میں یہ کہنے کی جرأت رکھتا ہوں کہ ذہن کو ملیا میٹ کرنا ممکن ہی نہیں کیوں کہ اس کا خاص نظامِ اوقات ہے یعنی ذہن ہمیشہ اب ہے۔ ذہن کے لیے درحقیقت نہ کوئی شے پہلے ہے نہ بعد میں۔''

رہی بات اطاعت کی تو درّانی صاحب کے بھی ایک مرشد تھے۔ ان کا نام بابا قادر اولیاؒ تھا۔ ۱۹۵۴ء میں انہوں نے ارشاد کیا:

''تم پشاور چلے جاؤ اور وہاں نوکری تو خیر کر ہی لو گے مگر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے کوشش کرو۔ اس کام میں لیکچروں اور ظاہری کوششوں سے زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ باطنی حیثیت سے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا۔''

کہاں جنوبی ہند کا ماحول، کہاں خیبر پختون خوا کی فضا۔ دیس اجنبی، آب و ہوا مختلف، معاشرہ جدا، زبان اَن جانی۔ لیکن مرشد نے جو کہہ دیا اس پر عمل لازم۔ پشاور پہنچ کر انہیں ایک بشارت کے ذریعے سے وادیِ سوات کے کسی پہاڑی مقام پر ٹھکانا بنانے کا حکم ملا۔ ۱۹۶۳ء میں درّانی صاحب نے اس مقام کو تلاش کر کے اپنا مستقر بنایا اور اس جگہ کا نام قادر نگر رکھا۔

درّانی صاحب کا ایک قول خوب ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کا اپنا ہے یا کسی اور کی بات دہرانی ہے۔ ''ہر چیز سے بھاگ سکتے ہو لیکن کیا اپنے آپ سے بھی بھاگ سکو گے؟'' یہی سارا بھید بھاؤ ہے۔ ہم اپنے آپ کا، اپنی حقیقت کا، اپنی ''میں'' کا، جو اصل میں کُل کائنات ہے سامنا کرنا ہی نہیں چاہتے۔ یہاں یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ دنیا میں فساد کی جڑ تو یہی ''میں'' اور ''منم'' ہے۔ لیکن یہ ''میں'' ظاہری ہے جسے دولت، اقتدار، ہوس، مرتبے اور جاہ سے سروکار ہے جو سراسر فریب اور رفتنی ہیں اور خود کو دھوکا دینے کی کوششیں ہیں۔ دنیا کے سامنے وہ جو جی چاہے رُوپ دھارے، ہر شخص کو پتا ہوتا ہے کہ وہ اصل میں کیا ہے۔ خود کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ ہم سمجھنا ہی نہیں چاہتے کہ باطن ''میں'' ہے کیا۔ آخر ''میں'' سے جو اپنی کلیت میں ناقابلِ فہم ہے، نجات مل بھی کیسے سکتی ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ہم سے ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ ہم قربت کا جتنا ک بھی تصور کر سکتے ہیں اس سے بھی زیادہ قریب۔ اس نکتے پر پہنچ کر زبان اور فہم دونوں عاجز ہیں۔ اس کائنات میں جو بھول بھلیاں سے کم نہیں، جو بے کنار ہے وہی اوّل و آخر ہے، ظاہر

وباطن ہے۔ ہرفرد''میں'' کی کھونٹی سے بندھا ہے۔شاید یہ بھی واہمہ ہے۔ہم کہیں بندھے ہوئے نہیں، آزاد ہیں۔مگر جدھر دیکھیے، جمادارت، نباتات، حیوانات سے زمین پر آسمانوں میں کسی نادیدہ رشتے میں جکڑے ہوئے ہیں۔خود ہی سے دوچار ہیں۔کیسی اسیری ہے یا یہی آزادی ہے؟ جو ہوگا وہی کہ سکے گا کہ میں نہیں ہوں۔ اور جب کہے گا کہ نہیں ہوں تو ہوگا۔اس گتھی کو کون سلجھائے!

☆

میں نے نجیبہ عارف کی کتاب کو ناول کی طرح پڑھا ہے کہ یہ واقعات اور کرداروں کے تنوع کے سبب سے ناولانہ دل رُبائی کی حامل ہے۔انگریزی مقولہ:''حقیقت افسانے سے عجیب تر ہوتی ہے۔''اس تحریر پر صادق آتا ہے۔نہ کہیں خطابت ہے نہ رنگیں بیانی۔مکالمے سیدھے سادے اور فطری ہیں۔منظر نامہ بے تکان انداز میں بدلتا جاتا ہے۔شاید اسی کے مدِنظر کہا گیا ہے کہ اچھی آپ بیتی اور اچھے فکشن میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات اپنی بیتی لکھنے والا اپنے امیج کو بنا سنوار اور جھاڑ جھٹک کر پیش کرتا ہے اور قاری فریبی میں مضائقہ نہیں سمجھتا۔اس کتاب میں اس قماش کی رنگ آمیزی نظر نہیں آتی۔میرا خیال ہے نجیبہ عارف نے کبھی ناول لکھنا چاہا تو وہ''راگنی کی کھوج میں'' سے مختلف تو ہوسکتا ہے،بہتر نہیں ہوگا۔جو کچھ اس کتاب میں ہے کسی کی نظر کا فیضان ہے۔

- بقیہ -

سائیں کمال خان شیرانی

کے خواب آنکھوں میں سجائے، چار سال میں تعلیم مکمل کر کے اپنے علاقے میں واپس آ گئے اور جلد ہی نائب تحصیل داری کا تمغہ سینے پر سجالیا۔پانچ برس تک سرکاری ملازمت کی چکی چلانے کے بعد بالآخر نظریہ، معاش کی ترغیب پر غالب آ گیا اور گھر والوں کی شدید مخالفت کے باوجود ان دوستوں نے سماجی ناانصافی کے خلاف احتجاج کے طور پر استعفے دے دیے۔

نوکری سے فارغ ہوئے تو معاشرے میں تبدیلی لانے نکل کھڑے ہوئے، رسالے نکالے، انجمنیں بنائیں، پمفلٹ تقسیم کیے، کتابوں کی دکان بھی کھولی جس کا مقصد سماج میں روشن خیالی کا دیا جلانا تھا اور نام تھا''فی الحال سٹیشنری مارٹ''۔سب سے اہم بات یہ کہ کوئٹہ میں ایک مکان کرائے پر لے کر ان ہم خیال دوستوں نے''لٹ خانہ تحریک'' کی بنیاد رکھی۔یہ بلوچستان میں ترقی پسندی اور روشن خیالی کی تحریک تھی۔اس کا مقصد مارکسزم کے نظریات کو عام کرنا تھا اور سائیں کمال خان شیرانی اس تحریک کی روح ورواں تھا مگر نجانے کیسا مارکسی تھا وہ کہ عین پارٹی کے اجلاس میں، تمسخر آمیز نظروں کی پروا کیے بغیر نماز کی نیت باندھ لیتا تھا کیوں کہ وہ پنج وقتہ نمازی تھا اور کبھی روزہ خوری نہیں کرتا تھا۔

نمازیں پڑھتا تھا یا کتابیں۔کتابیں اس کا بستر تھیں، کتابیں اس کا تکیہ تھیں اور کتابیں اس کا سہارا تھیں۔دنیا کی سب سے اچھی کتابیں چھپتے ہی اس کے پاس پہنچ جاتیں۔وہ پڑھ کر انھیں بانٹ دیتا۔لوگوں کو انھیں پڑھنے کے لیے اکساتا، کبھی ترغیب دے کر، کبھی طعنے مار کر۔پھر بھی نہ پڑھتے تو خود پڑھی ہوئی باتیں انھیں سنا سنا کر سمجھاتا۔وہ لکھتا بھی تھا۔ان کتابوں کے حاشیوں پر ،خطوں کے کونوں کھدروں پر، کاغذ کے پرزوں پر لکھتا تھا۔اس نے اپنی کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں چھوڑی لیکن وہ ترجمے کیا کرتا تھا۔ اسے اپنی مادری زبان پشتو سے عشق تھا۔وہ اہم انگریزی کتابوں کے پشتو میں ترجمے کیا کرتا۔پشتو بھی کوئی علمی وادبی نہیں، عوامی ہوتی۔عوام کی زبان، ان کا محاورہ، ان کا روزمرہ اسے مرغوب تھا۔اسی کی طاقت سے وہ اپنا پیغام اپنے ہم زبانوں تک پہنچا دیتا تھا۔اسی لیے تو شاہ محمد مری اسے''مصنف نہیں، مصنف ساز'' کہتا ہے۔

○

نجیبہ عارف کی افسانوی تشکیل

مبین مرزا
(کراچی)

یہ ایک مختلف نوعیت کا افسانوی مجموعہ ہے۔

افسانوں کے موضوعات، ان میں پیش کیے گئے کرداروں اور اُن کے ماجرے کے لحاظ سے ہی نہیں، بلکہ اُن تجربات کے اعتبار سے بھی جو ان افسانوں میں ابلاغ، ہیئت اور اسلوب کی سطح پر کیے گئے ہیں۔ اس مجموعے کے افسانوں کی بابت ایک قاری کا تاثر فی الجملہ بیان کرنا مقصود ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ جدید طرزِ احساس کے زائیدہ افسانے ہیں۔

اب کہنے کو تو یہ بات کہہ دی گئی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں فی زمانہ صغریٰ کبریٰ اس طرح واضح نہیں رہے کہ آدمی کسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جائے اور سمجھ لے کہ اُس کی بات کو صحیح سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا جائے گا، کوئی خلطِ مبحث پیدا نہیں ہوگا۔ دوسری طرف ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہماری تنقید میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ڈھنڈورچیوں نے گزشتہ ڈیڑھ دو عشروں میں بالخصوص وہ گرد اڑائی ہے کہ ادھر جدیدیت کا حوالہ آتا ہے اور اُدھر فکر و خیال کی فضا دھندلاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ سو گو یم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ ایسے میں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ آدمی یہ بات بلا تامل اور فیصلہ کُن طور پر ابتدا ہی میں کہہ دے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے تناظر میں سامنے آنے اور اختیار کیے جانے والے نظریات و تصورات کا ادب سے رشتہ یا اُس کے نقد پر اطلاق صرف اور صرف اُن تہذیبی اصولوں کے حوالے سے ہوسکتا ہے جو لکھنے والے کے سماج میں موثر اور اس کے تخلیقی عمل کے عقب میں کارفرما ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ انھی اصولوں سے تخلیق کار کے لیے انسانی و تہذیبی شعور، سماجی و ثقافتی اقدار اور انفرادی احساس کا لینڈ اسکیپ فراہم ہوتا ہے۔ اسی سے اُس کے فکر وخیال کی معنویت متعین ہوتی ہے۔ نجیبہ عارف کا تخلیقی عمل، اُن کے کردار، اُن کا احوال اور ماجرا اپنے خارجی دائرے اور داخلی نظام ہر دو سطح پر اس بنیادی شعور کا اثبات کرتے ہیں۔

نجیبہ عارف کی شہرتِ عام ایک نقاد کی حیثیت سے ہے۔ تحقیق و تدریس سے وابستگی اُن کی اس حیثیت کو مستحکم کرتی ہے۔ تاہم اُن کے اندر ایک تخلیق کار بھی پوری طرح فعال اور سرگرم ہے۔ نجیبہ عارف نے اپنی اس جہت سے اغماض نہیں برتا۔ اپنے تخلیقی جوہر سے روگردانی نہیں کی۔ اس کا ثبوت گاہے بہ گاہے رسائل میں شائع ہونے والی ان کی شاعری سے فراہم ہوتا ہے، کوئی چھ سات برس پہلے اُن کا شعری مجموعہ ''معافی سے زیادہ'' بھی منظرِ عام آچکا ہے۔ البتہ اُن کے افسانے کم کم ہی شائع ہوئے ہیں۔ اس لیے ممکن ہے، کچھ قارئین اُن کی اس جہت سے آگاہ نہ ہوں۔

ادب کی دنیا میں گو اتنی شدت سے نہ سہی، لیکن آدمی کو وہ مسئلہ پیش بہرحال آتا ہے جس کا سامنا شوبز کی دنیا کے لوگ کرتے ہیں۔ یہاں بھی آدمی کی شناخت کا جو ابتدائی حوالہ سامنے آتا ہے، وہ ہمیشہ کے لیے اس سے یوں مخصوص ہوتا ہے کہ پھر اس کی ادبی حیثیت کا بیشتر انحصار اسی پر ہو کر رہ جاتا ہے۔ چاہے بعد میں اُس نے کسی دوسرے شعبے میں کیسی بھی غیر معمولی صلاحیت کا اظہار کیوں نہ کیا ہو۔ اس کی ہمارے یہاں ایک دو نہیں متعدد مثالیں موجود ہیں۔ عسکری صاحب نے منفرد افسانے لکھے، کمال کے تراجم کیے، لیکن معروف نقاد کی حیثیت سے ہیں۔ ان کے بعد کے لوگوں میں وحید قریشی اور مشفق خواجہ کو بطور محقق بڑا مقام حاصل ہے۔ لیکن دونوں کی شاعری جو اپنی ایک اہمیت کی حامل ہے، اس سے کم لوگ واقف ہیں۔ نجیبہ عارف کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اُن کی شاعری اور افسانے دونوں تاحال وہ توجہ نہیں پا سکے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اس کی ذمہ دار ایک حد تک نجیبہ عارف خود بھی ہیں۔ بھئی آپ دیکھیے نا، ایک شخص کم و بیش بیس بائیس برس کے عرصے میں بمشکل یہی کوئی پندرہ افسانے لکھے اور پھر اُن کے شائع ہونے میں بھی تساہل شاعرانہ اور تجاہل عارفانہ۔ اب کوئی اس پر کہے تو کیا کہے اور نہ کہے تو کیوں نہ کہے۔

واقعہ یہ ہے کہ نجیبہ عارف کی تخلیقی شخصیت کا جو رُخ ان افسانوں کے توسط سے ہمارے سامنے آتا ہے، وہ اس قدر اہم ہے کہ اس کے ذریعے اُن کے تنقیدی منہاج اور فکری مزاج کو سمجھنے کے بھی کچھ زاویے ہمیں فراہم ہوتے ہیں۔ یوں نجیبہ عارف کا تخلیقی و تنقیدی جوہر اپنی کلیتِ کار میں رونما ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اُن کے افسانے عہدِ جدید کے انسان اور بالخصوص ایک عورت کی تہ در تہ کیفیات، احساسات اور تجربات کو فرد سماج تک پھیلتے دائرے میں سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ یہ موقع دونوں سطحوں پر یعنی وجود اور روح میں الگ الگ قوس پر ہی نہیں، بلکہ اُن کے باہم ملنے سے ایک محیط میں بھی فراہم ہوتا ہے۔ یہ محیط ہمارے سامنے جدید عہد کی زندگی کے متنوع خطوط نمایاں کرتا ہے۔ جب ہم بہ نگاہِ غائر دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے، یہ خطوط کہیں متوازی چلتے ہیں، کہیں باہم مدغم ہوتے اور کہیں ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں۔

ایک ذرا توجہ سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط انسانی احساس کی ان صورتوں کے مظہر ہیں جو کہیں ثقافتی عناصر، کہیں مذہبی علائم، کہیں سماجی نظام اور کہیں انسان کی گہری ازلی آرزوؤں نے وضع کی ہیں۔ بادی النظر میں فکشن نگار اپنے کرداروں کے وجود اور اُن کے سماجی نظام کا احوال بیان کرتا ہے۔ تاہم گہرا تخلیقی تجربہ ظاہر کی اس سطح پر رک نہیں جاتا، بلکہ وہ اس کو پلٹ کر اندر جھانکنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اس لیے کہ تخلیق کار اُن محرکات کو جاننے کا خواہاں ہوتا ہے جو فرد کے عمل اور اس کے حال کی بنیاد بنتے ہیں، جن سے سماجی رویے متعین ہوتے

ہیں اور جن کے ذریعے ایک تہذیب اپنے تشخص کے نشانات اور ایک ثقافت اپنے امتیاز کی علامات نمایاں کرتی ہے۔

اس مختصر اور تاثراتی تحریر میں حوالوں اور مثالوں کی کچھ ایسی گنجائش نہیں ہے، اس لیے ہم اشارات سے کام لیتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔ سطور گزشتہ میں کہی گئی بات کی وضاحت کے لیے ذرا ان افسانوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیجیے:

''جھوٹی کہانی'' کا مرکزی کردار ایک خاتون کا ہے جو راستہ بھٹک گئی ہے۔ اپنے ہی شہر کے کوچہ و بازار اُس کے لیے اجنبی ہو گئے ہیں۔ اسے مغرب سے پہلے گھر پہنچنا ہے، لیکن نہیں پہنچ پاتی۔ مغائرت جو اسے اپنے اندر اور باہر دونوں جگہ محسوس ہوئی، اُس کی راہ میں حائل ہوگئی۔ مغرب کی اذان ہوگئی اور روزہ کھل گیا، لیکن اُس کا روزہ تو راستے میں ٹوٹ چکا تھا۔ اب اسے گھر جانے کی جلدی نہیں رہی۔

''صدیوں بھرا لمحہ'' ایک ایسے نسوانی کردار کا احوال پیش کرتا ہے جس پر زندگی اپنے کچے پکے، دھندلے، گہرے، مٹتے اور ابھرتے رنگوں کے ساتھ کھلتی چلی گئی ہے۔ زندگی جس میں حسن، محبت، جذبہ، خلوص، بے وفائی، بے حجابی، لایعنیت، معنویت، مذہب اور تصوف جانے کیا کیا کچھ ہے، لیکن وہ سوالیہ نشان جو ہر وقت اس زندگی کے سامنے لگا ہوا ہے وہ اس کردار یعنی خود زندگی کو معلق رکھتا ہے۔

''سخت بے زمینی ہے'' کا مرکزی کردار بھی خاتون ہے اور اس سوال کی گھمبیرتا سے دوچار ہے کہ اس کا تعلق کس شہر سے ہے۔ ماضی اور حال کے شہروں سے اپنے تعلق پر غور و خوض، بلکہ اپنی وابستگی کے اثبات کے باوجود اس کے لیے ممکن نہیں ہو پاتا کہ وہ اطمینان اور تیقن سے طے کر پائے کہ وہ کس شہر کی ہے۔

''اندیشۂ جاں تھا پہلے'' کا موضوع بہ یک وقت مقامی اور بین الاقوامی ہے لیکن دونوں جگہ اس کی نوعیت اور انسانی تجربے کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ اس کا سبب عالمی سیاست کی وہ رسا کشی ہے جو انسانی جذبے اور مذہب کو بھی سفاکی سے استعمال کرتی ہے۔ اس کے لیے ذرائع ابلاغ کا اثر و نفوذ بھی غور طلب ہے جو ایک عہد اور اس کی پوری نسل کی قلب ماہیت کر ڈالتا ہے اور تجربے کی مقامی ہول ناکی اور اس کو مزید مستحکم کرتی ہے۔

''حاشیے پر لکھی ہوئی کہانی'' ماں، باپ اور بیٹے کی زندگی میں بہ یک وقت آ کر ٹھہر جانے والی ایک اذیت کا ماجرا ہے۔ ایک ایسی اذیت جو ایک طرف شکستِ خواب کا منظر رکھتی ہے اور دوسری طرف گلوبل ولیج کے انسانوں کی زندگی کی برہنہ حقیقت کا نقش ہے۔ وہ حقیقت جو دھوکے کا پردہ چاک کرتی اور فرد سے سماج تک کی کایا کلپ کا ذریعہ بنتی ہے۔

''من مارنی'' ایک بلیغ سماجی اور ادبی کردار ہے۔ نام سماجی اقدار کے دائرے میں ہارتی ہوئی زندگی کو بامعنی بنانے کی کامیاب سعی کرنے والا ایک ایسا نسوانی کردار جو مردانہ جبر کے سامنے بظاہر سپر انداز ہے، لیکن دراصل اپنے وجود کی پسپائی کو طاقت میں تبدیل کر کے روح کی جیت کا سامان کرنے والا ہے۔

''سانس کی آواز'' بھی ایک عورت کو درپیش صورتِ حال کا بیانیہ ہے۔ یہ بیانیہ اُس کے ماضی، حال اور مستقبل کی بابت بہ یک وقت کلام کرتا ہے۔ یہ عورت جو ہمارے سامنے محض اُس ساعت میں آتی ہے جب اسے اپنے باپ کو ڈاکٹر کے اپوائنٹمنٹ کے وقت پر پہنچنے کا مسئلہ درپیش ہے، فی الواقعہ انا، سمجھوتے اور بے حسی کے وہ رُخ ہمارے سامنے لاتی ہے جن میں زندگی معنویت اور لایعنیت کے عین بیچ معلق محسوس ہوتی ہے۔

''بیٹھے نکلے'' میں ہمیں نئی اور پرانی دنیا کے کرداروں کو اُن کے خارج میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے ذریعے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ دو دنیائیں Indigenous کلچر کی تخریت اور نئے زمانے کے مظاہر سے پیدا ہونے والے انسانی احوال کو بیان کرتی ہیں۔ سکڑتا سمٹتا آدمی اور اس کے رشتے نئی دنیا کی مادیت کے آگے سر بہ زانو ہوئے جاتے ہیں۔

''ادھورا خط'' یوں تو ایک صدی بعد کے مستقبل اور اس میں سانس لینے والی نسل کو ہمارے سامنے لاتا ہے، لیکن اس میں عہدِ حاضر کی ترقی اور کامیابی کی شاہراہ پر دوڑتے اور لپکتے اندھیروں کو بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

''ورکنگ وومن'' کو ایک طرح سے مونولوگ کہہ سکتے ہیں۔ ادب میں یہ اصطلاح گریک ٹریجڈی سے آئی ہے۔ کسی کردار کی ایسی خود کلامی جو اس کے داخلی احوال ہی کو بیان نہیں کرتی، بلکہ دوسرے کرداروں سے اس کے ربط و ضبط اور اس کے ماضی و حال کی بھی عقدہ کشا ہو۔ اس افسانے کے مرکزی کردار کا سارا ماجرا جو اُس کے ماضی و حال کی قوس بناتا ہے وہ اس کے ذاتی و سماجی عمل کے حزن کو صاف صاف بیان کرتا ہے۔

''رائگانی'' بھی ایک مونولوگ کی صورت ہے۔ یہاں بھی ایک کردار کا ماجرا بیان ہوتا ہے، لیکن اس کا سیاق الگ ہے۔ تاہم داخل اور خارج کی کشمکش یہاں بھی ہے اور یہ سارا منظر نامہ بھی ایک نسوانی کردار کی جہت سے ابھرتا ہے۔ اس کردار کی دبازت غور طلب ہے جس کے لیے نفی و اثبات سے معکوس کام لیا گیا ہے۔

''بے وجودیت'' ایک گہرے داخلی ردِ عمل سے پیدا ہونے والا افسانہ ہے۔ یہاں انسان اپنی بے حیثیتی کا مظہر ہے۔ ابن الوقتی اور موقع پرستی انسانی زندگی اور سماج کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے، لیکن اس دور میں جس طرح یہ پورے انسانی وجود کو امیبا جیسی لجلجی شے میں تبدیل کر رہی ہے اور جس طرح اس رویے کا تناسب انسانی سماج میں بڑھ رہا ہے، وہ ضرور نیا ہے اور ہول ناک بھی۔ اس لیے کہ یہ انسان کی اصل کی نفی پر مصر ہے یعنی اس کارخانۂ قدرت میں اس کا مکمل انہدام۔

''مرہمِ درد کا درشالہ'' ایک ایسے فرد کی اُس ساعت کی کیفیت بیان

کرتا ہے جو وقت کے ایک ٹھہرے ہوئے دائرے سے نکلنے کی کوشش میں معمولات کے ڈھرے کوتوڑ کر شمالی علاقہ ات کی سیاحت پر نکلا ہے۔ ماضی سے نجات اور مستقبل سے علاحدگی کی خواہش میں وہ حال کو بسر کرنا چاہتا ہے۔لیکن زندگی کے معنی اور رنگ تو آدمی سے قائم ہوتے ہیں اور آدمی ہی تو وقت کے دائروں کو باہم آمیز کرتا ہے۔یہی تو زندگی ہے۔

''پچھلی رات کا جادو'' کا بیانیہ ملال اور اندوہ کی جس کیفیت کو لے کر چلتا ہے وہ ماضی کے اثر میں حال کی کایا کلپ کو سامنے لاتی ہے۔محرومی اور ملال کے رنگ ہمیشہ گہرے محسوس ہوتے ہیں،لیکن اس کا کیا کیجیے کہ آدمی کی مٹی اندر سے ایک دم کچی نکل آتی ہے اور رنگ پر رنگ چڑھتے دیر نہیں لگتی۔بات یہی تو ہے،آدمی پر رنگ آدمی ہی کا چڑھتا ہے،ملال اور جمال دونوں ہی صورتوں میں۔

''سرحدِ امکاں سے آگے'' درحقیقت زندگی کا عقدہ ہے۔ایک پہیلی جس میں جاذبیت اور بے معنویت کے اشارے اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔یہاں علامتیں اور استعارے معنویت کا پردہ چاک کرتے ہیں،لیکن حقیقت سے التباس اور التباس سے حقیقت کا رخ سامنے آتا ہے۔حد یہ ہے کہ یاں وہی ہے جو اعتبار کیا کے مقام پر آدمی پلٹ کر دیکھتا اور پھر سوچتا ہے۔اسے مکمل ایبسر ڈئی کہا جاسکتا ہے،لیکن یہ کیا؟ یہ تو زندگی ہے،انسان کا تجربہ ہے۔جی ہاں،یہی اس کی معنویت ہے،اگر واقعی انسان کی زندگی میں معنویت کوئی شے ہے تو۔

یہ جو گزشتہ سطور میں ہر افسانے کے بنیادی نکتے تک پہنچنے کی ایک مشق سی کی گئی ہے،یہ بے محل نہیں،بوجوہ ہے۔واقعہ یہ ہے کہ نجیبہ عارف ایسے لکھنے والوں کو سمجھنے اور اُن کی فنی معنویت کو پوری طرح گرفت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے مرکزی مسئلے تک ہماری رسائی ہو پائے۔ چناں چہ اب جب کہ نجیبہ عارف کی افسانوی تشکیل کا پورا انسانی لینڈ اسکیپ اُن کے فکری نشانات اور ذہنی رجحانات کے ساتھ ہمارے سامنے ہے تو یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُن کا مرکزی مسئلہ فی الاصل عناصر اور عوامل کی اس دنیا میں بالعموم انسانی وجود اور بالخصوص عورت کی حقیقت وحیثیت کی تفہیم سے تعلق رکھتا ہے،جس پر مذہب، عقائد،نظریات،تصورات،فلسفے،ادب وشعر،سائنس اور سیاست سب اثر انداز ہوتے ہیں،کبھی براہِ راست اور کبھی بالواسطہ،کبھی بتا کر اور اکثر بتائے بغیر اور اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ اس کے اطراف اور اس کے باہر کا نقشہ ہی نہیں، بلکہ اندر کی دنیا بھی منقلب ہو جاتی ہے۔

اس کے لیے نجیبہ عارف نے دو باتوں کا خاص طور سے التزام کیا ہے۔ایک یہ کہ انھوں نے اپنے تخلیقی تجربے کے لیے نوے فی صد سے زیادہ واحد متکلم سے کام لیا ہے۔صیغہ واحد حاضر اُن کے یہاں موضوع کے سب سے نمایاں زاویے،افسانے کے بنیادی سوال،مرکزی کردار اور کبھی افسانے کے پورے دائرے کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ وہی تخلیقی پیرایہ ہے جس کی طرف لارنس نے فکشن نگار کے متعدد زندگیاں جینے کا کہتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔ یہ تکنیک اُن کے افسانوی جغرافیہ ہی کو سمجھنے میں معاونت نہیں کرتی بلکہ یہ افسانے کے تاروپود میں متشکل ہونے والے احوال کو ان سائیڈ آؤٹ دیکھنے کے لیے بھی کفالت کرتی ہے۔یوں افسانے میں ایک ایسا تناظر ہمیں فراہم ہوتا ہے جس میں داخل اور خارج باہم درآویزاں ہیں۔ یہاں ہمارا ذہن ایف آر لیوس کے اُس خیال کی طرف جاتا ہے جو اُس نے A reverent openniss before life کہہ کر فکشن نگاروں کے حوالے سے پیش کیا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اکیس ویں صدی کے انسانی سیاق کو پیشِ نظر رکھا جائے تو کیا حیاتِ انسانی کی تنظیم کا کوئی سانچا سالم بھی نظر آتا ہے؟ ورچوئل ریئلٹی کے اس عہد میں کہ جب حقیقت اور التباس کا فرق معرضِ تشکیک میں ہے تو پھر پسپا ہوتی ہوئی زندگی، مضمحل ہوتی ہوئی تہذیب اور درماندگی سے دوچار ثقافت کے رُوبہ رُو توقیر و تعظیم کا ساول ہی کیا باقی رہ جاتا ہے۔نجیبہ عارف کے افسانوں کا منظر نامہ اور اس میں رونما ہوتے کردار جس ابتری اور اضمحلال کا سامنا کرتے ہیں، وہاں توانائی اور صلابت کا یہی اظہار کیا کم ہے کہ وہ لایعنیت کا شکار ہونے پر آمادہ نہیں۔

دوسری چیز جس کا ان افسانوں میں بطورِ خاص لحاظ رکھا گیا ہے وہ ہے فوکس کیے گئے کردار کی روح کی کیفیت کا بیان۔تاہم یہ التزام بہت ڈیلی کیٹلی کیا گیا ہے۔ یوں تو ایک عام قاری اس روح سے سروکار رکھے بغیر بھی ان افسانوں کو پڑھ کر اپنے تئیں ان کے معانی پا سکتا ہے،اور جن معانی تک اُس کی رسائی ہوگی، وہ غلط بھی نہیں ہوں گے۔لیکن اگر وہ ان کرداروں کے پورے اسکوپ کو ایکسپلور کرنا چاہتا ہے تو اسے اُن کی روح کی کیفیت کو بھی دیکھنا ہوگا جسے افسانہ نگار نے اپنے کردار کے ماجرے کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نجیبہ عارف کا بیانیہ رواں مگر دبیز ہے۔اس میں معانی کی ایک سے زیادہ سطحیں پیدا ہوتی ہیں۔اس میں اُن کا اسلوب بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اسلوب ہمیں عصرِ حاضر کی تابندہ افسانوی روایت جس میں اسد محمد خاں، خالدہ حسین، منشا یاد، رشید امجد اور مرزا حامد بیگ ایسے تخلیق کار شامل ہیں، کی یاد دلاتا ہے۔نجیبہ عارف نے ان بڑے فن کاروں سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ اُن کو اپنے فن میں جذب و تحلیل سے گزار کر اپنا ایک لہجہ تشکیل دیا ہے۔اس میں اُن کے مطالعے کی وسعت کے اثرات کو بھی صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

آخری بات۔ نجیبہ عارف کے یہ افسانے اپنے موضوعات اور کرداروں کی نسبت سے حزن کا آہنگ اور ملال کا ایک رنگ پیدا کرتے محسوس ہوتے ہیں،لیکن ان کا مکمل ابلاغ حزنیہ نہیں ہے۔یہ اداسی کی ایک کیفیت تو پیدا کرتے ہیں لیکن ہمیں کسی گنبدِ بیدر میں چھوڑ کر رخصت نہیں ہوتے۔یہ ہمارے اندر کسی سوال کا سامنا کرنے اور کسی خیال کے ساتھ چلنے کی خواہش پیدا کرتے ہیں،وجود کی کیفیت اور روح کے احوال کو پانے کے لیے۔اس لیے یہ افسانے عہدِ جدید کی انسانی زندگی کے تجربے کی تہ در تہ نوعیت کو سمجھنے کی ایک بامعنی کوشش سے عبارت ہیں۔

تیرگی کا علامتی بیانیہ

ڈاکٹر محمد کامران شہزاد
(لاہور)

اُردو ادب میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔آپ بحیثیت استاد، ماہر لسانیات، نقاد اور شاعرہ کے مستحکم شناخت رکھتی ہیں لیکن حال ہی میں ان کا اولین ناول " مکھوٹا" کی اشاعت نے قارئین کو ششدر کر دیا کیونکہ عمومی طور پر یہ متھ بنی ہوئی ہے کہ کسی بھی نقاد کے قلم سے تخلیقی متن کے اظہاریے کا وہ معیار نہیں ہوتا، جن معیارات کو وہ بروئے کار لا کر فن پارے کو پرکھتا ہے لیکن پھر بھی وہ مختلف تجربات کرنے سے باز نہیں آتا کہیں تو وہ اپنے تجربے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور کہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہذا مصنفہ بھی ناول کے آغاز میں اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں "سچ تو یہ ہے کہ مصنف کو ناول لکھنے کا کوئی تجربہ نہیں۔اس نے یہ ناول اناڑی پن اور ہٹ دھرمی سے لکھا ہے۔اسے طرح طرح کے تجربے کرنے اور ان تجربوں کے ذریعے خود کو سمجھنے کا جنون ہے۔آپ کو کچھ بتانا سمجھانا اس کا مقصد نہیں۔پھر بھی آپ یہ ناول پڑھنا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی۔مصنف کا توش پوش " راقم نے جب عکس پبلشرز کے فیس بک پیج کے ذریعے ناول کا عنوان " مکھوٹا" پڑھا تو اس عنوان کی گہرائی نے اپنی طرف متوجہ کیا۔اُردو لغات کے مطابق " مکھوٹا" نقلی چہرے، تصوراتی مصنوعی چہرے کو کہتے ہیں۔126 صفحات پر مشتمل یہ ناول تین حصوں میں منقسم ہے۔پہلا حصہ بعنوان "دھوپ" ہے، جس میں راست بیانیہ میں مصنفہ نے " سلیمہ بی بی" کے کردار کو مرکزی نقطہ بنا کر اس کے گرد کہانی کا بیانیہ تشکیل دیا ہے۔لوکیل پاکستان کا دور دراز گاؤں ہے۔مختصر سے ناول میں مصنفہ نے پہلے حصے میں " سلیمہ بی بی" کے کردار کی پرتوں کو ایک ایک کر کے عمدگی سے اپنے قارئین کے سامنے کھولا ہے۔ناول کے اس حصے میں ناول نگار نے مختلف النوع موضوعات کا انسلاک اتنی مہارت سے کیا ہے کہ کہیں بیانیے میں جھول نظر نہیں آتا ہے۔

مصنفہ نے جن اہم موضوعات پر اختصار کے پیرائے میں جامعیت کے ساتھ قلم فرسائی کی ہے۔ان میں سب سے اہم طبقاتی تقسیم ہے۔غریب، غربت کی لکیر سے نیچے زیست گزارنے پر مجبور ہے جبکہ امرا طبقے کے بنک بیلنس میں دن دگنی رات چوگنی اضافہ ہو رہا ہے اور پاکستانی معاشرے میں غربا کو نفرت بھری نگاہ سے دیکھنے کا عمل سلیمہ بی بی کی سہیلی ناز اور اس کی والدہ کی نظروں سے عیاں ہوتا ہے۔

ناول کے اس حصے میں سانحہ سقوط ڈھاکہ کو بڑی دردمندی سے بیان کیا گیا ہے۔سلیمہ کے والدین کے رونے کا عمل اس بات کا ثبوت ہے کہ مشرقی پاکستانی کی علیحدگی سے ہر پاکستانی بالخصوص مہاجرین کے دل پر قاری ضرب تھی۔

سلیمہ کا بار بار خود کو پُر فریب مناظر میں گم کر دینا اس بات کا غماز ہے کہ زندگی سے فراریت کا عمل ہر اس شخص کے ضمیر میں شامل ہے، جو بے بس ہے اور باوجود کوشش کے حالات کو تبدیل کرنے سے قاصر ہے۔ناول نگار نے جہاں سماجی حسیت کی کرب انگیزی کے ساتھ عقدہ کشائی کی وہاں کرداروں کی نفسیاتی کیفیات واحساسات کی عکاسی کی ہے۔

ناول کے پہلے حصے میں عام فہم اور سادہ نوعیت کی حامل کہانی ہے، جو قاری کو بوجھل پن کا احساس ہونے نہیں دیتی ہے اور قاری واقعات کی روانی کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔یوں محسوس ہوتا کہ مصنفہ نے پاکستان کی پچھتر سالہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں یوں رقم کیا جیسے کوزے میں دریا بند ہو۔

ناول کا دوسرا حصہ بعنوان "سائے" ہے۔یہ حصہ پہلے حصے سے یکسر مختلف ہے۔یہاں ناول کے بیانیہ کی تکنیک کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں علامتی پیرائے میں بات کی گئی ہے۔قاری محسوس کرتا ہے کہ مصنفہ نے لسانیاتی تھیورز کو برتنے کی کوشش کی ہے۔جس کا ثبوت آغاز میں محمد عمر میمن کے الفاظ " کیا کسی لکھنے والے کی تخلیقی کائنات میں کوئی دوسرا داخل ہو سکتا ہے " سے ہوتی ہے۔اس حصے میں بتایا گیا کہ کوئی شخص بھی کسی دوسرے کی تخلیقی کائنات میں داخل نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ پہلے حصے سے قاری کے ذہن میں سلیمہ بی بی کا کردار نقش ہو چکا ہوتا ہے، جس کی زندگی مزید گوشوں کے متعلق جاننے کے لیے بیقرار رہتا ہے۔جب مصنف کہانی کو روک دیتا ہے تو قاری ان الفاظ میں احتجاج کرتا ہے "ہم منتظر تھے کہ سلیمہ بی بی کے لاہور کے قصے معلوم ہوں، اس کی زندگی کے اگلے ابواب سے آشنائی ہوگی۔اس کے انجام تک پہنچیں گے مگر آپ نے تو راستہ ہی بند کر دیا۔۔۔سلیمہ بی بی اب صرف آپ کی نہیں رہی تھی۔وہ ہماری بھی ہو گئی تھی آپ نے اسے معدوم کر کے اچھا نہیں کیا" یہاں محسوس ہوتا ہے کہ قاری کی متن کے ساتھ گہری وابستگی ہے۔قاری کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ناول نگار کہانی کو آگے بڑھاتا ہے تو متن کا مرکزی کردار سلیمہ کو کبھی فرزانہ اور کبھی رخسانہ لکھتا ہے تب ناول کا مرکزی کردار "سلیمہ بی بی" آ کر احتجاجی خط لکھتی ہے کہ "تم یہ ناول کبھی مکمل نہیں کر سکو گی اس لیے تم مجھے کبھی جان نہیں سکتیں۔تم میرے تجربے کو اپنے اندر نہیں اتار سکتیں " یہاں قاری محسوس کرتا ہے کہ ہم سب ایک خود فریبی کائنات کے باسی ہے جہاں کسی دوسرے کی زندگی کے متعلق جاننا یا لکھنا بھی چاہیں تو نہیں لکھ سکتے ہیں۔

ناول کا تیسرا حصہ بعنوان " تیرگی " ہے۔اس حصے میں علامتی انداز میں انسان کی بے یقینی بیان کی گئی ہے کہ کائنات میں کچھ بھی حتمی نہیں یعنی وہ سلیمہ۔رخسانہ یا فرزانہ کوئی بھی ہو سکتی ہے۔انسان کی حتمی صورت کوئی نہیں ہے۔موت ہی انسان کی حتمی صورت ہے، جس کے بعد ہڈیوں کی چیچ اور کھوپڑی کے ڈھانچے کے سوا کچھ نہیں رہتا۔یہاں مصنفہ ساختیاتی تھیوری برتتی ہوئی نظر آتی ہیں ،جس طرح ساختیات اور پس ساختیات میں لفظ کے معنوی صوتوں پر بحث ہوتی ہے

باقی صفحہ ۳۹ پر ملاحظہ کیجیے

میٹھے نلکے

انوار احمد
(ملتان)

اس وقت نجیبہ عارف سے سبھی اہل کتاب بہت اچھی طرح متعارف ہیں۔حسن منظر رسما بھی وہ نہیں لکھتے جوانہوں نے اس کتاب کے لئے لکھا "نجیبہ عارف کے کرداروں کوان کیفیتوں سے گزرنا پڑا نہ وہ جگہیں خیالی ہیں نہ کردار وہ واقعات تک انوکھے نہیں جوانسان کومحبت بھرادل رکھنے کے باوجود بعض لحاظ سے بے حس بنادیتے ہیں"

نجیبہ بھی ہماری طرح مدرس ہیں اور مدرس کی تخلیقیت یا طباعی پر چند بڑے لکھنے والوں سے فیض کشی کا سایہ مرتعش ملتا ہے چنانچہ اس کتاب میں بھی ہمارے افسانے کے تین بڑوں انتظار حسین، خالدہ حسین اور حسن منظر سے کہیں کہیں انسپائریشن یا فیض کشی کی جھلک ملتی ہے مگر میرے خیال میں اشفاق احمد ایک ایسا افسانہ نگار تھا کہ جہاں کوئی ایسا مقام آئے کہ عالم یا معروضیت یا استدلال پسند منطقی کا دل بھی پھٹنے لگے تو وہ ایک لازوال فقرہ تخلیق کرتا ہے جو پورے افسانے کی ماہیت اور فضا بدل کے رکھ دیتا ہے یا اسے وہاں لے جاتا ہے جس سے آگے کوئی تخلیق کار جا نہیں سکتا۔نجیبہ کے افسانے "سانس کی آواز" کو اگر پہلے پڑھ لیں تو متکلم (عورت رہے یا مرد ہوجائے) کا کرب سمجھ میں آجاتا ہے کہ ہم ان کا حق ادا نہیں کر سکے ساری خدمت، عبادت گزاری اور ممنونیت کے باوجود جس نے بہت کچھ سہہ کر ہمیں دوسروں سے کچھ ممتاز کیا۔

"یہ سب آپ اور امی کا کمال ہے ابا"

"نہیں بیٹا ہم کوئی کمال نہیں کر سکے ہم سے ایک بھول ہوگئی تھی، ہم نے تمہیں بولنا، پڑھنا اور لکھنا تو سکھا دیا مگر سننا نہیں سکھایا"

"میٹھے نلکے" بھی بابا کا قرض اتارنے کی ایک ناکام کوشش ہے جو نقشہ آبائی گھر کا بابا نے متکلم کے دل میں نقش کیا تھا اسے کئی برسوں کے بعد نئے زمانے کی دی ہوئی شناختوں کو نظر انداز کر کے بابا کی محبت بھری یاد کی انگلی پکڑ کے ڈھونڈنی ہے، (افسانہ نگار کو متکلم کو مردانہ روپ دینا پڑتا ہے ورنہ احمد داود نے تو مارشل لا کے دوران لکھا تھا کہ سارے بھیڑیے جنگلوں سے نکل کر چھاونیوں میں آگئے ہیں مگر اب کسی بھی عمر کی لڑکی/عورت کے لئے ہر خضر صورت بھیڑیا ہے رہنمائی/ امداد/ ہمدردی کے حیلے سے قبر تک میں اتر کر نوچنے کے لئے۔اب اتنے کشٹ کے بعد متکلم کے سامنے یہ منظر ہے کہ آبائی گھر پر کسی کا قبضہ ہوگیا اور میٹھے نلکے اپنی شناخت کھو بیٹھے تھے

"وہاں نلکوں اور ان سے جڑی رونقوں کا نام نشان تک نہیں تھا بس ایک کونے میں ایک ٹوٹی ہوئی ہتھی والا زنگ آلود نلکا خاموش اور بے یار و مددگار کھڑا تھا میں نے بے دھیانی میں ٹوٹی ہوئی ہتھی کو نلکے کے اوپر رکھ کر جمایا اور اسے چلا دیا میں نے اوک بنا کر پانی کا گھونٹ بھرا تو وہ زہر کی طرح کڑوا کسیلا تھا۔"

خالدہ حسین جیسی بڑی تخلیق کار کی میت کو گہوارے میں دیکھ کر ایک اور دل کو چھو لینے والی تحریر "من مارنی" بھی اس کتاب میں ہے کہیں کہیں نجیبہ کو خیال آتا ہے کہ پاکستان میں بانو قدسیہ کے بعد نظریاتی افسانہ نگاروں کی دنیا کسی حد تک ویران ہوگئی ہے اس لئے وہ ایک دو افسانے اس خلا کو پر کرنے کے لئے لکھتی ہے۔

نجیبہ سے درد اور محبت کا ایک اور رشتہ بھی ہے ہماری ایک ڈاکٹر روبینہ الماس تھی جو کینسر کی زد میں تھی اس کے پہلے آپریشن کے بعد ہم دونوں کراچی کے اس ہسپتال میں گئے تھے اور اسے بہت دلاسہ دیا تھا اس کا پی ایچ ڈی کا تھیسس بھی میں نے مقتدرہ قومی زبان سے چھاپا اور اس کی تعارفی تقریب بھی اسلام آباد میں کرائی تھی مگر ہماری دعائیں، محبت اور توجہ کینسر کے سامنے بے بس ہوگئے اور اپنی جگہ کسک چھوڑ گئے اب اللہ ہماری بہت ذہین شاگرد (سربراہ شعبہ اردو ویمن یونیورسٹی ملتان) ڈاکٹر شاہدہ رسول کو لمبی عمر دے حسن تدریس اور حسن انتظام کی مگر اس کا پورا وجود نجیبہ عارف، اسلام آباد اور اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کے نام پر وردکرنے لگتا ہے منہ ول کعبے شریف۔۔۔

سو یہ کتاب بھی ڈاکٹر شاہدہ رسول کی وساطت سے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے بھیجی اور میں نے اپنی دانست میں دونوں کا شکریہ ادا کر دیا

یہ کتاب مبین مرزا کی اکادمی باز یافت کراچی نے شائع کی ہے ٹائٹل نجیبہ عارف کی بیٹی مومنہ نے بنایا ہے۔کاغذ اور جلد اس کتاب کی اتنی قابل رشک ہے کہ کل سے میں اسے ملتان کی بارش میں باہر بیٹھا پڑھ رہا ہے کتاب کی زیبائی میں کوئی کمی نہیں آئی ممکن ہے اس میں بھی کوئی معرفت کا نکتہ تلاش کر لے۔

گیت

خدا اُن دلوں میں بسیرا کرتا ہے جہاں سکون ہو،
ہمدردی ہو، لوگوں کے دلوں میں انسان اور
جانوروں کے لئے رحم ہو، خدا وہاں رہتا ہے
جہاں لوگ پیار و محبت کے گیت گاتے ہوں!!

~ولیم بلاک

''راگنی کی کھوج''

سلمٰی اعوان
(لاہور)

''راگنی کی کھوج'' نجیبہ عارف جیسی بلند پایہ ادیب اور شاعرہ کے کمال فن کا شاہکار ہے۔ کتاب کوئی تین ماہ پہلے ملی۔ سچی بات ہے نام کچھ کچھ پراسراریت لیے ہوئے تھا۔ گو میں اس عنوان کے تحت مبین مرزا کے جریدے ''مکالمہ'' میں اس کی دو قسطیں پڑھے بیٹھی تھی۔ ایک آپ بیتی سے متعلق دوسرے میں نجیبہ کے اندر کی بے چینی اس کا اضطراب، تجسس اور کھوج کی خواہش نمایاں تھی۔ میری پرورش وہابی گھرانے کی تھی مگر ایک تو میں بڑی باغی قسم کی لڑکی دوسرے گھر والوں میں بھی کچھ معاملات میں کٹر پن نہیں تھا۔

تاہم بابوں وابوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ ''شہاب نامہ'' میری پسندیدہ ترین کتاب ہوتے ہوئے بھی اس کا نائٹی والا قصہ مجھے ہمیشہ ایک افسانہ ہی لگا۔ ہاتھ نے جب کتاب تھامی۔ ٹائیٹل متوجہ کرنے والا تھا۔ کچھ سوال اٹھاتا تھا۔ پشت پر بلند قامت ادیب کی تحریر تھی۔ ''قوسین'' نے اسے چھاپا تھا۔ کاغذ طباعت ہر چیز بولتی تھی کہ اندر کچھ بہت خاص ہے۔ میری ایک گندی عادت ہے کہ میں کتاب کو مرحلوں میں پڑھتی ہوں۔

پہلے پھولا پھرولی، اس عمل میں اگر کسی عنوان نے پکڑ لیا تو بس لم لیٹ ہونا پہلی شرط۔ غرق ہونا دوسری، بشرط کہ وہ غرق کرنے والی ہو۔ یہاں ہر چیز غرق کرنے والی نظر آتی تھی۔ آلاپ اور سلیم الرحمٰن کی تحریر نے واضح کر دیا تھا کہ کتاب بڑی وکھری ٹائپ کی ہے۔ اسی لیے تمہید کے بعد عادت کے برخلاف پہلا باب 'ڈگر پنگھٹ کی' لیٹ کر پڑھنا شروع کیا۔

بابوں سے چاہت اور ان کا ظہور خیر سے پہلی لائن سے ہی ہو گیا تھا۔ ممتاز مفتی بھی اسی قبیلے سے ہیں۔ دوسری لائن سے وہ بھی بڑی شان سے اندر آدھمکے تھے۔ سوال جواب جاننے کی تڑپ، تحریر کی چاشنی، رنگینی اور شگفتگی میں کیا غضب کا بانکپن تھا کہ سارا وجود جیسے سرشاری میں بھیگنے لگا۔ بھیگتی چلی جا رہی تھی کہ یک دم جیسے کرنٹ لگا۔ کتاب ہاتھ سے گری اور سینے پر پڑی۔ اٹھارہ لفظوں پر مشتمل نجیبہ کے شوہر عارف کا صرف ایک جملہ سارے کمرے میں گونجنے لگا تھا۔

''میں تو تمہیں خدا کے حوالے بھی نہ کروں اور تم کسی انسان سے بیعت کر آئی ہو۔'' ساتھ ہی سوچوں کا در بھی کھل گیا تھا۔ خدا بڑا اڈاہڈا ہے مگر انسان بھی کیا شے ہے؟ محبت کے جنون میں اسے بھی چیلنج کر بیٹھتا ہے۔ مگر عارف نجیبہ کا شوہر ہے اور کیا کوئی شوہر بیوی سے ایسی شدید محبت کا دعوے دار بھی ہو سکتا ہے۔ عارف سے مل چکی تھی۔ نجیبہ کو جانتی ہوں۔ سچائی سے انکار کی گنجائش کہاں تھی؟ کتاب تو ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی اور جملہ چہار جانب رقصاں تھا۔

اس سے آگے پڑھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ آنکھیں بند کیں بس تو کب نیند میں چلی گئی نہیں جانتی۔ رات کے تیسرے پہر آنکھ کھلی تو کتاب کو دائیں بائیں دیکھا۔ سارا کمرہ پاگلوں کی طرح چھان مارا۔ کتاب غائب تھی۔ دونوں بیٹے پڑھنے کے شوقین ہیں۔ بڑا والا تو خیر سے بابوں کا بھی بڑا دلدادہ ہے۔ وہ لے گیا ہوگا۔ اب رات کے تین بجے اس کے پورشن میں جا کر اسے جگاؤں اور اس کی بیوی سے سنوں ''اے ہے بڈھی پاگل ہوگئی ہے کیا؟'' نہیں ایسا تو ہرگز نہیں کرنا۔ چلو خیر صبر کرتی ہوں ایک آدھ دن میں مل ہی جائے گی، مگر کتاب آگے سے آگے چلنے لگی تھی بچپن کی مزیدار کہانی ''جوں'' کی طرح۔

پورے ڈھائی ماہ بعد اس ماہ رخ کو میں کن جتنوں سے گھر لائی اس کی تفصیل چنداں خوشگوار نہیں۔ اس کے پڑھنے والے پرستاروں نے اسے جیسے چوم چوم اور چاٹ چاٹ کر یوں بے حال کر دیا تھا کہ آخری حصہ جا بجا زخموں سے نڈھال ٹیپ کی پٹیوں سے جکڑا پڑا تھا۔ تپ چڑھ گئی تھی مجھے۔ بیٹے کو بے نقط سنائیں۔ وہ زیر لب مسکرایا اور بولا ''اس کتاب کا پڑھنا خاص و عام کے لیے کار ثواب ہے۔ نجیبہ کوئی عام مصنفہ نہیں، سچی اور خالص لکھاری ہے۔

فہم وادراک کی دولت سے لبالب بھری ہوئی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں عجیب سا تاثر بکھرا ہوا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ بہت چھوٹی سی عمر سے اس نے انگریزی اور اردو کا سنجیدہ ادب پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اردشیر کاؤس جی سے پیار کرنے والا۔ مجھے یاد ہے جس دن وہ فوت ہوئے وہ یوں ہاتھ ملتا تھا جیسے اس کے ہاتھ میں پکڑا کوئی قیمتی ہیرا زمین پر گر گیا ہو۔ فکر نہ کریں ریڈنگز سے نئی لے آؤں گا یہ تو ہماری لائبریری میں ہونی چاہیے۔'' کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا تھا۔

کتاب کو کھولا۔ قاضی احمد سعید کے کلینک کا احوال، ان کی شخصیت کار نیکی کی تفصیلات اور خود اس میں نجیبہ کا شامل ہونا۔ اللہ کے پسندیدہ لوگوں میں جن اوصاف کا ہونا ضروری ہوتا ہے وہ سب اس شخصیت میں موجود تھے اور جنہیں نجیبہ نے عقیدت کے رنگ میں گھل کر نہیں سچائی اور حقیقت کی روشن آنکھ سے۔ لکھا اسی حق سچ کی آنکھ سے اس نے اپنے والد کو دیکھا۔ کہیں نشتر ان کی ذات میں اتارا اور کہیں محبت و پیار کے ساگر میں نہلایا۔ میرے بیٹے کا خیال ہے کہ وہ تو جماندرو (یعنی بچپن ہی سے) بابا تھے۔

پڑیاں باندھنے کے عمل میں خلق خدا کی خدمت کا جذبہ خود نجیبہ کے اندر تھا یا درانی سلسلے کی یہ اپنے معتقدین کے نفس کی تربیت کا جزو تھا۔ اس کا مجھے تب علم نہیں تھا۔ ہاں البتہ اب سیما پیروز سے معلوم ہوا کہ اس کے بھانجے بھی یہ کام کرتے تھے۔ روبینہ قمر لباش اپنے اور اپنے خاندان بارے، درانی صاحب کی حیاتی تفصیلات، ان کے افکار، زندگی کی گھمن گھیریوں میں خدا اس کے برگزیدہ بندوں کے معجزات سب ایک سحر زدہ سی کیفیات میں سے انسان کو گزارتے ہیں۔

درانی صاحب کو خط لکھنے والے کام کا ذکر کرنے سے پہلے نجیبہ نے اپنے اسکول کے زمانے میں سہیلی کو رقعہ لکھنے کی جو دلچسپ تفصیل لکھی ہے وہ قاری کو احساس دلاتی ہے کہ مصنفہ اپنی سرگزشت کو حسین بنانے کے فن پر کامل دسترس رکھتی

ہے۔

کتاب ایک منجھی ہوئی تخلیق کار کا شاہکار ہے۔ حد درجہ دلچسپ ذات اور سماج کے چھوٹے چھوٹے دلچسپ واقعات کے ساتھ چلتی، روانی کی طرح بہتی، کہیں آپ کو مسکرانے پر مجبور کرتی، کہیں آپ کو غمگین کرتی، کہیں خود آپ کو الجھن میں ڈالتی، کہیں آپ سے اختلاف کرتی، فہم و دانش اور اسرار کے جہان آپ پر کھولتی ہے۔

سلیم الرحمٰن جیسے مایہ ناز ادیب کے اس بیان کی مکمل تائید کرتی ہوں کہ میں نے بھی نجیبہ کی کتاب کو ناول کی طرح پڑھا ہے اور واقعی یہ جانی ہوں کہ اس کے پرسرار کردار اور واقعات اپنی انفرادیت کے باعث بے حد انوکھے اور سچے ہیں۔ روشنی اے روشنی نے مجھے ایک بار پھر چونکایا تھا۔ ذہن میں جیسے کھلبلی سی مچ اٹھی تھی۔ 1963 اور 64 کے دن جیسے سامنے آ کر ناچنے لگے تھے۔

باغبان پورہ کی معروف میاں فیملی کی بیٹی شوکت مطلوب جو ایک کنڈرگارڈن سکول چلاتی تھیں اور جہاں میں نے ایک سال ملازمت بھی کی تھی۔ سیما پیروز کی ممیری بہن، ان کے اسکول میں درانی صاحب کا دنوں کیا ہفتوں ٹھہرنا، آخری بڑے ہال نما کمرے میں ذکر کی محفل کا منعقد ہونا۔ لاہور کی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایلیٹ کلاس خواتین کا وہاں آنا اور اس محفل میں شامل ہونا سب منظر ایک کے بعد ایک آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے تھے۔ لاہور کالج کی ایک پروفیسر کا ''میرا پیا گھر آیا'' گنگناتے ہوئے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے جانا تو آج بھی نظروں کے سامنے ہے۔

کرید مجھے بھی بہت رہتی تھی۔ مگر یہ نجیبہ کی کرید سے بہت مختلف تھی۔ احساس کمتری کی ماری ہوئی لڑکی جس کے ہاں شعور اور فہم و ادراک کی شدید کمی تھی جو اندر کے حسن کی بجائے ظاہر کو دیکھتی تھی۔ میری کرید دنیاداری والی کرید تھی۔

عبیداللہ خان درانی سانولے رنگ کے درمیانی قامت کے ایک غیر متاثر کن شخصیت کے حامل انسان تھے۔ جنہیں میں نے کبھی قابل توجہ نہیں سمجھا تھا۔ میری توجہ کا مرکز تو وہ ماڈرن خواتین اور مرد تھے اعلیٰ ملبوسات، خوشبوؤں اور شان بے نیازی کے خول میں لپٹے ہوئے۔ میری ملازمت بس یونیورسٹی میں داخلے کے لیے پیسہ اکٹھا کرنے تک ہی تھی۔ مگر بعد میں گاہے گاہے خبریں تو ملتی رہتی تھیں۔ عشق و محبت، طلاق، شادی و محبت میں ناکامیوں کی خالص دنیاداری کے چسکے والی خبریں۔ یہ راز تو کہیں بہت بعد میں خود پر کھلے کہ یہ سب تو انسانی جبلتیں ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی رنگ میں ظہور پذیر ہونا ہی ہے۔ دین داری کی محفلوں کو ان سے جوڑنا تو ذہنی کم مائیگی اور پس ماندگی کی علامت ہے۔ نبیوں ولیوں کی مثالوں کے ڈھیر لگے پڑے ہیں۔ تاہم اس بیچ والے معاملے پر دل کبھی راضی ہی نہیں ہوا۔

ادھر ادھر انسانوں کی اس رنگا رنگی میں نجیبہ جیسے لوگ جو مضطرب روح کیا؟ کیوں؟ کیسے؟ کہاں؟ اور کیونکر؟ جیسے سوالوں کے گرداب میں الجھے تلاش حق کی تگ و دو میں سچے دل اور سچی تڑپ کے ساتھ مصروف رہتے ہیں اور برگزیدہ منتخب لوگوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ مگر یہاں تو تو لے (سر کے بال) چٹے ہونے کے باوجود اس نوعیت کی گہرائی نصیب ہی نہیں ہوئی۔ میرا حال تو سیدھا سیدھا نامور پنجابی شاعر صوفی مشتاق جیسا ہے جو اپنی چھت ٹپکنے، دال روٹی کی مہنگائی اور نانکی شک بنانے پر روپے پیسے کی کمیابی پر سیدھے سیدھے للکاریں مارتا ہوا پکارتا ہے۔

''آ اللہ میاں تھلے آ''۔ اور دکھڑوں کی پنڈ کھول دیتا ہے۔ سوال کرتا ہے کہ تمہیں یہ سب بھگتنا پڑے تو بتاؤ کیا کرو گے؟ اقبال کے تو چلو گلے شکوے بڑے مہذب اور اونچی سطح کے تھے پر صوفی مشتاق تو سب کچھ تہس نہس کر دیتا ہے۔ میں تو بڑی تھڑدل بڑی کمینی اور شودی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ آخر رشتہ تو اس اوپر والے سے ہی استوار کرنا ہے تو پھر بھئی سیدھے سیدھے اس کے حضور پہنچ جاؤ۔ خیر ڈال ہی دے گا۔ یہ بیچ کے بکھیڑوں میں کیا پڑنا۔

ہاں البتہ بیٹے کا کہنا ہے یہ اللہ کی برگزیدہ ہستیاں اس کے کس قدر قریب ہیں اور اس کے ساتھ کس تعلق میں گندھی ہوئی ہیں۔ اس دنیا کی کتنی پرتیں، کتنے اسرار، کتنے بھید ہیں آپ نہیں جانتی ہیں۔ وہ ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نجیبہ کے ساتھ اس کے تار فوراً جڑ گئے ہیں۔

کتاب کا آخری حصہ عبیداللہ خان درانی کی ''حیات اور کہاں چلے سادھورے'' ان کے افکار کا نمائندہ ہے۔ خدا گواہ ہے آپ کے چودہ طبق روشن ہوتے ہیں۔ یہاں مجھ جیسی ناقص العقل بونگیاں مارنے اور اپنی دانائیاں گھولنے کی بجائے ان کی تحریر کا وہ ٹکڑا پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھتی ہے۔ جسے نجیبہ نے ترجمہ کیا ہے اور کیا خوب کیا ہے۔

''وہ بے مثال ہے۔ اس ظاہری حقیقت کی دنیا میں اس جیسی، اس سے ملتی جلتی یا اس سے ماورا کوئی شے موجود نہیں۔ ہم صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ کیا نہیں ہے۔ یہ نہیں بتا سکتے کہ کیا ہے۔ مکان پھیل کر اتنا لطیف ہو جاتا ہے کہ معدوم ہو جاتا ہے اور زمان اس طرح جی اٹھتا کہ صرف حیات باقی رہ جاتی ہے، زمان نہیں۔ لہٰذا نہ کہیں جانا ہے نہ کچھ کرنا ہے نہ کوئی منزل ہے۔ برہمن کا وہ مرکزی نقطہ جو میں ہے اور جس سے سفر کا آغاز ہوا تھا کہیں باقی نہیں رہتا اور جو باقی بچتا ہے اس کا کوئی نام نہیں ہوتا، بے شک تم اسے ہزاروں ناموں سے پکارو اور وہ سب نام سچے بھی ہوں۔ میں بالکل لاعلم ہوں لیکن پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے ہم ایک ہیں۔''

یہ وہی بات ہے جو لیری ڈوسی نے اپنی کتاب ''ذہن واحد'' میں ثابت کرنی چاہی ہے۔ یا genetics میں نوبل انعام جیتنے والی بار برا میک کلنٹوک نے کہی ہے:

''بنیادی طور پر ہر شے واحد ہے۔ کوئی طریقہ ہی نہیں جس کے ذریعے سے آپ چیزوں کے مابین لکیر کھینچ سکیں۔ یہ ہم ہیں جو ان ذیلی تقسیموں کو تشکیل دیتے ہیں۔ یہ تشکیلات حقیقی نہیں ہیں۔''

یا جیسے معروف سائنس داں شروڈنگر کا قول ہے:

باقی صفحہ ۳۹ پر ملاحظہ کیجیے

تصوف میں ڈوبی آپ بیتی

فہیم الرحمٰن
(ملتان)

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف کی آپ بیتی ''راگنی کی کھوج میں'' تصوف کے رنگ میں ڈوبی انوکھی داستان ہے۔ جس میں ان کے مرشد محمد عبیداللہ درانی اور نجیبہ کی داستان یوں گتھی ہوئی ہے کہ انہیں الگ کرنا انتہائی دشوار ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف ایک ہمہ گیر شخصیت کی مالک ہیں۔ بتیس سال سے درس و تدریس و تحقیق سے وابستہ اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ اردو کی سربراہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ نے پبلک ایڈمنسٹریشن، اردو اور انگریزی زبان و ادب میں ماسٹرز کیے۔ اقبالیات میں ایم فل کی ڈگری حاصل کی اور اردو میں پی ایچ ڈی کیا۔ ہومیوپیتھک سسٹم میں ڈپلوما بھی حاصل کیا۔ اردو میں بی ایس سے پی ایچ ڈی کے نصاب کی تشکیل سے وابستہ رہیں۔ ممتاز مفتی کی شخصیت و فن پر کتاب تحریر کی۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ''معانی سے زیادہ'' دو ہزار پندرہ میں شائع ہوا۔ اردو ادب کا منظرنامہ ''رفتہ و آئندہ'' لکھا۔ عکسی مفتی کی کتاب ''اللہ، ماورا کا تعین'' کا ترجمہ کیا۔ سفرنامہ ''یادیں، جگہیں، چہرے اور خیال'' زیرِطبع ہے۔ ان کے پچاس سے زائد مقالات پاکستان، امریکا، جرمنی اور بھارت کے جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے فکر و فن پر مضامین، ایم اے اور ایم فل کے لیے کئی مقالات لکھے جا چکے ہیں۔

نامور ادیب، شاعر، مترجم اور دانشور محمد سلیم الرحمٰن نے ''تمہید'' کے عنوان سے دیباچہ تحریر کیا ہے۔

''نجیبہ عارف کی کتاب 'راگنی کی کھوج میں' میں دو زندگیاں گودے اور خول کی طرح آپس میں پیوست ہیں۔ ایک نجیبہ کی آپ بیتی، دوسرے ان کے مرشد محمد عبیداللہ درانی کی زندگی کے حالات جو وقتاً فوقتاً ان کے سننے میں آئے اور جن کی تصدیق ظاہر میں بھی ہوتی رہی۔ یہاں کیفیت کی بات یہ ہے کہ نجیبہ کی محمد عبیداللہ درانی سے کبھی ملاقات نہیں ہو سکی۔ جب ان کی عظمت سے آگاہی ہوئی تو وہ وصال فرما چکے تھے۔ لیکن نجیبہ کی آپ بیتی میں جن واقعات اور محسوسات کا ذکر ہے ان سے سراغ ملتا ہے کہ آخرالامر ان کا درانی صاحب سے اویسی انداز میں منسلک ہونا مقدر تھا۔ سو انھوں نے نجیبہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ نجیبہ عارف کے دل میں، بہت شروع سے، طرح طرح کے سوالات اُمنڈتے رہے۔ اس لیے انھیں بابوں کی تلاش رہی۔ یہی تشنگی نجیبہ کو ممتاز مفتی کے پاس لے گئی۔ مفتی صاحب کے ذریعے سے ہومیوپیتھی تک رسائی ہوئی، ہومیوپیتھی سے قاضی احمد سعید سے شناسائی اور ان کے ہومیوپیتھی کے کلینک تک پہنچنے کا موقع ملا اور قاضی صاحب درانی صاحب کی طرف لے گئے، جو بابا قادر اولیا کے مرید ہیں جن کے مرشد مشہورِ عالم بابا تاج الدین ناگپوری ہیں۔ میں نے نجیبہ کی کتاب کو ناول کی طرح پڑھا ہے کہ یہ واقعات اور کرداروں کے تنوع کے سبب سے ناولانہ دل رُبائی کی حامل ہے۔ انگریزی کا مقولہ: 'حقیقت افسانے سے عجیب تر ہوتی ہے' اس تحریر پر صادق آتا ہے۔ نہ کہیں خطابت ہے نہ رنگیں بیانی۔ مکالمے سیدھے سادے اور فطری ہیں۔ منظرنامہ بے تکان انداز میں بدلتا جاتا ہے۔ شاید اسی کے مدنظر کہا گیا ہے کہ اچھی آپ بیتی اور اچھے فکشن میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات اپنی بیتی لکھنے والا اپنے امیج کو بنا سنوار اور جھاڑ جھنکاڑ کر پیش کرتا ہے اور قاری فریبی میں مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اس کتاب میں اس قماش کی رنگ آمیزی نظر نہیں آتی۔ جو کچھ اس کتاب میں ہے کسی نظر کا فیضان ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک رسالہ 'کہاں چلے سادھورے' موجود ہے۔ درانی صاحب نے اسے انیس سو انچاس میں انگریزی میں لکھا تھا۔ کتاب میں اس کا ترجمہ نجیبہ عارف کے قلم سے ہے۔ یہ پیچیدہ تحریر ہے جس کی معنویت کی تہہ تک پہنچنا آسان نہیں۔''

محمد سلیم الرحمٰن لکھتے ہیں۔

''یہاں درانی صاحب کی حیات کے مختلف مراحل کا ذکر مقصود نہیں۔ تمام واقعات کا لب لباب نجیبہ کی کتاب میں بہ طریقِ احسن موجود ہے۔ میں اس میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ شخصیت کے دو پہلو خصوصیت سے توجہ کے طالب ہیں۔ اول، درانی صاحب کی استقامت، دوسرے اطاعت۔ جس چیز کی دھن سوار ہو جاتی تو پھر اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے چین نہ لیتے۔ علی گڑھ میں ایک دن طے کیا کہ یونیورسٹی کا ایک انجینئرنگ کالج ہونا چاہیے۔ ان دنوں ڈاکٹر ضیاالدین یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ درانی صاحب روز صبح کو ان کے دفتر کے باہر بینچ پر جا بیٹھتے۔ ڈاکٹر ضیاالدین آتے تو انھیں سلام کرتے۔ وہ پوچھتے: کیسے آئے ہو؟ یہ کہتے: جناب، یہاں انجینئرنگ کالج بنائیے۔ یہاں کام کے لوگ پیدا ہونے چاہئیں۔ یہ افسر شاہی قوم کی تعمیر نہیں کرتی۔ وہ ہنستے اور دفتر میں داخل ہو جاتے۔ ایک دو بجے دفتر سے نکلتے تو درانی صاحب کو وہیں بیٹھا دیکھتے۔ درانی صاحب اٹھ کر سلام کرتے اور اپنی بات دہراتے۔ پانچ چھ مہینے وہ روز آ کر چپراسیوں کے ساتھ بینچ پر بیٹھے رہتے۔ آخر ضیاالدین صاحب نے کہا: بھئی تم نہیں مانتے تو اسکیم بنا کر لاؤ۔ اس طرح کی استقامت انسان میں اس وقت بیدار ہوتی ہے جب وہ انکار، مسلسل انکار، کے سامنے ہار نہ مانے اور اپنی بات پر، جو اس کے خیال میں بالکل ٹھیک ہو، اَڑا رہے۔ اور یہ خوبی درانی صاحب میں بہ درجۂ اتم موجود تھی۔ رہی بات اطاعت کی تو درانی صاحب کے بھی ایک مرشد تھے۔ ان کا نام بابا قادر اولیا تھا۔ 1954ء میں انہوں نے ارشاد کیا: 'تم پشاور چلے جاؤ اور وہاں نوکری تو خیر کر ہی لو گے مگر اسلام کی نشاط ثانیہ کے لیے کوشش کرو۔ اس کام میں لیکچروں اور ظاہری کوششوں سے زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ باطنی حیثیت سے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا۔' کہاں جنوبی ہند کا ماحول، کہاں خیبر پختون خوا کی فضا۔ دیس اجنبی، آب و ہوا مختلف، معاشرہ جدا، زبان اَن جانی۔ لیکن مرشد نے کہہ دیا اس پر عمل لازم۔ پشاور پہنچ کر انھیں بشارت کے ذریعے وادیِ سوات کے کسی پہاڑی

مقام پر ٹھکانا بنانے کا حکم ملا۔ 1963ء میں درانی صاحب نے اس مقام کو تلاش کر کے اپنا مستقر بنایا اور اس جگہ کا نام قادر نگر رکھا۔''

ڈاکٹر نجیبہ عارف کی پچاسی سالہ والدہ ہدیہ ظفر کی دلچسپ آپ بیتی ''جیون دھارا'' بھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ جبکہ ان کے شوہر محمد عارف جمیل کے عمرے کا منفرد اور معلوماتی سفرنامہ ''حاضر سائیں'' بھی حال ہی میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ گویا یک نہ شد تین شد۔ اور ہر کتاب ایک سے بڑھ کر ایک۔ ''راگنی کی کھوج میں'' کو قوسین پبلشرز نے انتہائی اعلیٰ آفسٹ پیپر پر خوبصورت طباعت سے مرصع کیا۔ دو سو اسی صفحات کی اس دیدہ زیب کتاب کی بارہ سو روپے قیمت زیادہ نہیں ہے۔ کتاب کا آغاز نجیبہ عارف کی دل کو چھوتی تحریر ''الاپ'' سے ہوتا ہے۔ جس میں مصنفہ نے کتاب کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ کتاب کا انتساب بھی عبیداللہ درانی کے نام ہے، جنہیں ان کے قریبی مرید بابا جان کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ حمید نسیم کا شعر ہے۔ ''بابا جان کے نام!

دلدار ہے تو، خُو ہے تری خاک نشینوں پہ تلطّف
تیری نگہِ کم پہ بھی یاروں کو کرم ہی کا گماں ہے

''کہتے ہیں عبادت کے دس حصے ہیں، نو حصے خاموشی پر مبنی ہیں اور دسواں عبادت پر۔ یہ خاموشی کی تلاش کا سفر ہے۔ اس خاموشی کی تلاش جو ہر آواز، ہر گیت کو بامعنی بناتی ہے۔ خاموشی، جس میں کلام پیدا ہوتا ہے۔ خاموشی، جو تخلیق کا محل وقوع ہے۔ خاموشی جو ہے! مگر دکھائی نہیں دیتی، سجھائی نہیں دیتی۔ لیکن خاموشی کی تلاش لاحاصل بھی نہیں رہتی۔ اسی تلاش سے راگنیاں جنم لیتی ہیں۔ راگنیوں سے کہانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کہانیوں میں نظمیں ڈھلنے لگتی ہیں۔ عکس بنتے ہیں۔ آئینے ٹوٹتے ہیں۔ آئینہ گر بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ ایک آئینہ ہزار آئینوں میں بدل جاتا ہے۔ ایک عکس کے ہزاروں زاویے عیاں ہو جاتے ہیں۔ ٹوٹ جانا بھی کتنی نعمت ہے۔۔۔ زندگی ٹوٹنے نہیں دیتی۔ ٹوٹ ٹوٹ کر جڑنے پر اکساتی ہے۔ بکھرے ہوئے ریزوں کو سمیٹ لینے کی ہوس میں مبتلا رکھتی ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کو یک جان کر لینے کی ترغیب دیتی رہتی ہے۔ زندگی سے کون جیت سکتا ہے! موت بھی نہیں۔ زندگی کو کون باندھ سکتا ہے! خوف بھی نہیں۔۔۔ لوگ کہتے ہیں، کیا یہ سب سچ ہے؟ سچ نہیں تو کیا جھوٹ ہے؟ مگر سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا؟ سچ ہے تو کیا ہے؟ سچ اور جھوٹ سب ایک خیال ہے۔ یہ بھی ایک خیال ہے۔۔۔ یہ میرا نام ہے! یہ تیرا نام ہے! کیا میرا نام ہی میں ہوں؟ کیا ترا نام ہی تو ہے؟ اسم ایک مظہر ہے۔ صرف ایک پہلو ہے۔ ذات کس نے دیکھی ہے۔ ذات کس نے لکھی ہے۔ کون دعویٰ کرتا ہے ذات کو سمجھنے کا!۔۔۔ مجھ کو کیا خبر ہوتی! خیال تھا؟ حقیقت تھی؟ کچھ تو تھا جو بیتا تھا! کچھ تو تھا جو گزرا تھا! گیلی گیلی مٹی پر بھاری بھاری قدموں سے! جانے کس مکان میں! نہ جانے کس زمان میں! اک تماشا لگ گیا تھا۔ کس نے جانے کیا دیکھا! کس نے جانے کیا سمجھا!۔۔۔ مور رقص کرتا ہے۔ ناچتا ہے جنگل بھی۔ مور نی نہیں کرتی۔ دل میں کیا سمجھتی ہے! کیا کسی نے سوچا ہے!۔۔۔ رقص کس کو کہتے ہیں؟ کون ہے جو طے کرتا ہے، رقص کس کو کہتے ہیں؟۔۔۔ مور نی کے اندر بھی رقص ہوتا ہو شاید! مور نی بھی نکلی ہو راگنی کی کھوج میں!''

اس تحریر کو نظم کہیں، آزاد شاعری یا کوئی اور نام دیں۔ نجیبہ عارف کی آپ بیتی کا خلاصہ اسی کو سمجھنے میں ہے۔ کتاب کا پہلا باب ''ڈگر پنگھٹ کی'' ہے۔ ملاحظہ کریں کیا دلچسپ اور فسوں گر اسلوب تحریر ہے۔

''بابوں سے ملنے کا مجھے بچپن سے شوق تھا۔ اس شوق کی شدت میں کہاں کہاں نہ خاک اڑائی، کس کس جگہ کی دھول نہ چاٹی۔ مفتی جی سے بھی اسی شوق میں ملنے گئی تھی۔ پھر جب ان سے تعلق گہرا ہوا تو برسوں انتظار کرتی رہی، کہ چوں کہ وہ بابے ہیں، یا کم از کم بابوں کے راز داں اور مزاج شناس ہیں، خود ہی سمجھ جائیں گے کہ بچے جمورے کی دلی مراد کیا ہے۔ اس میں یہ رمز بھی پنہاں تھی، کہ خود ہی سمجھ گئے تو یہ بات بھی پکی ہو جائے گی کہ مفتی جی بابے ہیں بھی یا نہیں۔ آخر بیسویں صدی کی پیداوار تھی، اتنی سی تشکیک تو مجھے روا تھی۔ لیکن جب وہ مسلسل بے نیاز بنے رہے اور اِدھر اُدھر کی سبھی باتیں ختم ہو گئیں تو ایک دن اس بے حاصل انتظار سے تھک کر، عادت اور مزاج کے خلاف، خود اپنے منہ سے کہہ اٹھی: 'جناب! آپ سے میل جول کی اصل غرض یہ تھی کہ اس حقیر پُرتقصیر کو کسی بابے کی تلاش ہے۔ براہِ کرم مجھے، زندہ یا مردہ، کسی بابے سے ملوایئے، اس کا پتہ دیجئے، اس سے میری سفارش کیجئے، اس سے کہیے مجھ پر نظرِ کرم کرے!' مفتی جی نے ایک جھرجھری لی اور مجھ پر برسنے لگے۔ حسبِ عادت کبھی پنجابی میں زور زور سے، بلکہ زور و شور سے انھوں نے ایک لمبی تقریر داغ دی: بابے؟ تو نے بابے کا کیا کرنا ہے؟ ان بابوں کے قریب نہیں جاتے۔ جھلیے، ان بابوں سے بچ کر رہتے ہیں، یہ بڑے ظالم ہوتے ہیں، یہ نظر ڈال دیں تو بیڑا غرق کر دیتے ہیں، ان سے دور رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ خبردار! آئندہ ایسی فرمائش نہ کرنا، تجھے کیا پتا، یہ بابے کیسی آگ ہوتے ہیں، ساڑ کے سواہ کر دیتی ہے۔۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ مفتی جی دیر تک گرجتے رہے۔ اور میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلتا رہا۔''

پھر ایک دن ہسپتال سے ان کا خط آیا۔ لکھا تھا:

''تو نے پہلا خط جو مجھے لکھا تھا وہ از خود نہیں لکھا تھا۔ وہ خط لکھنا تجھ پر عائد کر دیا گیا تھا۔ میں بیمار ہوں، جانے والا ہوں۔ 'وہ' مجھ سے پوچھیں گے، وہ ناؤ ڈوب جھلکے کھا رہی تھی، تو نے اسے بچایا کیوں نہیں؟ ڈوبنے کیوں دیا؟ ہو سکے تو مل جاؤ!۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ڈوب جھلکے کھاتی ہوئی ناؤ نے اِترا کر سوچا: کام بن گیا۔ کسی نامعلوم 'وہ' نے جاتے ہوئے ممتاز مفتی کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ اب یہ پتوار لے کر طوفانوں کے بالمقابل زور لگائے گا اور میری ناؤ کو دوسرے کنارے کی بہشت تک لے جائے گا جہاں ہر دیوار پر میرے سوالوں کے جواب لکھے ہوں گے، ہر موڑ پر ہدایت نامہ آویزاں ہوگا، ہر چوراہے پر راہنمائی کے فرشتے منتظر کھڑے ہوں گے۔ مجھے سب پتہ چل جائے گا، معرفت عطا ہو جائے گی، وجدان، ایمان، ایقان سب حاصل ہو جائے گا۔ میں سے مومن، مردود سے محبوب ہو جاؤں گی۔ پر کچھ بھی نہ ہوا۔ مجھے ذرا بھی پتا نہ چلتا کہ کس طرح وہ اینٹ پر

اینٹ رکھ کر میری شخصیت کے ملبے کو از سرِ نو تعمیر کرنے میں مصروف تھے۔ اکثر کہا کرتے: 'دیکھ! نقوش کا حسن پائیدار اثر نہیں رکھتا، جو چیز لوگوں کو باندھ لیتی ہے، غلام بنالیتی ہے، وہ ذہنی حسن ہے۔ نقوش کی محبت زیادہ سے زیادہ ایک دو سال چلتی ہے پھر ختم ہو جاتی ہے، پر سنیلٹی کی محبت ساری عمر رہتی ہے۔ تو بھی اپنے اندر Intellectual Attraction پیدا کر۔ اور یاد رکھ، خالی مطالعے سے حسن پیدا نہیں ہوتا۔ ڈنک تو لکھنے سے آتا ہے۔ تو مجھ سے ڈنک مارنا سیکھ لے۔''

واقعات اور طرزِ بیان اتنا دلچسپ ہے کہ قاری اس میں کھو جاتا ہے اور اسے آگے کیا ہوا کی بے چینی کتاب کا مطالعہ جاری رکھنے پر مجبور کیے رکھتی ہے۔ ذرا یہ اقتباس دیکھیں۔

''شاہین نے کئی بار عبداللہ درانی کا ذکر کیا انھیں زیادہ تر لوگ درانی صاحب کہتے تھے۔ جو قریب آ جاتے وہ بابا جان کہنے لگتے۔ پھر مجھے 'حیاتِ قادر' مل گئی۔ حیاتِ قادر درانی صاحب کی پہلی اردو کتاب ہے۔ ان کے سلسلے کے لوگ کہتے ہیں یہ تصوف کے سفر کی پہلی سیڑھی ہے۔ درانی صاحب نے اس کتاب میں اپنے مرشد بابا قادر اولیاؒ کی سوانح بیان کی ہے۔ چھوٹی سی کتاب ہے۔ پہلی اور بے دھیان پڑھت میں تو بالکل عام سی لگتی ہے۔ اس کے آخر میں صاحب کتاب نے ایک دعا لکھی ہے جس کا آخری حصہ یہ ہے کہ جو اس کتاب کو خلوصِ دل سے پڑھے گا اسے مرشد ضرور نصیب ہوگا۔ اس رات اور اس سے اگلی راتیں، نہ جانے کتنی راتیں، تاروں بھرے آسمان کے نیچے، جب میری آنکھ لگتی تو میں خواب میں صاحبِ کتاب کو دیکھتی، پھر آنکھ کھل جاتی، میں جاگتے ہوئے خواب دہراتی کہ صبح تک بھول نہ جائے، پھر سو جاتی اور خواب پھر شروع ہو جاتا۔ صبح آنکھ کھلتی تو یاد نہ آتا کہ کیا بات جاگتے میں سوچی تھی اور کیا خواب میں۔ اب ان میں سے کوئی خواب یاد نہیں۔ میں نے اس بات کو ذرا بھی اہمیت نہ دی کہ صاحبِ کتاب مجھے خواب میں کیوں نظر آ رہے ہیں؟ بس کتاب پڑھی اور رکھ دی۔ آگے چل پڑی اور دنیا کے دھندوں میں کھو گئی!''

حیاتِ قادر کے دو اقتباسات پیش ہیں۔

''ایسی ہستیوں کی حیاتِ باطن کا حال لکھنے کی طاقت کسے نصیب ہو سکتی ہے؟ صرف اس فانی جسم کے تریسٹھ سال کے حالات کو پڑھنے کے بعد چشمِ بینا کو یہ صاف طور پر نظر آنے لگتا ہے کہ فنا ہونے والی چیز تو فنا ہوتی ہی رہتی ہے مگر جوہرِ اعلیٰ کو بقائے دوام ہے۔ یہ علم و عقل کی رسائی سے باہر کی بات ہے۔ اسے صاحبِ حال ہی کچھ سمجھ سکتا ہے۔''

''کسی چیز کی ماہیت سمجھنے کے لیے یک رنگی اور ہم آہنگی میسر نہ آ سکے تو اتنا تو کم از کم ضروری ہے کہ اس چیز سے حسن ظن رکھا جائے۔ آگ کو آگ ہی سمجھ سکتی ہے اور پانی کو پانی۔ جب تک فہم اور قلب اس عالم یا مقام پر نہ پہنچے، جس عالم میں مقصودِ اصلی وجود ہے، اس وقت تک صحیح طریقہ سے بات نہیں بنتی۔ طالب کے مزاج میں اگر سادگی ہو اس سے پچھلے تصورات دخل اندازی نہ کریں، اور وہ خلوص و محبت سے کسی ہستی کی طرف بڑھے تو ہستی خود، محبت کے جوش میں، اس سے بغلگیر ہو جاتی ہے اور اس میں سما جاتی ہے۔ پہنچے ہوئے تک پہنچنا بھی ایک عبادت ہے۔''

اتفاقیہ طور پر نجیبہ عارف کو قاضی احمد سعید صاحب کی ہومیوپیتھی سے متعلق کتاب 'ہوالشافی' ملی۔ اس نے انتساب پر نظر پڑی۔ ''اپنے ہومیوپیتھی کے استاد اور راہِ سلوک میں مرشد، مسیح الملک، برکت العصر، شمس العارفین، حضرت محمد عبیداللہ درانی کے نام جن سے بڑا محبّ اور محبوب نہیں ملا'' جسے پڑھ کر نجیبہ کو یاد آیا کہ پشاور کے روحانی سلسلے کے ایک بزرگوار تیس پینتیس سال سے مفت ہومیو دواخانہ چلا رہے ہیں نجیبہ کو علم ہوا کہ یہ وہی قاضی احمد سعید صاحب ہیں اور انہوں نے انھی کے ساتھ ہومیوپیتھی کی مشق کا فیصلہ کر لیا۔ قاضی صاحب کے کلینک کی دنیا ہی کچھ اور تھی۔ جس کا ذکر ''وہ جو بیچتے تھے دوائے دل'' کے عنوان سے نجیبہ عارف نے کیا ہے۔

''قاضی احمد سعید کے کلینک کا عجیب ماحول تھا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں قاضی صاحب کی نشست تھی جس کے عین اوپر دیوار پر ان کے مرشد، یعنی درانی صاحب کی تصویر لگی تھی۔ نیچے کرسی پر بیٹھے ہوئے قاضی صاحب کو دیکھتی تو دونوں میں کوئی فرق نظر نہ آتا۔ ظاہری حالت میں اس قدر مشابہت تھی کہ حیرت ہوتی تھی۔ قاضی صاحب بہت پڑھے لکھے انسان تھے۔ ادب، موسیقی اور مصوری سے شغف ہی نہیں، گہرا لگاؤ تھا۔ زبان اور اس کی نزاکتوں سے خوب واقف تھے۔ غلط تلفظ پر بہت بدمزہ ہوتے اور اکثر ٹوک دیتے۔ انھیں اور ان کی بیگم کو گلابوں اور پھول پودوں سے عشق تھا۔ قاضی صاحب نے عملی زندگی کا آغاز آل انڈیا ریڈیو سے کیا۔ ملازمت کا پورا دور کامیابیوں اور کامرانیوں کی شاندار داستان ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان کی زبان دانی کی مہارت کی بنا پر انھیں دو سال کے لیے افغانستان میں پریس اتاشی مقرر کیا گیا۔ شاندار خدمات کے اعتراف میں تمغہ قائداعظم سے نوازا گیا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے افسر تعلقات عامہ رہے۔ تین مختلف صدور کے ساتھ اسی عہدے پر فائز رہے۔ فرانس کے صدر ڈیگال نے ان کے تحریر کردہ ایک مضمون سے متاثر ہو کر انھیں خصوصی اعزازی سند سے نوازا۔ انھیں اعلیٰ خدمات پر تمغہ پاکستان بھی عطا کیا گیا۔ ڈائریکٹر جنرل پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے عہدے پر فائز اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔''

قاضی صاحب کو درانی صاحب نے اپنے کلینک پر بیٹھنے کی اجازت دی، درانی صاحب مریض کا حال سن کر نسخہ لکھتے اور قاضی صاحب اپنے طور پر دوا تجویز کر کے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتے۔ کلینک کا وقت ختم ہونے کے بعد استاد اور شاگرد اپنے نوٹس ملاتے۔ یہاں تک کے دونوں کے نسخوں میں کوئی دو ئی باقی نہ رہی۔ یوں دو سال کی تعلیم و تربیت کے بعد اذن اور امر دونوں یکجا ہو گئے۔ لندن گئے تو برٹش اسکول آف ہومیوپیتھی کی لائبریری میں فارغ وقت گزارا اور واپس آنے کے بعد چھ سال تک درانی صاحب کی قیام گاہ پر چلنے والے مطب میں خدمات انجام دیں۔ راولپنڈی منتقل ہوئے تو انکی اجازت سے ہفتہ وار تعطیل کے

دن یہاں بھی مفت کلینک قائم کرلیا۔ انھیں مرشد کی جانب سے دست شفا بھی حاصل تھا مگر مسلسل مطالعہ اور محنت ان کا شعار رہی۔ ہومیوپیتھی پر بے شمار مضامین اور دو کتابیں ''ہوالشافی'' اور ''معالجات'' لکھیں۔ مریضوں میں نامور سیاست دان، اعلیٰ حکومتی عہدے دار، فوی افسر ہر طرح کے لوگ دوا لینے آتے، کئی ایم بی بی ایس ڈاکٹر بھی دوا لینے آتے تھے مگر ہر ایک کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

قاضی صاحب کے کلینک کا منظر دیکھ کر نجیبہ عارف کو رشک بھی آتا اور افسوس بھی ہوتا کہ وہ درانی صاحب سے ملنے سے محروم رہی تھیں۔ کیا شخصیت رہی ہوگی، جس کے اثر سے ہونے والی چکا چوند اب تک اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔

''قادر نگر جاتے ہوئے نجیبہ نے قاضی صاحب سے استفسار کیا۔ ''ذکر کیسے راسخ ہوتا ہے؟ 'خود کو کسی نقطے پر مرکوز کر لینے سے۔' اب یہ پھر ایک مشکل مقام تھا۔ خود کو کسی ایک نقطے پر مرکوز کر لینا کون سا آسان کام ہے۔ پہلے تو نقطے کا تعین ہی ایک مسئلہ ہے۔ تعین ہو بھی جائے تو یکسوئی قائم کرنا اور قائم رکھنا، دونوں صبر آزما مرحلے ہیں۔ میں نے کہا۔ 'قاضی صاحب، یہ تو بڑی مشکل بات ہے۔' بولے۔ 'مرشد کی توجہ اور کرم ہو تو یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ میں نے براہ راست پوچھ لیا۔ 'یہ بتایئے آپ ذکر کرتے ہیں تو کون سی تکنیک استعمال کرتے ہیں کہ توجہ قائم رہے۔' وہ ذرا ہچکا کر کہنے لگے۔ 'میں محسوس کرتا ہوں کہ خانۂ کعبہ سے نور کی ایک لہر نکل کر مرشد کے سینے سے ہوتی ہوئی میرے سینے تک آ رہی ہے۔' میں نے کہا۔ 'لیکن یہ تو مفروضہ ہے۔' کہنے لگے۔ 'ہاں، شروع شروع میں مفروضہ ہی ہوتا ہے۔ آپ بھی ابتدا میں مفروضہ قائم کر لیں، آہستہ آہستہ یہ حقیقت میں بدل جائے گا۔'

میرے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔ مفروضہ حقیقت بن جائے گا! تو کیا سارا کھیل ہمارے اپنے ذہن کا ہے؟ تمام امکانات خود ہمارے اندر پنہاں ہیں؟ مرشد صرف ہمارے امکانات کو روشن کرتا ہے۔ تو کیا اصل حقیقت ہم خود ہیں؟ ایک پل کے لیے بجلی کا جھماکا سا ہوا۔ ایک پل کیلیے جیسے ذات سے کائنات تک کا تمام راستہ روشن ہوا اور پھر اگلے پل بجلی کا وہ کوندا سا لہرا کر غائب ہو گیا۔ مجھ پر ایک عجیب سی سنسنی طاری ہو گئی تھی۔''

''راگنی کی کھوج میں'' میں راہ تصوف میں درپیش ایسے بہت سے سوالات اور ان کے جواب موجود ہیں۔ جن سے گتھیاں سلجھتی بھی ہیں اور مزید الجھ بھی جاتی ہیں، لیکن مصنفہ کا اسلوب بیان اتنا دلکش اور واقعات ایسے دلچسپ ہیں کہ قاری کتاب ایک ہی نشست میں ختم کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ درانی صاحب کے مریدین میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے سابق چیف جسٹس جواد ایس خواجہ اور جسٹس کے ایم صمدانی مرحوم کے علاوہ بہت سے تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد شامل تھے۔ جن کا احوال دلچسپی سے بھرپور ہے۔ جسٹس صمدانی نے اپنی مختصر آپ بیتی ''جائزہ'' میں بھی درانی صاحب کا ذکر کیا ہے۔

بابا تاج الدین اور عبیداللہ درانی کے مرشد بابا قادر اولیا کی شخصیت و کردار کی تفصیلات، بابا قادر کے پاس درانی صاحب کس حالت میں پیش ہوئے کہ مختلف قسم کی ٹی بی، ریڑھ کی ہڈی کے کئی مہرے ختم ہونے سے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ لیکن پھر انھوں نے ایک بہت بھرپور زندگی بسر کی۔ درانی صاحب نے ان کی سوانح ''حیاتِ قادر'' تصنیف کی۔ جس کے اقتباسات بھی دلچسپی سے بھرپور ہیں۔ قاضی صاحب کے کلینک پر آنے والی روبینہ قزلباش نے درانی صاحب سے پہلی ملاقات اور تصوف کے بہت اہم پہلوؤں سے نجیبہ کو آگاہ کیا۔ اس باب ''یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں'' میں پاکستان کے لیے اعلیٰ ترین خدمات انجام دینے والوں کا احوال اور ملک میں ان سے ہونے والے عبرت ناک سلوک کی تفصیلات بھی ہیں۔ روبینہ قزلباش نے بتایا۔ ''یہ صوفی لوگ اپنی خواہش سے مرجاتے ہیں۔ اپنی ایگو، اپنے جذبات، اپنی خواہشات سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔ ان کی کوئی ذاتی خواہش یا ضرورت باقی نہیں رہتی۔ فنافی اللہ ہو جاتے ہیں۔ عبیداللہ درانی جو بابا جان کہلاتے تھے ان بزرگوں میں سے ہیں جن سے دنیا کے نقشے بدلنے کا کام لیا جاتا ہے اور جو دنیا پر آنے والی مصیبتوں کو ٹال سکتے ہیں۔ ان کو روحانی کام پر تعینات کیا گیا تھا۔ یہ بات آہستہ آہستہ اور اب جا کر سمجھ پائی ہوں۔ ان کے ذمے جو سب سے ضروری کام تھا وہ اسلام میں وحدت پیدا کرنے کا تھا۔ تمام فرقے، تمام سلسلے، تمام امتیازات کو ختم کرنا۔ اسی لیے بابا جان نے کتابیں بھی لکھیں کہ لوگ پڑھیں، سمجھیں اور عمل کریں۔ وہ بہت بڑے بزرگ تھے، بہت بڑے، کاش میں اس وقت اس بات کو سمجھ سکتی کہ میں کتنے بڑے بزرگ سے مل رہی ہوں۔''

اس حلقے کے ایک ایک فرد کا ذکر اپنی جگہ دلچسپ اور قابل مطالعہ ہی نہیں معلومات سے بھرپور بھی ہے۔ باب ''پدرم سلطان بود'' ڈاکٹر نجیبہ عارف کے والد ظفر صاحب کے احوال زیست سے بھرپور اور انتہائی دلچسپ ہے۔ وہ بھی ایک بزرگ باؤ شریف کے پیروکار تھے۔ جن کا ذکر میں بھی کئی ان کہیاں بیان ہوئی ہیں۔ باب ''یہ تو ہم کا کارخانہ ہے'' میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تعلیمی کارگزاریوں اور اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے کی تفصیلات ہیں۔ ''سُر منڈل'' جسٹس صمدانی اور جسٹس جواد اور ان کی اہلیہ بینا سے ملاقات اور ان کے حوالے سے درانی صاحب اور پاکستان کی تاریخ کے بعض اہم واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ''پسِ حجاب'' میں جسٹس صمدانی اور ان کی کتاب ''جائزہ'' میں موجود بعض حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ آخری دو ابواب ''روشنی اے روشنی'' میں عبیداللہ درانی کی سوانح اور زندگی بھر کی کاوشوں کا مختصر لیکن دل پذیر ذکر ہے۔

جبکہ ''کہاں چلے سادھورے'' درانی صاحب کے انگریزی مضمون کے ترجمے پر مبنی ہے۔

مجموعی طور پر ''راگنی کے کھوج میں'' ایک انتہائی دلچسپ، پراثر اور معلومات سے بھرپور آپ بیتی ہے۔ جس کا مطالعہ قاری کی زندگی اور سوچ کا رخ بدل سکتا ہے۔ اہلِ دل اس کے اثر سے بیگانہ نہیں رہ سکتے۔ تصوف کی باریکیاں جاننے والوں کے لیے یہ کتاب کسی تحفے سے کم نہیں۔ جسے اہلِ تصوف کی دنیا میں پہلا قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔

سونے کی گڑیا چاندی کے بال

محمد حمید شاہد
(اسلام آباد)

اسلام آباد لٹریچر فیسٹول ۲۰۲۰ کے ورچوئل سیشن کے آن لائن ہونے میں بس دو چار منٹ باقی ہوں گے کہ مانیٹر پر ڈاکٹر نجیبہ عارف کا چہرہ نمودار ہوا۔ حارث خلیق اور میرے ساتھ وہ اس سیشن میں شریک تھیں۔ ان کے عقب میں ایک سلیقے سے رکھی کتابیں شلیفوں سے جھانک رہی تھیں اور روشنی کچھ یوں ان پر پڑ رہی تھی کہ چہرہ سنہرا اور بال چاندی کی طرح چمکنے لگے تھے۔ مجھے وہ ادھ ادھوری سطر یاد آ گئی جو میں کسی افسانے کا عنوان بنانا چاہتا تھا۔ کچھ دن پہلے، جب ہم نجیبہ کے ہاں عشائیے پر مدعو تھے، پہلی بار تب انہیں دیکھتے ہی تب بھی یہ جملہ دھیان میں آیا تھا۔ نہیں شاید تب نہیں بلکہ اُس تقریب کی ایک تصویر دیکھ کر جس میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کے بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے اور مجھے لگا تھا ان کا چہرہ سونے جیسا ہو گیا تھا۔۔۔ اور سونا بھی عام نہیں؛ خاص اور خالص کہہ لیجئے؛ سونا بارا رابانی یا سونا نیارا گری۔ آئی ایل ایف کے سیشن سے پہلے ڈسپلے پر وہ نمودار ہوئیں تو اس بار یہ جملہ ہونٹوں نے بھی ان کی جانب لڑھکا دیا کہ اگر مجھے کچھ آپ پر لکھنا ہوا تو اس کا عنوان ہوگا: 'سونے کی گڑیا چاندی کے بال''۔

یہ عنوان مجھے اس لیے نہیں سوجھا تھا کہ میں نے نجیبہ کے سر کی چاندی دیکھ لی تھی اور بس۔ پھر ایسا کیوں سوجھا؟ اس کی طرف ذرا بعد میں آتا ہوں پہلے بتاتا چلوں کہ محمد عارف جمیل اور ڈاکٹر نجیبہ عارف ہنسوں کا جوڑا ہیں۔ محبت کرنے والے اور محبتیں بٹورنے والے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف شاعرہ ہیں، افسانے لکھتی ہیں، تنقید اور تحقیق بھی ان کا حوالہ ہے، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ لکھنا پڑھنا محض ان کا پیشہ یا مشغلہ نہیں سانس لینے جیسا مسئلہ رہا ہے۔ ہمارے ملنے ملانے کو تین دہائیاں ہو چلی ہیں۔ وہ ایک تہذیبی دائرے میں رہتی ہیں۔ یہ دائرہ حصار نہیں ایک ہالہ جو اُن کے طرزِ عمل سے روشن رہتا ہے، انہیں کہیں رُک جانے اور اکتا کر بیٹھ رہنے پر مجبور نہیں کرتا۔ شائستگی، وقار اور بردباری ان کی شخصیت کا حصہ ہیں۔ ادبی مجالس میں ہم مدت سے ایک ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں۔ نجیبہ کے ہم سفر محمد عارف جمیل، بیگم کے ساتھ آتے اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھ کر بس سنتے رہتے۔ کچھ پوچھا جاتا تو ہنس دیتے مگر ایک روز اچانک انہوں نے ہم سب کو حیرت میں ڈالا کہ نجیبہ کے دیکھا دیکھی انہوں نے بھی قلم تھام لیا تھا اور اب صاحب کتاب بھی ہو گئے تھے۔ جس عشائیے کا میں نے ذکر کیا اسی میں عارف نے اپنی کتاب ''حاضری'' عطا کی تھی جس کا سرورق ان کی بیٹی مومنہ نے بنایا تھا۔ بیٹی مومنہ ہو یا بیٹا محمد دونوں تہذیبی اور ثقافتی سطح پر کچھ الگ سا کرنے کی امنگ رکھتے ہیں۔ یہ میں نے محسوس کیا ہے۔ آنے والا وقت ان کی جھولی میں کیا ڈالنے والا ہے یہ خدا ہی جانتا ہے۔

بات نجیبہ کی ہو رہی تھی، ان کے میاں اور بچوں کی طرف مڑ گئی تو یہیں کہتا چلوں کہ نجیبہ کو میں نے اپنی ماں کے قدموں میں جس طرح بیٹھتے دیکھا اور ان پر اپنی محبتیں نچھاور کرتے دیکھا ہے اس کا انہیں صلہ ملنا ہی تھا اور ملا بھی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لکھنے پڑھنے اور ملازمت سے وابستہ خواتین کا گھر اور رشتے ترجیحات میں کہیں نیچے چلے جاتے ہیں، نجیبہ کے ہاں ایسا نہیں ہوا۔ جب جب ان کے ہاں گئے ہیں ان کا سلیقہ، گھرداری اور اپنوں کی محبت سب بولتے ہوئے نظر آئے ہیں۔

نجیبہ سے جب پوچھا جاتا ہے کہ آپ کی پہلی ترجیح کیا ہے؟ تو اُن کا ترنت جواب ہوتا ہے: ''شاعری''۔ میں اُن کی ایک گفتگو کہیں پڑھ رہا تھا جس میں انہوں نے اپنے بارے میں کچھ باتیں کر رکھی ہیں۔ اسی گفتگو میں ایک مقام پر وہ کہتی ہیں کہ انہوں نے پہلا افسانہ تب لکھا تھا جب وہ آٹھویں جماعت کی طالبہ تھیں اور یہ کہ اس پر اُنہیں 200 روپے انعام بھی ملا تھا۔ یوں دیکھیں تو پہلی محبت افسانہ ہوئی۔ خیر شاعری ہو یا افسانہ، وہ دونوں سے نباہ کر رہی ہیں۔ لگتا ہے تعلیم کے شعبے سے رزق وابستہ ہوا تو تنقید، تحقیق، ادارت اور تراجم کی تشویق ہوئی یوں ان کی شخصیت مختلف جہتوں سے روشن تر ہوتی چلی گئی۔

معانی سے زیادہ ان کی شاعری کا مجموعہ ''معانی سے زیادہ'' کے نام سے ۲۰۱۶ء میں آیا تھا۔ اور ہاں، وہ لفظ اور زندگی کے ان معانی تک رُک نہیں جاتیں جو سامنے کے ہوتے ہیں؛ نظر میں آنے والے، فوراً جی لبھانے والے یا لغت سے چیختے چنگھاڑتے برآمد ہونے والے۔ وہ جو ممتاز مفتی کے لفظوں میں ''حلوائی کی دکان پر دھرے تھالوں میں پڑی مٹھائی'' جیسے ہوتے ہیں۔ باہر سے لشکتا چمکتا، مٹھاس اور لذت انڈیلتا وجود نجیبہ کا مسئلہ ہے ہی نہیں۔ وہ اس وجود کی سخت کھال کو کھرچ کر اس کے باطن میں اترتی ہیں۔ اندر کے پانیوں میں غوطہ زن ہوتی ہیں۔ صوفیانے وجود کے اس حصے کو دِل کہا ہے۔ وہ دِل نہیں جو شور تو بہت کرتا ہے مگر کاٹنے پر اس میں سے ایک قطرہ خون ٹپکتا ہے بلکہ وہ دل جو پورے وجود کو زندگی اور اس کا لطف ترسیل کرتا ہے اور سمندر سے بھی گہرا ہوتا ہے۔ اسی دل کے بارے میں حضرت سلطان باہو نے کہا تھا: ''دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے ہُو'' انسانی وجود اور انسان کا مستقبل دونوں ان کا بنیادی مسئلہ ہیں تاہم لطف یہ ہے کہ مسلمان ہونا بھی ان کے ہاں شعوری سطح پر ایک سرگرمی بن جاتی ہے جو اُن انسانی قدروں کو مستحکم کرتی ہے جو آدمی کو انسان بناتے ہیں۔

ممتاز مفتی کا ذکر آیا ہے تو مجھے یاد آتا ہے کہ کوئی تین دہائیاں پہلے جب ہم پہلے پہل ملے تھے تو میں نے انہیں ان خواتین حضرات میں سے ایک کے طور پر شناخت کیا تھا جو ممتاز مفتی، اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب کے تصوف کا دم بھرتے تھے۔ شاید ایسا قیاس کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان ''ممتاز مفتی کا فکری ارتقا'' تھا۔ ممتاز مفتی کی زندگی ہی میں ہماری ملاقاتوں کا آغاز ہوا تھا اور تب مجھے یوں لگتا تھا کہ مفتی جی کا ذکر نجیبہ کی گفتگوؤں

سے اُبل اُبل پڑتا تھا تاہم بعد میں اندازہ ہوا کہ اسلام، پاکستان اور تصوف ان کے وجود کا مسئلہ بھی ہیں۔ بالکل ذاتی مسئلہ۔ تصوف کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ اس پر بہانے بہانے سے لکھتی رہتی ہیں اور کہیں کہیں تو وہ ایسے ذاتی تجربات بھی بیان کرتی ہیں جو ان کے من میں اس جانب اور آگے تک جانے کی تاہنگ بھرتے رہتے ہیں۔ اس باب کی مثالیں مبین مرزا کے رسالے ''مکالمہ'' کراچی میں کئی قسطوں میں چھپنے والے مضامین میں مل سکتی ہیں جن پر ''راگنی کی کھوج میں'' کا مستقل عنوان جمایا گیا تھا۔ اپنی ایک بہت اہم کتاب کا مقدمہ لکھتے ہوئے نجیبہ عارف نے خلیل جبران کے اس کہے سے آغاز کیا ہے کہ ''میں کبھی لاجواب نہیں ہوا مگر اس شخص کے سامنے جس نے مجھ سے پوچھا، تو کون ہے؟'' اور نجیبہ کا کہنا ہے کہ ان کا مسئلہ بھی یہی ہے۔ ''میں کون ہوں: ایک عورت؟، ایک پاکستانی؟، ایک مسلمان؟، ایک انسان؟''

یہ ترتیب ان کے ہاں اپنی ترجیحات میں اُلٹ جاتی ہے۔ انسانی وجود اور انسان کا مستقبل دونوں ان کا بنیادی مسئلہ ہیں تاہم لطف یہ ہے کہ مسلمان ہونا بھی ان کے ہاں شعوری سطح پر ایک سرگرمی بن جاتی ہے جو اُن انسانی قدروں کو مستحکم کرتی ہے جو آدمی کو انسان بناتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو مذہب کو انسان کی ذہنی ترقی اور آزادی کے راستے میں آڑ یا رکاوٹ سمجھتے ہیں اور نہ اس کی قائل نظر آتی ہیں کہ محض اور صرف مغرب کی فکری اور ذہنی پیروی ہی سے انسانی مستقبل کی تابناکی وابستہ ہے۔ پاکستان، ممتاز مفتی کے لفظوں میں ان کے ہاں بھی 'خدا کی خاص عطا' ہے۔ عورت کے باب میں سوچتے ہوئے وہ فیمنسٹوں سے الگ کھڑی نظر آتی ہیں۔ اوہ، یہاں میں نجیبہ عارف کی اس کتاب کا حوالہ دینا تو بھول ہی گیا جس کی طرف مسلسل اشارے کیے جا رہا ہوں۔ یہ بہت اہم کتاب ہے اور اسے ''ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد نے ۲۰۱۵ء میں شائع کیا تھا۔ کتاب کا نام ہے: ''اسلام، پاکستان اور مغرب: علمی اور ادبی تناظر''۔

کتاب میلہ نجیبہ کی ایک اور کتاب ہے: ''رفتہ و آیندہ'' جس میں اردو ادب کا منظر نامہ بیان ہوتا ہے اور ہم اس مقام سے بھی آگاہ ہوتے ہیں جہاں سے ہمیں وہ یہ منظر نامہ دکھا رہی ہیں۔ اس کتاب کے پہلے حصے کے مضامین دیکھئے ''دور جدید کی تہذیبی ساخت اور اسلام: فکر اقبال کی روشنی میں''، ''اردو نثر کے متصوفانہ رجحانات کا ارتقا'' اور ''اردو ادب میں تانیثیت کی تحریک''۔ جب کہ دوسرے دو حصوں میں وہ شاعری اور نثر پر انفرادی سطح پر اثرات مرتب کرنے والوں کے فن کا تجزیہ کرتی ہیں۔ گویا فکر اور فن دونوں ان کے علاقے ہیں۔ نجیبہ کی تنقید اور علمی و فکری مضامین کا ذکر ہو رہا ہے تو یہیں کہتا چلوں کہ ان کے ہاں بات کرنے کا انداز اور زبان دونوں روایتی مضامین لکھنے والوں سے ہٹ کر ہیں۔ وہ زندہ نثر لکھتی ہیں، رواں دواں اور پڑھنے والے سے مکالمہ کرنے والی۔ یہی انداز ان کی تقریر کا ہے۔ ہمیں کئی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں ایک ساتھ جانے کا موقع ملا۔ چوں کہ عمر میں ان سے کچھ سال بڑا ہوں اس لیے اکثر وہ پہلے گفتگو کرتی ہیں اور یوں کرتی ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔ اپنی باری آنے پر، اپنی کم مائیگی کا وہ احساس جو ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے، ایسے میں ہر بار بڑھ جاتا رہا ہے۔

وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو مذہب کو انسان کی ذہنی ترقی اور آزادی کے راستے میں آڑ یا رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

عورت کے باب میں سوچتے ہوئے وہ فیمنسٹوں سے الگ کھڑی نظر آتی ہیں۔

لیجئے صاحب! اب تو آپ جان گئے ہو گے کہ نجیبہ عارف ان خواتین میں سے ہیں جو اپنے علم و فضل، اپنے کردار اور اپنے شاندار کام کی وجہ سے کسی بھی سماج کا سب سے قیمتی اثاثہ ہو جاتی ہیں؛ کہہ لیجئے سونے جیسا۔ سونے جیسا نہیں بلکہ خالص سونا۔ میں سونے سے لدی عورتوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوا کہ بھاڑ میں پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان کہ مجھ سے ہمیشہ اپنی صلاحیتوں سے سونے کی گڑیا جیسی قیمتی ہو جاتی عورتوں نے احترام پایا ہے۔ نجیبہ عارف بھی سونے کی گڑیا ہیں۔ جب ہم ان کے ہاں عشائیے پر گئے تو کرونا وائرس کی وبا کے سبب ہماری ملاقاتوں میں کئی مہینوں کے وقفے پڑھ چکے تھے۔ انہی مہینوں میں کسی ایک روشن صبح انہیں خیال آیا ہوگا کہ سونا وہی اچھا جو خالص ہو اور پھر یہ خیال اُن کی جان کا روگ ہو گیا ہوگا۔ یہیں ان کی ایک غزل کا شعر ذہن میں گونجنے لگا ہے۔ میں نہیں جانتا اس کا یہ محل ہے یا نہیں مگر یاد آ گیا ہے تو مقتبس کیے بغیر اپنی بات مکمل نہ کر پاؤں گا:

بھڑک کے جلنا نہیں گوارا تو میرے پروردگار مولا
نہ ایسی آتش نفس میں بھرتے کہ جس سے جاں پر بنی ہوئی ہے

وجود سے جڑا وہ سوال جس کے سبب ان کی جان پر بنی ہوئی تھی، شاید اس کا جواب انہیں مل گیا تھا۔ ہاں تو جب میں نے انہیں اپنے سفید بالوں کے ساتھ دیکھا تھا جو ان کی پروقار شخصیت کو کئی گنا بڑھا رہے تھے تو پوچھا تھا ''یہ کب ہوا؟'' کہنے لگیں جب مجھے احساس ہوا کہ ''حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے''۔

اسی عشائیے میں عکسی مفتی بھی تھے جن کی معروف انگریزی کتاب "اللہ: میسّرنگ آف انٹیج ایبل'' کو نجیبہ عارف نے ''اللہ: ماورا کا تعین'' کے نام سے اردو روپ دیا تھا اور اکادمی ادبیات پاکستان کے چئیر مین ڈاکٹر یوسف خشک اور ان کی بیگم بھی۔ لہٰذا ہمارے بیچ کئی کتابوں کا تبادلہ ہوا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کی تازہ اشاعت کا نسخہ میں نجیبہ کو دے رہا تھا تو میری بیگم نے تصویر بنا لی جو بعد ازاں میں نے فاروقی صاحب کو بھیج دی۔ اُن کا فوراً فون آ گیا، پوچھا ''یہ سفید بالوں والی خاتون کون ہیں؟''۔ میں نے نجیبہ کا نام لیا۔ تو کہنے لگے ''ارے انہیں میں جانتا ہوں مگر انہوں نے بال اتنا جلدی سفید کیسے کر لیے'' پھر ان کے فن کی تعریف کرتے رہے۔ اور جب وہ ایسا کر رہے تھے تو مجھے نجیبہ کے نصیبے پر رشک آ رہا تھا۔ خدا کا شکر کہ ان کے بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے تھے۔ نجیبہ کا ہی ایک شعر ہے:

ایک اور حقیقت ہے پس و پیش حقیقت
ایک اور کہانی ہے کہانی سے زیادہ

من سے من کا ملن

سلیم سہیل
(کراچی)

''راگنی کی کھوج میں'' اس وقت چھپ کر بازار میں آئی ہے جو روح پر شر کی فتح کا وقت ہے۔مادی ترقی نے روحانی اطمینان پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔بازار نے تنہائی کو شکست دے دی ہے۔سارے فیصلے طاقت کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔اپنا اپنا سچ، اپنا اپنا جھوٹ۔اس آپا دھاپی میں وہ لوگ جائیں تو جائیں کہاں جو اپنی زندگیوں کو طاقتور کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہتے۔وہ اپنے خوابوں پر کسی طرح کا اجارہ قبول نہیں کر سکتے۔ایسے لوگوں کے لیے نجیبہ عارف جیسے لوگ غنیمت ہوتے ہیں جو ان کے اندر راگنی کی کھوج بیدار رکھتے ہیں اور وہ اس شوق کے آسرے پر جینے کا سامان کرتے رہتے ہیں۔بے شک شوق ہی ایسا آسرا ہے جو اندھیر دنوں میں باطنی لو کو فروزاں رکھتا ہے۔یہ تلاش کسی اور نہیں بلکہ اپنی تلاش ہے جس نے متلاشی کو مسلسل جستجو کی سان پر رکھا۔

یہ سفر کہاں سے شروع ہوا اور اس راستے میں کتنے پڑاؤ آئے، اس کا بیان'' راگنی کی کھوج میں'' کو ایسی دل کشی عطا کرتا ہے جو کبھی کبھی نصیب ہوتی ہے۔یہ کھوج ممتاز مفتی سے شروع ہوا۔لا حاصلی کا کچھ وظیفہ ان کی معیت میں مکمل ہوا۔وہاں سے ان کے ہومیوپیتھی سے دلچسپی کے سبب احمد سعید قاضی سے ملاقات۔قاضی صاحب سے مرشد کامل محمد عبیداللہ درانی کی درگاہ سے شناسائی اور پھر وہاں سے سارے جز و مل کر بابا تاج الدین اولیاء ناگپوری سے مس ہو گئے۔

یہ تمسک تقدیر تھا یا تدبیر اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔کیونکہ موجود سے متعلق تو کچھ نہ کچھ کہا جا سکتا ہے ناموجود سے متعلق رائے نہیں دی جا سکتی۔ایک وسیلہ بچتا ہے انکار۔ہم نظر نہ آنے والی چیزوں کو رد کرتے ہیں اور آگے گزر جاتے ہیں۔نجیبہ نے اس سفر کو بڑی کیفیتوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس سفر میں خوش نصیبی سے ایسے کردار میسر آتے گئے جنھوں نے اسے تھکنے نہیں دیا۔روح کے سفر پر روانگی سے قبل اسے جو گھر کا ماحول میسر آیا اس میں بھی مرکز مائل قوتیں غالب تھیں۔سارے راستے ازلی ابدی سچ کی جانب کھلتے تھے۔ان میں نور محمد صل اللہ علیہ وسلم کی روشنی تھی۔گریز کم تھا۔غیر کم تھا۔خدا، انسان ،کائنات میں موجود اسرار جیسے لفظ اس نے اپنے گھر سے سن رکھے تھے۔نجیبہ کے والدین روایتی ماں باپ نہیں تھے بلکہ من مانی ترنگ میں زیست کرنے والے تیاگی تھے۔خوش نصیبی سے عارف جیسا زندگی کا ساتھی ملا۔جو قبول کرنے والی روح ہے۔امر کے آگے چپ۔ایسے لوگ بشر کا شملہ گرنے نہیں دیتے۔چپ چپ رہتے ہیں اور دارِ فانی میں امتحان پر امتحان دیتے چلے جاتے ہیں۔تو نجیبہ نے اس سارے منظر میں اپنی زندگی گزاری۔خود کو ماننے والوں کی فہرست میں شامل رکھا۔

محمد عبیداللہ درانی سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔کبھی نہیں ہوئی۔مگر اندر کی بوٹی نے ایسا مشک مچایا کہ 280 صفحات پر مشتمل کتاب لکھ دی۔اس کتاب میں قاری کے لیے اتنے سائبان ہیں جن کے نیچے وہ دیر تک ستا سکتا ہے۔کچھ سفر ہیں۔ان اسفار میں نجیبہ کے قلم نے تخیل کی بارگاہ میں سیس نوائی ہے۔اس تقدس نے اس کے قلم میں تکریم پیدا کی ہے جس کے سبب ایسی ستھری نثر نے چہرہ دکھایا ہے جس کی خواہش کی جا سکتی ہے۔بابا تاج الدین جیسی حال مست ہستی کا فیضان جگہ جگہ جلوہ گر ہے اور محمد عبیداللہ درانی جیسے راضی برضا لوگ جن سے علی گڑھ میں محمد سلیم الرحمٰن صاحب بھی مل چکے ہیں، کی طلب نے کشش کا کام کیا ہے۔

اس کتاب کو کسی تبصرے کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا۔یہ کتاب کیفیت کا شماریاتی جائزہ ہرگز نہیں۔یہ کتاب رضا ہے۔اس میں کہیں کہیں اطمینان کے ایسے جزیرے ہیں جن کی تلاش ہر خوش نصیب کو رہتی ہے۔اس کتاب میں قبولیت ارتداد پر غالب ہے۔من سے من کا ملن ہے. درانی صاحب کا پشاور آنا بھی مصلحت سے خارج نہیں۔قادر نگر آباد کرنا۔وہاں خلق خدا کی آمد۔جنگل میں منگل۔نجیبہ کے مشاہدے میں جتنے لوگ بھی آئے یا جن لوگوں کو اس نے اس کتاب میں جگہ دی ہے وہ سارے کے سارے ایسے ہیں جن سے مل کر یا جن کی باتیں سن کر زندگی بوجھ نہیں لگتی۔سب اپنے اپنے راستے پر دوسروں کا راستہ بند کیے بغیر رواں ہیں۔لکھاری نے ہر عمل کو تہذیب بنا دیا ہے۔ذہین طالب علم کیسے ہوتے ہیں۔ماں ماپ کی اطاعت کیسے کی جاتی ہے۔کسی کے گھر میں کرائے داری کے آداب کیا ہیں۔موجود وسائل میں جینے کا سلیقہ کیا ہے۔ہومیوپیتھی کی پڑیاں جن کا بنانا ہر ایک کا مقسوم نہیں۔درانی صاحب کے خلیفے احمد سعید قاضی صاحب کا خلوص۔ایک ایک واقعہ سبھاؤ سے بیان میں آیا ہے۔تیزی نہیں دکھائی۔صبر کیا ہے اور انتظار کیا ہے۔کیفیت میں توازن اسی لئے برقرار رہا ہے. اس کتاب میں بیانیوں کی گھن گرج نہیں۔ایک ہی بیانیہ ہے کہ متعین اور محدود وقت کی حامل اس زندگی کو کیسا گزارا جائے۔کیسے اپنا آپ، اپنے اپنے شوق کی نذر کیا جائے۔ہم اک دوجے کے دکھ کیسے کم کر سکتے ہیں۔متوکل ہونا ہے تو توکل والوں سے ملنا ضروری ہے۔بابا بندی اور باؤ شریف سے ملنا ضروری ہے۔ذہن بناؤ وہ خود تمھیں کسی دن بلا لیں گے۔اصل میں تو مرید نہیں جاتا پیر بلاتا ہے۔اپنا اپنا تصرف ہے۔کبھی کبھی چلتے چلتے راہ میں وہ کچھ مل جاتا ہے جس کی طلب میں لوگوں کی زندگیاں گزر جاتی ہے۔بس قطار میں رہنا شرط ہے۔قطار باہر کچھ نہیں۔پہیے کا پھیر ہے۔سارا سنہرا پن اسی میں ہے۔یہ کائنات ایک بڑے منصوبے کے زیر اثر رواں ہے۔اس انتظام پر کسی کو بھی اعتماد میں لینا ضروری نہیں۔ہونی کے اپنے حیلے ہیں۔قہر ٹل جاتا ہے اگر صاحبانِ فیض سے مس ہو۔مزاج میں ہمہ دانی کم ہو۔علم کا غرہ نہ ہو۔طبیعت خیر کی جویا ہو۔پھر'' راگنی کی کھوج میں'' گم ہونے کا لطف ہی اور ہے۔

باقی صفحہ ۳۹ پر ملاحظہ کیجیے

عقل و دلیل کی بات

ڈاکٹر ضیاء الحسن
(دہلی)

ڈاکٹر نجیبہ عارف ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ پاکستانی یونیورسٹی کے بیشتر اساتذہ کے برعکس علم وادب سے باطنی ربط رکھتی ہیں۔ان کے تحقیقی وتنقیدی مقالات اور منصوبوں کی داد تو ایک دنیا دیتی ہے، ادھر کچھ عرصے سے انھوں نے تخلیق کی دنیا میں بھی مسلسل کتب کی اشاعت سے اپنی ایک مستحکم پہچان بنائی ہے، پہلے شاعری، پھر خودنوشت سوانح اور اب افسانے، تینوں اصناف ان کے وجود کے تین منطقوں کی خبر دیتی ہیں۔قبل ازیں میں ان سے بالکل مختلف طرز کے کچھ مضامین بعض کانفرنسوں اور ادبی میلوں میں سن چکا ہوں، یہ مضامین ابھی کتابی صورت میں مدون نہیں ہوئے لیکن جب یہ آپ تک پہنچیں گے تو آپ بھی میری طرح حیران ہوں گے کہ یہ کس قسم کی تحقیق وتنقید ہے جو مکمل طور پر تحقیق وتنقید ہوتے ہوئے بھی کہیں سے تنقید کا روایتی احساس پیدا نہیں ہونے دیتی۔ یہ تحقیق ایچ ای سی کی ہدایت یافتہ تحقیق سے یکسر مختلف ہے اور کم ازکم اردو میں تو ناپید ہے۔اس بے اصطلاحی تحقیق وتنقید کی یہ خوبی ہے کہ تحقیق وتنقید کا ذوق نہ رکھنے والے سامعین اور قارئین کو بھی مسحور کر لیتی ہے اور اس کے تحقیقی نتائج بھی زیادہ گہرے اور زندگی سے زیادہ قریب ہیں۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے افسانوں پر بات کرنے سے پہلے دو ایک باتیں ''راگنی کی کھوج میں'' کے بارے میں کرنا مناسب ہوگا کیوں کہ دونوں کام ایک وجود کے دو مختلف تقاضوں سے مکمل ہوئے ہیں۔ یہ کتاب بہ ظاہر ایک روحانی سفر کی روداد ہے لیکن ان معنوں میں نہیں جو عموماً ایسی کتاب کے مطالعے سے فوراً ذہن میں آتے ہیں یعنی پیری مریدی اور بابوں کی تلاش وغیرہ۔انھیں مرشد کی تلاش اس لیے نہیں تھی کہ معجزہ وکرامت کے ذریعے اپنے کچھ دنیاوی مسائل حل کر سکیں۔ وہ اس قسم کا انسان ہیں جو دنیا سے زیادہ اپنی وجودی الجھنوں میں الجھا ہوتا ہے۔ میں کون ہوں، کیا ہوں، کیسا ہوں، کتنا ہوں، کیوں ہوں، ہوں بھی کہ نہیں، ہوں تو میری غایت وجود کیا ہے، یہ اور اس جیسے درجنوں سوال ہیں جن کے جواب پانے کے لیے کبھی وہ اردو ادب کا مطالعہ کرتی ہیں، کبھی عالمی ادب کی طرف جا نکلتی ہیں، کبھی روحانیت سے امداد طلب ہوتی ہیں، غور وفکر، مطالعہ ومکالمہ سب اسی وجود کی کھوج کے ذرائع ہیں، وجود جسے وہ استعارہ ''راگنی'' کہتی ہیں، زندگی جسے وہ میٹھے نغمے کی علامت میں تلاش کرتی ہیں، ''راگنی کی کھوج میں'' کو عقل اور دلیل والے روشن خیال لوگ محسوس نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں انھوں نے اس ماورائی منطق کی کھوج کی ہے جو بگ بینگ کی صورت عظیم سے قبل بھی تھی اور بلیک ہولز یا قیامت کے بعد بھی رہے گی، یہ منطق ماورائی اور تخلیقی ہے، اس لیے وجدانی طور پر تو محسوس کی جا سکتی ہے، سائنسی طور پر ابھی اس تک پہنچنے کا راستہ دریافت نہیں ہوا۔اس کتاب سے ہی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ علم ان تک genetically منتقل ہوا اور ان کے وجودی اضطراب سے مترشح ہوتا ہے۔اگرچہ عام آدمی کو بھی زندگی میں کئی بار اس کا تجربہ ہوتا ہے لیکن دنیاداری کی تیز رفتاری میں وہ اسے پہچان سکنے اور حتیٰ کہ محسوس کر سکنے سے بھی محروم رہتا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف جیسے لوگ عام لوگوں کی طرح محض ایک اور سطحی زندگی نہیں گزارتے بلکہ بیک وقت کئی زندگیوں کے تجربے سے گزرتے ہیں۔''راگنی کی کھوج میں'' کے ذریعے ہم ان کی زندگی کے ایک ایسے رخ سے آگاہ ہوئے ہیں جس کا روزمرہ زندگی گزارتی ہوئی ڈاکٹر نجیبہ پر گمان بھی نہیں گزرتا۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو دریا میں رہتے ہوئے بھی خود کو آب آلود نہیں ہونے دیتے۔

ان کے وجود کا دوسرا طاقت ور اظہار ''میٹھے نغمے'' میں ہوا ہے۔ یہ افسانے ایک سطح پر شخصی واردات ہیں لیکن یہ ایک ایسے اسلوب میں اظہار پذیر ہوئی ہے کہ قاری کو اپنی واردات لگتی ہے۔ہمیں اپنے ادب میں دو طرح کے افسانہ نگار ملتے ہیں۔ایک وہ جو اپنے کردار کو خود پر وارد کرتے اور دوسرے کو خود میں متشکل دیکھتے ہیں۔دوسرے افسانہ نگار وہ ہوتے ہیں جو اپنے کرداروں کو غیر سمجھتے ہیں اور دوسروں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔نجیبہ عارف کا شمار پہلی طرح کے افسانہ نگاروں میں کیا جانا چاہیے کیوں کہ وہ اپنے کرداروں کو اپنی ہی ذات کے آئینے میں دیکھتی ہیں، چنانچہ کردار مردانہ ہوں یا نسوانی، جب ان کے وجود سے گزرتے ہیں تو وہاں سے بہت کچھ جذب کرتے ہوئے تشکیل پاتے ہیں۔ان کے کرداروں کو صنفی امتیاز سے بالاتر ہو کر محسوس کرنا چاہیے کیوں کہ اس ظاہری فرق کے باوجود ان کی اصل ایک رہتی ہے۔ پہلی سطح پر یہ خود نجیبہ عارف میں، دوسری سطح پر ان کے تراشے ہوئے کردار اور تیسری سطح پر ہر قاری یہ محسوس کرتا ہے جیسے یہ کوئی اور نہیں بلکہ وہ خود ہے۔انھوں نے اس مابعد الطبیعیاتی حقیقت کو اپنے کرداروں کے ذریعے منکشف کیا ہے کہ لاکھوں سالوں سے اس زمین پر پیدا ہونے والے تمام انسان فی الاصل اُسی ایک جوہر قدیم کے امکانات ہیں جو تقسیم در تقسیم کے عمل کے ذریعے، چلتے چلتے اس وقت آٹھ ارب امکانات کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔اُس ایک جوہر کے اس قدر بے شمار امکانات ہیں کہ اربوں کھربوں میں بھی دوسری بار ظہور نہیں کرتا ہے۔ یہ محض وحدت الوجودی نظریہ نہیں ہے بلکہ سائنسی حقیقت ہے، ہمارے سامنے ہونے کے باوجود ہمیں نظر نہیں آتی اور ہمیں کسی نجیبہ عارف جیسے تخلیق کار کا انتظار کرنا پڑتا ہے جو تخلیقی عمل کے ذریعے ہمیں دریافت کر کے بتا سکے کہ درجنوں اختلافات کے باوجود ہم ایک ہیں یا درجنوں مماثلتوں کے باوجود ہم مختلف ہیں۔ بات زیادہ مبہم ہوتی جا رہی ہے اور تقاضا کر رہی ہے کہ یہاں کم ازکم دو مثالوں سے بات کو واضح کیا جائے:

''میں پھر سے اپنی یادداشت مرتب کرنے لگتی ہوں، واقعات مجھے

اچھی طرح یاد ہیں لیکن بار بار سوچنے سے وہ کچھ دھندلانے لگتے ہیں، جیسے گلاس پر گیلے ہاتھوں کے نشان تھوڑی دیر بعد ہی کہیں کہیں سے مٹنے لگتے ہیں۔ جہاں جہاں گیلاہٹ باقی ہوتی ہے، وہاں وہاں میں نظریں جما دیتی ہوں اور ان مٹتے ہوئے نشانوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے، آدھی باتیں یاد رہتی ہیں اور آدھی بھول جاتی ہیں، جو بھول جاتی ہیں وہ بھی پوری نہیں بھولتیں، بلکہ ان کے دھبے یادداشت کی سلیٹ پر مسلسل موجود رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ان دھبوں سے شکلیں سی بن جاتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ شکلیں پہچانی بھی جاتی ہیں لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ بس انسان ساری عمر ہی سوچتا رہتا ہے کہ یہ کیا تھا، کیسے تھا، کیوں تھا، کچھ یاد نہیں آتا سوائے اس کے کہ کچھ تھا ضرور۔

میں اپنے خیالوں میں گم تیزی سے چلتی ہوں کہ اچانک راستہ مجھے روک لیتا ہے، رک کر اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں جو بے دھیانی مگر اس یقین کے عالم میں چلی جارہی تھی کہ گھر جارہی ہوں، وہ دھیان ٹوٹ سا جاتا ہے۔

میں چونک کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہوں۔ دونوں طرف کے منظر نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔ اجنبیت فرش سے اٹھ اٹھ کر میرے گلے پڑتی معلوم ہوتی ہے۔''

اگر آپ نے یہ طویل اقتباس غور سے سنا، پڑھا اور محسوس کیا ہے تو آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ آپ ہیں، فی الاصل یہ آپ ہم سب ہیں جنھیں موجود دنیا نے ایسا بنا دیا ہے، جو آنکھیں رکھتے ہیں اور انھیں نظر نہیں آتا، جو کوچہ بہ کوچہ، دربہ درسرگرداں ہیں اور انھیں نہ اپنا آپ ملتا ہے اور نہ اپنا گھر ملتا ہے، جو بس چلتے چلے جارہے ہیں اور انھیں قطعاً معلوم نہیں ہے وہ کہاں اور کدھر جارہے ہیں۔ جن کا نہ دل اپنا ہے، نہ دماغ اپنا ہے اور نہ وجود اپنا ہے۔ جن کا اختیار نہ اپنی آنکھوں پر ہے نہ کانوں پر ہے، نہ ہونٹوں پر ہے اور نہ پیروں پر ہے۔ ہم وہی دیکھتے ہیں جو ہمیں دکھایا جاتا ہے، وہی سنتے ہیں جو سنایا جاتا ہے، وہی بولتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں کہ ہم بولیں اور ادھر کو جائیں جدھر وہ چاہتے ہیں کہ ہم جائیں۔ ہم وہ ہیں جن کا نہ کوئی نقطۂ نظر ہے نہ نظریۂ حیات، نہ کوئی یقین ہے نہ کوئی عقیدہ ہے۔ ہم بس وہ روبوٹس ہیں جن کے پروگرام میں یہ فیڈ کر دیا گیا ہے کہ دولت کماؤ، دوسرے سے آگے بڑھو، دوسروں پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھو، دوسروں کو روند کر آگے بڑھو، دوسرے کو مار کر آگے بڑھو۔

اس مجموعے کا مرکزی کردار خود نجیبہ عارف ہیں یا شاید میں ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کردار آپ ہوں، آپ اگر ساٹھ یا ستر کی دہائی میں پیدا ہوئے ہوں اور آپ نے بیسویں صدی کے کچھ سال شعور کے ساتھ گزارے ہوں، اگر آپ نے پچھلی دنیا کو کچھ نہ کچھ محسوس کیا ہو تو پھر آپ بھی ہوسکتے ہیں۔ یہ ایسا کردار ہے جس کی دنیا گم ہوگئی ہے۔ اس نے اس نئی دنیا کو تھوڑا تھوڑا کر کے اور پھر ایک دن یک لخت بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ موجودہ نسل کے برعکس اس دنیا کو زیادہ جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کیسے کیسے، کب کب اور کن کن طریقوں سے ہمیں بے ایمان بنایا گیا ہے، کیسے غیر ضروری چیزوں کو اپنے لیے ناگزیر سمجھنا سکھایا گیا ہے۔ ہم جو بغیر پنکھے اور پھر پورے گھر کے لیے ایک پنکھے میں رہتے ہوئے خوش تھے، اب ہر کمرے میں اے سی، گاڑی میں اے سی، نائی کی دکان میں اے سی، بیکری میں اے سی، شاپنگ مال میں اے سی، بینک میں اے سی، دفتر میں اے سی کے ساتھ خوش نہیں ہیں۔ اب ہمیں چیزیں پسند ہیں اور انسانوں سے نفرت ہے، چیزیں جنھیں وہ دن رات بنا رہے ہیں اور انھیں فروخت کرنے کے لیے نئے نئے اشتہار بنا رہے ہیں اور ہمیں یقین دلا چکے ہیں کہ ہم انسان صرف اسی صورت میں ہیں جب ہم ان کی بتائی ہوئی زندگی گزاریں، ان کی دکھائی ہوئی راہ چلیں اور ان کے سکھائے ہوئے کام کریں بصورتِ دیگر ہم دہشت گرد ہیں، بے وبد تہذیب ہیں مختصر یہ کہ انسان نہیں ہیں بلکہ وحشی اور درندے ہیں جن کا علاج ہے ان کے پاس۔ ان کے پاس ہمارے لیے طرح طرح کے بم ہیں، ٹینک ہیں، میزائل ہیں، جنگی جہاز ہیں اور بیماریاں، بھوک اور افلاس ہیں۔ وہ جب چاہیں ہمیں جدید انسان بنا سکتے ہیں اور ناراض ہو کر ہمیں پتھر کے زمانے میں دھکیل سکتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں اسلحہ دے کر اسے ہم پر نافذ کر دیا ہے۔ ہم خود کو نہ سانس لینے دیتے ہیں نہ بولنے دیتے ہیں اور نہ جینے دیتے ہیں۔

ان افسانوں کی مرکزی کردار نجیبہ عارف ہیں جن سے ان کا منظر چھن گیا ہے، ان کے باغ پرندے پھول کھو گئے ہیں۔ ان کے پانی میں انڈسٹریل ویسٹ شامل کر دیا گیا ہے اور پینے کے لیے انھیں پانی خریدنا پڑتا ہے۔ پہلے انھیں گاڑی دی گئی، سستی اور آسان قسطوں پر، ایک دی گئی، دو دی گئیں، تین دی گئیں۔ گھر کے ہر فرد کے لیے الگ الگ دی گئیں، اب ان کا پیٹرول اور ڈیزل مہنگا کر کے انھیں کہہ رہے ہیں کہ مزید پیسے کماؤ، مزید ظالم ہو جاؤ غیر انسان ہو جاؤ، زیادہ سے زیادہ ڈیزل اور پیٹرول جلاؤ، اپنی اکسیجن ضائع کرو اور پھر ہم سے خریدو، میرے کھیتوں پر ہائی رائز بلڈنگز بنا دی گئی ہیں۔ میرے باغوں کو کاٹ دیا گیا ہے اور ان پر بحریہ ٹاؤنز اور ڈی ایچ ایز بنا دیے گئے ہیں۔ میری زندگی مجھ سے چھین لی گئی ہے اور بدلے میں مجھے ایسے شب و روز تھما دیے گئے ہیں جو خوف، دہشت، تنہائی اور ہوس سے لب ریز ہیں۔ میرے سینے سے دل نکال لیا گیا ہے اور ایک ایسا پتھر رکھ دیا گیا ہے جس میں کسی بے چارگی، بھوک، بیماری، دکھ، درد، عذاب سے جنبش تک نہیں ہوتی۔ جو سوچتا ہے کہ سب مر رہے ہیں تو مرتے رہیں میں تو زندہ ہوں، اگر عراق یا افغانستان میں بم گر رہے ہیں تو ہمیں کیا، ہم تو محفوظ ہیں اور پھر ایک اچانک مجھے پتہ چلتا ہے کہ کچھ بھی محفوظ نہیں ہے، وہ ہمارے دریا خرید لیتے ہیں۔ وہ ایک زرعی ملک کو گندم کا درآمد کنندہ بنا سکتے ہیں۔

ان افسانوں کے کردار وہ ہیں جن کی کوئی نہ کوئی گلی روز کہیں گم ہو جاتی ہے اور انھیں اپنے گھر کا راستہ نہیں ملتا، ان کے میٹھے نلکوں کی جگہ اب واٹر پیوری فائنگ پلانٹ لگے ہیں کیوں کہ زمین سے اب کھارا پانی ہی نکلتا ہے۔

ان افسانوں کے کردار ہم ہیں۔۔۔ ہم جن کے پاس اپنے لیے ایک لمحہ بھی نہیں ہے، ہمارا سارا وقت انھوں نے اپنے بنائے ہوئے ٹشو پیپرز کے عوض خرید لیا ہے۔ ہم دن رات ان کی مشینوں کے ایک پرزے کی طرح مسلسل رواں رہتے ہیں اور ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آتا، ہم جو لیکچرر سے اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پروفیسر بننا چاہتے ہیں۔ ہم جو افسر، اس سے بڑے افسر اور اس سے بڑے افسر بننا چاہتے ہیں، ہم جو زیادہ بڑے عہدے اور زیادہ پیسوں کے لیے سرگرداں ہیں۔ ہم جو نہ لکھتے ہیں نہ پڑھتے ہیں بس سازشیں کرتے ہیں، دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، ان پر پاؤں رکھتے ہیں اور مزید اوپر پہنچ جاتے ہیں۔ جو ہر اونچ اوپر اٹھنے کے لیے کتنے ہی انسانوں کے اوپر کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔ باتیں تو میں نے کافی لکھ لی ہیں اب دیکھیے کہ نجیبہ عارف اپنی، میری اور آپ کی زندگی کو کیسے بیان کرتی ہیں:

''ہسپتال تک کا سفر پندرہ بیس منٹ کا ہے۔ پتا نہیں پارکنگ ملنے میں کتنی دیر لگے، خیر پارکنگ کا انتظار نہیں کروں گی، گاڑی وہلے پارکنگ والوں کو دے دوں گی مگر پھر بھی گیٹ پر اتر کر وہیل چیئر کھولنے، ابا کو گاڑی سے نکال کر اس پر بٹھانے اور اندر داخل ہو کر ڈاکٹر کے کلینک تک پہنچنے میں بھی پندرہ بیس منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔ ساڑے دس بجے بھی کلینک پہنچ گئے تو گیارہ ساڑھے گیارہ تک تو انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ ڈاکٹر کے پاس دس منٹ بھی لگے تو وہاں سے نکل کہ باقی کاروائیاں پوری کرتے کرتے بارہ بج جائیں گے۔ فارمیسی سے دوائیں آج نہیں خریدوں گی، وہاں بہت رش ہوتا ہے، دیر ہو جائے گی، واپسی پر ابا کو گاڑی میں بٹھانا، وہیل چیئر کھول کر ڈگی میں رکھنا اور گاڑی ہسپتال کے رش سے نکالنا بھی خاصا مرحلہ ہوگا اور کچھ نہیں تو گھر پہنچتے پہنچتے ایک ضرور بج جائے گا۔ ابا کو گاڑی سے نکال کر کمرے تک پہنچانے اور ان کی دیکھ بھال کی ہدایات دینے میں بھی دس پندرہ منٹ لگیں گے۔ گھر سے دفتر کا راستہ ۳۵ منٹ کا ہے۔ دو بج ہی جائیں گے۔ میرا ذہن مسلسل گھنٹوں اور منٹوں کا حساب کر رہا تھا۔''

مضمون پڑھتے ہوئے میں مسلسل سوچ رہا ہوں کہ ابھی بارہ بجے مجھے نکلنا ہے۔ پندرہ منٹ تو بس ٹرمینل تک پہنچنے میں لگ ہی جائیں گے۔ شکر ہے کہ ٹکٹ میں نے پہلے خرید لیا تھا ورنہ کچھ وقت اس کے لیے بھی رکھنا پڑتا۔ جس کتاب پر شام کو بات کرنی ہے، وہ راستے میں پڑھ لوں گا۔ گھر پہنچ کر اتنا ہی وقت ہوگا کہ کپڑے بدل سکوں، ڈاکٹر کوثر محمود سے واپسی پر مل لوں گا، بارہ بجے تک رات کو گھر پہنچ ہی جاؤں گا۔ تھوڑی دیر فیس بک دیکھوں گا، کوئی ایک آدھا کلپ بھی دیکھنا ضروری ہے۔ وٹس ایپ پر تھوڑی سی چیٹ، عشاء کی نماز صبح پڑھ لوں گا۔ شکر ہے نماز کے لیے پیسے نہیں ملتے ورنہ رات کو ہی پڑھنی پڑتی۔

بقیہ : تیرگی کا علامتی بیانیہ

ایسے ہی ناول میں انسانی وجود کا کھوپڑی کے ساتھ انسلاک کیا ہے، جس کی مثال ناول میں موجود یہ جملہ ہے۔ ''اس کا چہرہ ایک کھوپڑی کے ڈھانچے میں بھری گوشت کی فلنگ کے سوا کچھ بھی نہیں''

مجموعی طور پر آزاد تلازمہ خیال، لاشعور کی تکنیک کے ذریعے ناول کے تینوں حصوں کو بیان کیا گیا ہے۔ مصنفہ پہلے حصے میں تو قاری کی دلچسپی ناول میں رکھنے میں کامیاب رہی ہیں۔ لیکن باقی دو حصے ماہر لسانیات یا پڑھے لکھے قاری کے لیے لکھے گئے ہیں۔ یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر نجیبہ عارف کا اولین ناول " مکھوٹا" جدید اردو ناولوں میں بہترین اضافہ ہے، جس میں متن کے بیانیے کے متنوع عکس نظر آتے ہیں۔ ناول کو لاہور سے عکس پبلی کیشنز نے بڑے اہتمام سے شایع کیا ہے۔ میں مصنفہ اور عکس پبلشرز کے سی۔ ای او فہد بھائی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

بقیہ : راگنی کی کھوج میں

''میں یہ کہنے کی جرات رکھتا ہوں کہ ذہن کو ملیامیٹ کرنا ممکن ہی نہیں کیوں کہ اس کا خاص نظام اوقات ہے یعنی ذہن ہمیشہ اب ہے۔ ذہن کے لیے درحقیقت نہ کوئی شے پہلے ہے نہ بعد میں۔''

نجیبہ تمہاری کتاب نے مجھے بہت رلایا ہے۔ مگر ہوں میں بھی بڑی ڈھیٹ ہڈی۔ تمہارے سسر کی طرح۔ تیسرے کو بیچ میں ڈالنے پر راضی ہی نہیں۔ پیروں فقیروں پر دل ہی نہیں آتا۔ متھا پھوڑ لیتا ہے اسی کے در پر اس کے عشق میں نہیں ہائے اولاد کی محبت میں وہ بے شک جوتیاں مارے۔

بقیہ : راگنی کی کھوج

اس کتاب کی خواندگی سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ حیرت کی ہے۔ تعجب اس پہ آتا ہے کہ اس زمانے میں جہاں نفسانفسی اور قارونیت کا زور ہے درّانی صاحب جیسی منفرد ہستیاں بھی موجود رہی ہیں۔ یہ کتاب کیا ہے معرفت کے رموز کی جستجو میں سرگرداں لوگوں کے لیے پہلی کا قاعدہ ہے۔ حرف شناس ہو جائیں گے تو دنیا اور دنیا کے ورقوں پر جو لکھا ہے وہ بھی سمجھ میں آنے لگے گا۔ خیر کی اس دنیا کو قوسین، لاہور نے چھاپ کر، زندگی کی تلخی کو کچھ وقت کے لیے گوارا بنا دیا ہے۔

جستجو کا ثمر

شکیل خان
(کراچی)

اس کتاب کو اگر خودنوشت کہا جائے تو یہ اس کی تعریف سے آگے ہے۔اس میں ایک اچھے ناول کی سی تازگی اور حسن بیان پایا جاتا ہے۔ بہت بہت شکریہ نجیبہ عارف اتنی اچھی کتاب لکھنے کا، ہم توقع کرتے ہیں کہ آپ مزید ہمیں بابا جی محمد عبیداللہ درانی صاحب کی اس محبت بھری دنیا کے بارے میں بتاتی رہیں گی۔

کتاب کا نام ''راگنی کی کھوج میں'' مجھے کچھ عجیب سا لگا، اردو کانفرنس کی تیاریوں کے سلسلے میں ہر دوسرے روز احمد شاہ صاحب صدر آرٹس کونسل کراچی، مبین مرزا صاحب، ڈاکٹر فاطمہ حسن اور مجھے اپنے آفس بلا لیتے، شاہ صاحب کے ساتھ کام کرنے کے لئے آدمی کو چلنا نہیں دوڑنا پڑتا ہے۔ تیرھویں اردو کانفرنس روزانہ ایک نئے روپ میں سامنے آرہی تھی۔ کووڈ 19 وائرس کی وجہ سے اسے جسمانی طور پر محدود لیکن سوشل میڈیا کے ذریعے لامحدود کردیا گیا تھا۔ایسی ہی ایک میٹنگ میں کتابوں کی رونمائی کے سیشن میں مبین مرزا صاحب نے ''راگنی کی کھوج میں'' کی رونمائی کا ذکر کیا اور طے یہ پایا کہ نجیبہ عارف کی لکھی ہوئی اس کتاب پر یاسمین حمید صاحبہ بات کریں گی۔

اردو کانفرنس کا میلہ سج گیا۔ہم سب یہ سوچ رہے تھے کہ 2020ء کا سال ہم سے اردو کانفرنس کی رونق بھی لے اڑا لیکن شاہ صاحب اور انکی ٹیم کی محنتیں رنگ لائیں تیرھویں اردو کانفرنس ہوئی اور خوب جم کے ہوئی۔ گزشتہ 12 کانفرنسوں تک اس کے شرکاء ہزاروں میں ہونے تھے لیکن اس سال سوشل میڈیا کی وجہ سے یہ تعداد ساری دنیا میں کہ جہاں جہاں اردو بولی جاتی ہے لاکھوں میں پہنچ گئی۔

کانفرنس کے تیسرے روز یاسمین حمید صاحبہ نے آن لائن ''راگنی کی کھوج میں'' کے بارے میں بڑی مفصل گفتگو کی، سادہ اور دل نشیں انداز میں نپی تلی بات کرنا یاسمین حمید صاحبہ کو اہل ادب میں ممتاز کرتا ہے۔ کتاب اور اس کی مختلف جہات کا ذکر یاسمین حمید صاحبہ نے جس طرح اپنی گفتگو میں کیا وہ سن کر کتاب پڑھنے کا شوق دوچند ہوگیا۔ احمد شاہ صاحب کے پاس کتاب دیکھی تو کہا شاہ صاحب میں لیجا رہا ہوں جواب آیا پڑھ کر واپس لے آنا، بہت اچھی کتاب ہے۔

میں نجیبہ عارف سے کبھی نہیں ملا، گو کہ گزشتہ سال آپ اردو کانفرنس میں تشریف لائیں تھیں لیکن آپ سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ محترم محمد عبیداللہ درانی صاحب کہ جن کا وصال نجیبہ سے ان کی واقفیت سے پہلے ہو چکا تھا، اس صاحب اسرار کو جاننے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی۔ میں محمد عبیداللہ درانی صاحب سے واقف نہیں ہوں لیکن کتاب میں ایک جگہ حسن اختر صاحب کا ذکر پڑھا کہ وہ درانی صاحب کے بہت قریب تھے، میری ملاقات تو حسن اختر صاحب سے بھی نہیں ہوئی لیکن ان کی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے گندھی ہوئی کئی کتب کو پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جس محبت بھرے اور عشق مصطفیٰ سے لبریز انداز میں کرتے ہیں وہ پڑھنے کی چیز ہے ان ہی کتب میں درانی صاحب کا ذکر بھی ملتا ہے۔ حسن اختر صاحب کے صاحبزادے عبید حسن اختر میرے دوست ہیں، عبید حسن اختر سے بات ہوئی تو پتہ چلا کہ حسن اختر صاحب کو تو پالا ہی درانی صاحب نے تھا اور وہ 5 سال کی عمر سے انکے ساتھ تھے۔

یہ کتاب کیا ہے، ایک دنیا کی دریافت ہے گرو کی تلاش اس کے راستے کی تلاش اس کتاب کا موضوع ہے، ایک ایسی دنیا کے جو ہمارے سامنے، ہمارے جیسے انسانوں نے قائم کی ہوئی ہے کہ جس دنیا کے باشندے محبت کے سفیر ہیں کہ جو لوگ بھی اس سلسلہ سے منسلک ہیں وہ محبت اور سلوک کے لوگ ہیں یہ روایتی پیر پرستی یا حضرت کے کشف و کرامات بتانے کی کتاب نہی ہے بلکہ دلوں کو روشن کرنے اور زندگیوں کو تبدیل کرنے والے کا ذکر ہے کہ کس طرح ایک مغربی تعلیم یافتہ شخص نے ہزاروں افراد کی زندگیوں کو یکسر تبدیل کردیا۔

اس کتاب میں نجیبہ عارف صاحبہ کے والد والدہ کا ذکر ہے کہ جو دو متضاد سمتوں کے مسافر ہیں لیکن اپنی اپنی سمت کے لئے مکمل یکسو ہیں، یہاں ہمیں اہل سلوک اور اہل خدمت کا ذکر ملتا ہے کہ جو خلق خدا کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں لیکن روایتی بابوں کی طرح نہی بلکہ زندگی کے حقیقی کردار جو اپنی دنیوی زندگیوں میں بھی بہت کامیاب ہیں وہ کس طرح اہل سلوک اور اہل خدمت بنے ہیں۔اس کا ذکر نجیبہ عارف کے باباجی کے الفاظ میں ''تصوف کے راستے پر چلنے کے لئے سب سے پہلے ''میں'' کے پلے پلائے دنبے کو قربان کرنا پڑتا ہے۔

''سادہ الفاظ، سلامت اور روانی سے ادا کئے گئے جملے کہ جن میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے، کوئی رنگین بیانی نہیں ہے کسی جگہ تعریفوں کا طومار نہی ہے، ہر بات کھلی کھلی، سچی سچی، حقیقت یہ ہے کہ کہ اس کتاب کو اگر خودنوشت کہا جائے تو یہ اس کی تعریف سے آگے ہے۔اس میں ایک اچھے ناول کی سی تازگی اور حسن بیان پایا جاتا ہے۔ بہت بہت شکریہ نجیبہ عارف اتنی اچھی کتاب لکھنے کا، ہم توقع کرتے ہیں کہ آپ مزید ہمیں باباجی محمد عبیداللہ درانی صاحب کی اس محبت بھری دنیا کے بارے میں بتاتی رہیں گی۔

حسین چہرے
شیریں زبانیں اور حسین چہرے
عموماً برائی کی طرف مائل
ہوتے ہیں۔۔۔!
ونسٹن چرچل

ایک ''جھوٹی کہانی'' میں معنی کی تلاش

فرخ ندیم
(اسلام آباد)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کی کتاب میٹھے نلکے کی پہلی کہانی نے مجھے یوں جکڑ رکھا ہے کہ میں کوئی بھی افسانہ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں تو لاشعور کی رو میں بہتا ذہن لامحالہ اس جھوٹی کہانی کی طرف بھاگتا چلا جاتا ہے جو نہ صرف تخیل اور حقیقت کا ایک بیانوی ملاپ ہے بلکہ سونے اور جاگنے کے درمیان جیسی کیفیت کا افسانوی عکس بھی۔ اس پوری کتاب کا تاثر، کبھی کبھی، یوں بھی بنتا ہے کہ حرفِ اول سے آخر تک کہانی ایک ہی ہے بلکہ باقی تمام کہانیاں ایک ہی بڑی کہانی کے subnarratives ہیں۔ اس کی وجہ اس کتاب کی بیانوی کائنات کی مرکزیت ہے جس سے کم وبیش تمام کہانیاں متشکل ہوتی ہیں۔ کتاب میں واضح رنگ تو نسائی ہے لیکن اتنا تلخ نہیں کہ گلے سے نیچے ہی نہ اترے۔ ضرورت سے زیادہ تلخی متن کی جمالیات کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصری تنقید میں متن کا اکہرا پن اب ایک سپاٹ کہانی کو افسانے سے الگ سمجھا جاتا ہے۔

میں بار بار اس جھوٹی کہانی کے عنوان کی طرف پلٹتا ہوں کہ کیا واقعی میں یہی عنوان ہے! بھلا یہ بھی کوئی عنوان ہوا! اور جب راوی اپنی ہی کہانی کو جھوٹی کہہ دے تو پہلا تاثر یہ ابھرتا ہے کہ لفظ جھوٹی کی تہوں میں کچھ ایسا مواد ضرور موجود ہے جو جو لفظ سچی کی ضد بن کر متن کی کھوج کا اشارہ بنتا ہے۔ معنی کی تلاش کا سفر اسی عنوان سے شروع ہو جاتا ہے۔ ادب کی سب تعریفوں میں ایک وضاحت یہ بھی شامل ہے کہ ادب غیر معمولی اور، ضرورت کے وقت، ایبنارمل حالات و کیفیات کی شعری، بیانوی یا ڈرامائی تشکیل کا نام ہے۔ جس طرح شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے ہیملٹ میں شاہ کلاڈیئس کے وزیر پلونیئس نے دیوانگی میں بھی ایک کلیہ دریافت کر لیا تھا اسی طرح اس نام نہاد جھوٹی اسم صفت کی تہوں میں چھپی سچائیوں کو دریافت کرنا قدرے مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ بہت ہی سادگی اور سہولت سے ہم یہاں جھوٹ سچ کے ثنوی نظام کو ذرا سا reverse کر کے دیکھیں تو ظاہر یعنی جھوٹ معدوم ہونے لگے گا اور باطنی سچ، کہانی کے بہاؤ کے ساتھ، سامنے آنے لگے گا۔ کہانی کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے:

عصر کا وقت ہے یا شاید اس کے کچھ بعد کا۔ میں سوچتی ہوں کہ مغرب تک مجھے گھر پہنچ جانا چاہیے۔

یوں تو ادب کا ایک بڑا حصہ سفری بیانیہ ہے۔ سفر کی خوبصورتی یہ ہے کہ ادبی فضا میں اکثر علامتی اور استعاراتی ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ سفر خود کہانی بھی ہوتا ہے اور بلکہ دوسری کئی کہانیوں کی شمولیت کو یقینی بناتا ہے۔ اس تحیر انگیز سفر میں زمان و مکاں بہت حد تک واضح ہوتے ہیں، جیسے کہ اس کہانی میں عصر کا وقت ہے اور کہانی کی واحد متکلم مغرب سے پہلے گھر پہنچنے کی متمنی ہے۔ اس کے علاوہ کہانی کی لوکیل اس کی مجموعی فضا سے فطری طور پر ہم آہنگ ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا تمام خصوصیات اس کہانی میں موجود ہیں۔ یہ کہانی ایک تخیلاتی سفر ہے، اسی لیے یہ جھوٹی نہیں بلکہ جھوٹی موٹی معلوم ہوتی ہے جس میں Imagined truths حقیقی تجربات کا قابلِ یقیں سروکار بنتے ہیں۔ چند لمحوں کا نسائی تجربہ جو ایک مہم بھی ہے اور تجربہ بھی۔ کہانی کے دوسرے جملے ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ سفر حقیقت کا التباس ہے۔

پہنچ جاؤں گی، اردگرد دیکھتے ہوئے میں اعتماد سے خود کو بتاتی ہوں اور اپنے تمام قدم تیز کر دیتی ہوں۔ میرے ذہن میں کچھ دیر پہلے کے واقعات گھومنے لگتے ہیں۔ میں انہیں خوب اچھی طرح دہرانے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ گھر جا کر سب کو بتا سکوں کہ کیا کیا ہوا تھا۔ سب کو انتظار ہوگا۔ سب پوچھیں گے بتاؤ کیا ہوا تھا۔

مندرجہ بالا جملے ایک لطیف سی مہم جوئی کا ابتدائیہ ہیں جن میں وہ دھڑکا نہیں جو ہم عام طور پر اس وقت محسوس کرتے ہیں جب ایک نسائی موجود انہونیوں کی سنگلاخی پھلانگتا، ہانپتا کانپتا واپس گھر پہنچتا ہے۔ یہ جملہ ''میرے ذہن میں کچھ دیر پہلے کے واقعات گھومنے لگتے ہیں'' معنی کی تعبیر میں کافی حد تک معاون ہے۔ یعنی راوی خود اعتمادی سے ان واقعات کو دہرا رہی ہے جو کچھ دیر پہلے وقوع پزیر ہوئے۔ یعنی کچھ ایسا نہیں ہوا جو کسی بڑے دھڑکے یا کرواہٹ کا باعث بنے۔

ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ معروف فلم سیریز Hunger Games کی کوئی بہادر لڑکی خطرات کو للکارتے ہوئے اپنے ہونے کی دلیل پیش کر رہی ہے۔ اسی جملے میں لفظ ''اعتماد'' ایک ایسا لسانی اشارہ ہے جو افسانے میں تحت المتن متحرک رہے گا اور آخر تک راوی کا ساتھ نبھائے گا اور کہانی کے انجام تک معنی آفرینی کا باعث بنتا رہے گا۔ میں اس کہانی کو سہولت کے ساتھ شعور کی رو افسانہ کہہ سکتا ہوں کیونکہ اس میں واقعات کے ساتھ راوی کا ذہن ماضی قریب، فعل حال اور کہیں کہیں مستقبل کے درمیان چکر لگاتا نظر آتا ہے، مثال کے طور پر یہ پیراگراف دیکھ سکتے ہیں:

میں پھر سے اپنی یادداشت مرتب کرنے لگتی ہوں۔ واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں لیکن بار بار سوچنے سے وہ کچھ دھندلانے لگتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آدھی باتیں یاد رہ جاتی ہیں اور آدھی بھول جاتی ہیں جو پوری طرح نہیں بھولتی بلکہ ان کے دھبے یادداشت کی سلیٹ پر مسلسل موجود رہتے ہیں، کبھی کبھی ان دھبوں سے شکلیں سی بن جاتی ہیں۔ کبھی وہ شکلیں پہچانی بھی جاتی ہیں۔ لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ بس انسان ساری عمر یہی سوچتا رہتا ہے کہ یہ کیا تھا، کیسے تھا اور کیوں تھا۔ کچھ یاد نہیں آتا، سوائے اس کے کہ کچھ تھا ضرور۔

یوں اپنے آپ سے یعنی اپنی ذات سے ملتے کہانی کی Protagonist خارج سے مکالمہ کرتے نظر آتی ہے۔ لاشعور کی ڈور سے بندھی یادیں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اولڈ اور نیو کیمپسز کے درمیان ہچکولے کھانے لگتی ہیں۔ ان گلیوں میں تحت الشعور بھٹکتا نظر آتا ہے۔

یہ کونسی گلی ہے، باغبان پورہ؟ نہیں انارکلی کی، نہیں انارکلی تو نہیں، کوئی اور ہے، پہچانی کیوں نہیں جارہی؟

آٹھ دس جملوں کے بعد کہانی کے متن میں ایک نسائی موضوعیت اپنے خارج اور سیاق وتناظر سے رشتے تلاشنا شروع کرتی ہے:

میں خود کو تسلی دیتی ہوں۔ لیکن دل میں خدشہ سا ہونے لگتا ہے۔ اس لیے میں گلی کو خوب اچھی طرح غور سے دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کرتی ہوں۔ کبھی دائیں اور کبھی بائیں۔

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحبہ کی کہانی ایک ایسا متن ہے جس میں ذومعنویت یا تہہ داری اہم کردار ادا کررہی ہے۔ افسانے کا ایک ایک جملہ علامتی اظہاریہ ہے۔ کھوئے ہوئے ماضی کی کھوج کردار کے لیے Tragic Pleasure کا باعث بنتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذات کی تعمیرِ نو کا سبب بھی۔ اب یہاں سے یعنی صفحہ ستائیس سے جونہی گلی سکڑتی ہے افسانے کی تعبیر واضح ہونے لگتی ہے۔ افتادگانِ خاک ان میں کیسے رہتے، گزرتے گزارا کرتے ہیں، ایسے کئی سوالات ہیں جن کے بوجھ تلے ہماری Protagonist گلی کی ناہموار مٹی میں دھنستی چلی جاتی ہے۔ اسی گلی سے گزرتے راوی کا شعور ایک احساس کی شکل اختیار کرتا ہے، پھر یہ احساس فکر میں ڈھلتا ہے اور فکر ایک نظریہ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اس زمین زاد کلامیہ Discourse سے مصنفہ کا تصورِ افسانہ بھی واضح ہوتا ہے۔ یعنی افسانہ، بھلے وہ کسی بھی اسلوب میں لکھا جائے، زمینی دوسرے لفظوں میں معاشرتی مسائل سے گریز نہیں کرسکتا۔ افسانہ نگار کے شعور، تخیل، احساس اور فکر کا ایک ہوجانا ہی ایک سنجیدہ افسانے کی شرط ہے۔ اس سنگھم کا اظہار اس خوبصورت پیراگراف میں ملتا ہے:

ساتھ ہی مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے کتنی آسانی سے خود کو ان غریب لوگوں سے جدا کرلیا ہے۔ غریب لوگ کہہ کر میرے اندر بڑائی کا، ان لوگوں سے الگ ہونے کا، برتر ہونے کا جو طمانیت بھرا احساس پیدا ہوا ہے، اس کا تعفن میرے وجود کا حصہ بن گیا ہے۔ میں خود بھی کبھی ان گلیوں کا روڑا تھی۔ میں اس تعفن کو جھاڑنے کی ندامت بھری مگر ناکام کوشش کرتی ہوں۔

افسانہ نگار نے ان گلیوں کو ممکنہ جزئیات نگاری سے بیان کیا ہے۔ یہ گلیاں ابھی تک روایتی خودکلامی سے آزاد نہیں ہوسکیں، نہ ہی زمانے کی تیز رفتار چکا چوندان کو متاثر کرسکی ہے۔ کہانی کے اس موڑ پر ہم واضح طور پر ایک ٹھوس نظام دیکھ سکتے ہیں۔ جڑواں ساختیں ان کی پوری کتاب میں موجود ہیں۔ راوی کا سپیس یعنی ہماری واحد متکلم کی زمانی اور مکانی حالت اس حالت کی ضد ہے جو یہ گلیاں پیش کررہی ہیں۔ سماج میں طبقاتی ساختیں ایک دوسرے سے مکالمہ کرتی ارتقا کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ ایسے جسے راوی نے گلیوں کو بیان کرتے محسوس کیا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ راوی کا سپیس بھی اسی طرح کی گلیاں یا یہی گلیاں ہوا کرتی تھیں جن کی شناخت اب مانوس ہے نہ ہی نامانوس، یعنی ان جانی پہچانی۔ مکانی اور زمانی فرق سے شناختیں متزلزل ہوجاتی ہیں۔

قصہ مختصر کہانی، کہانی اپنے آخری مرحلے میں یعنی Climax میں اس وقت داخل ہوتی ہے جب راوی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جس بدن اس کی ذات لپٹی ہے وہ ایک نسائی وجود ہے، یعنی ایک عورت ہے۔ اس مرحلے پر نہ صرف راوی بلکہ کہانی کے قدم بھی تیز ہونے لگتے ہیں۔ تھوڑے فاصلے پر ایک دوکان تعمیر کرتے مزدور بھول جاتے ہیں کہ پاس سے نظریں جھکائی اور خاموشی سے گزرتی عورت ہر قدم پر منہدم ہوتی جارہی ہے۔ وہ قہقہے لگاتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اس وجود کی حیثیت دیواروں میں چنوائی انارکی سے کچھ زیادہ نہیں۔ چندردوں (اینٹوں کی تہوں) کی مار ہے پھر آواز ہی نہیں اس کی کہانی بھی ختم۔ اب چونکہ اس کہانی کی Protagonist انارکلی نہیں بلکہ متحرک حواسِ خمسہ سے آراستہ ایک پراعتماد انسان ہے جو کئی گلیوں بازاروں کا ECG کرتی ہے مگر کسی قدم لڑکھڑاتی نہیں اور جب صفحہ انتیس پر پہنچتی ہے تو اپنے آپ سے پوچھتی ہے:

تو کیا میں راستہ بھول گئی ہوں؟

یہ سوال میرے خیال میں ایک پنچ لائن ہے۔ یہ جملہ نہ صرف علامتی ہے بلکہ ہماری اجتماعی فکر بھی۔ انفرادی طور پر بھی ہم سب اسی سوال پر اٹکے رہتے ہیں۔ وہ منزل جس کا ہمیں ہمیشہ سے انتظار رہتا ہے وہ گلیوں کی بھول بھلیوں کا شکار ہوجاتی ہے۔ خاص طور پر ایک نسائی مکانیت میں جو سوالات ہمیشہ حل طلب رہتے ہیں وہ منزلوں کی کھوج اور راستوں کی الجھن جیسے ہی ہیں۔ فلم ہنگر گیمز کی عورت عام (ہمیشہ کے لیے) کھوئی ہوئی عورت نہیں۔ وہ للکارانہ زبان جانتی ہے۔ جس سپیس میں اس کردار کی تربیت ہوئی ہے وہ ممکنہ خطرات سے آگاہی کا باعث ہے، اس لیے وہ جانتی ہے کہ کس سوال کو کیسے سلجھانا ہے۔ یوں کہانی بہت سی الجھنوں کا سلجھاؤ بھی پیش کرتی ہے۔

ہیروئین کو راستہ تلاشنے میں دو ہی طاقتیں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

۱۔ معروضی نشانات وعلامات (یعنی خارج)

۲۔ وجدان

معروض، تمام تر Dynamics کے ساتھ، پدرسری ہے۔ تو راستہ کیسے تلاش کیا جائے؟ کسی مرد سے مدد لی جائے؟ اس کا مطلب ہے عورت راستہ۔ منزل یا زندگی کے معنی تلاش کرے تو مرد کی مدد سے اور پھر مرد کی لغت سے! اگر ایسا ہوجائے تو کہانی کا تھیسز گڑبڑ ہوجائے گا۔ وہ نسائی خود اعتمادی جو کہانی کی ساختوں کی بنیاد بنی وہ گہنا سکتی ہے۔

دوسری طاقت یعنی وجدان ایک تجلی کا روپ دھارتا ہے اور کہانی کی

بھول بھلیوں میں بھٹکتا ہوا معنی واضح ہونے لگتا ہے۔یعنی ٹیکسی یا رکشہ لیا جا سکتا ہے لیکن ساتھ ہی معنی کے حصول کا اضطراب کردار کی پریشانی میں اضافہ کرتا ہے، ایک excitement سی دیکھنے کو ملتی ہے جو سوالات کے حل کی تلاش میں قدرے تیز رفتار ہو جاتی ہے اور یہی تیز رفتاری یادداشت پر اثر انداز ہوتی ہے:

''اوفو! میں ٹیکسی کیوں نہ لے لوں؟ اوہ میرے خدا، یہ خیال پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا'' میں ایک لمبا سانس لے کر اپنی بدحواسی کو کوستی ہوں۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے، میں ٹیکسی لے لیتی ہوں۔''

میں اِدھر اُدھر دیکھتی ہوں؛ کہیں کوئی ٹیکسی نظر نہیں آتی۔

''ان گلیوں میں ٹیکسی کہاں سے آئے؟ ٹیکسی تو یہاں سے گزر ہی نہیں سکتی۔

اچھا تو پھر رکشا۔''

ہاں رکشا تو یہاں سے گزرتا ہے۔ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک رکشا گزرا تھا اور اسے جگہ دینے کے لیے مجھے ایک دکان کی دیوار کے ساتھ جڑ کر کھڑا ہونا پڑا۔

''اچھا تو میں رکشا لے لیتی ہوں۔''

اب مجھے کچھ اطمینان ہوتا ہے اور میں دائیں کندھے سے لٹکے اپنے بیگ کو کھول کر دیکھتی ہوں۔میرا بٹوا؟

میں گھبرا کر دوبارہ بیگ میں جھانکتی ہوں۔

مجھے یاد آتا ہے وہ تو میں نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ہاں، وہ ہاتھ میں ہی تھا۔جب میں ان شریر لڑکوں سے بات کر رہی تھی۔

اچھا چلو کوئی بات نہیں۔میں گھر جا کر رکشے والے کا کرایہ ادا کر دوں گی۔میں خود کو اطمینان دلاتی ہوں اور اس بات پر خود کو شاباش دیتی ہوں کہ میرا ذہن ہر مشکل میں کوئی نہ کوئی حل نکال لیتا ہے۔

''اچھا تو اب کوئی خالی رکشا ڈھونڈتے ہیں تاکہ میں مغرب سے کی اذان سے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔روزہ کھلنے سے پہلے۔''

گھر کے خیال کے ساتھ ہی کہانی واپس گھر پلٹتی ہے، جہاں سے شروع ہوئی تھی۔لاشعور سے شعور لی لو پھوٹتی ہے اور وہ جس کا کہانی میں کوئی نام نہیں یعنی کہانی کی Protagonist اس روز روزے سے تھی مگر معنی کی کھوج میں وہ نظریاتی self التوا کا شکار ہو جاتی ہے۔کردار کا اضطراب جو ہمیں تھوڑی دیر پہلے دیکھنے کو ملا تھا بے وجہ تو نہیں۔معنی کا حصول انسان کو سرشار کر دیتا ہے۔یہاں پریشانی اور سرشاری کے درمیان کہیں بے دھیانی آ بسی جس کی شدت اتنی تھی کہ (بے دھیانی) میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ادھر مغرب کی اذان ہوتی ہے تو دوسری طرف کہانی کی چنگیر میں سجے معنی قاری کے ہاتھ لگتے ہیں:

''اچھا تو خالی رکشہ ڈھونڈتے ہیں تاکہ مغرب کی اذان سے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔روزہ کھلنے سے پہلے۔''

مجھے یاد آتا ہے کہ آج تو میرا روزہ ہے۔

لیکن اس یاد کے ساتھ ہی ایک اور خیال جست لگا کر عقب سے اچھلتا ہے اور میرے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

''ابھی اس گلی میں داخل ہونے سے پہلے میں جہاں بیٹھی تھی، وہاں تو میں نے پیٹ بھر کر کھا لیا تھا۔چائے پکوڑے، پنیر، اور بھی بہت کچھ تھا۔

میں صوفے پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گئی تھی اور جی بھر کر کھاتی پیتی رہی۔

تو میرا روزہ ٹوٹ چکا ہے۔

میرا روزہ ضائع ہو گیا ہے۔

جیسے بچہ ضائع ہو جائے۔

روزہ ٹوٹ جانے کا الم میرے اندر ایسے اترتا ہے جیسے شیشے کی بوتل میں گاڑھے تیل کی دھار۔دیواروں سے چپکتی ہوئی، پوری طرح لتھڑ جاتی ہوئی۔

اچانک گلی میں مغرب کی اذان گونجنے لگتی ہے۔

روزہ کھل گیا ہے۔

لیکن میرا روزہ تو ٹوٹ چکا ہے۔

اب گھر جانے کی جلدی کیا ہے۔

''آبائی خاندان''

علمائے لسانیات نے زبانوں کو ان کی صَوتی اور صرفی خصوصیات کی بنیاد پر مختلف خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔سب سے بڑا خاندان آریائی زبانوں کا ہے۔اس کے بعد منگول خاندان (چینی، جاپانی وغیرہ) کا نمبر آتا ہے۔اور پھر سامی (عربی اور عبرانی وغیرہ) اور دراوڑی (تلگو، تامل، ملیالم، کنڑی) زبانوں کے خاندان ہیں۔آریائی خاندان جو بنگال سے ناروے تک پھیلا ہوا ہے کئی گھرانوں میں بٹ گیا ہے۔ہندی کا علاقہ بہت وسیع تھا۔یہ زبان ملتان سے پٹنہ تک بولی اور سمجھی جاتی تھی اور اس کی بہت سی مقامی بولیاں تھیں مثلاً برج بھاشا، کھڑی بولی، اودھی، بھوجپوری، قنوجی، ہریانی وغیرہ۔اور یہ زبان راجستھانی اور پنجابی سے بہت قریب تھی۔مماثلت اور ہمسائیگی کے باعث ہم ہندی (مغربی اور مشرقی)، پنجابی، راجستھانی اور سندھی وغیرہ کو آپس میں نہیں کہہ سکتے ہیں۔مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب "عرب اور ہند کے تعلقات" میں اُن ہندی الفاظ کی طویل فہرست دی ہے جو قدیم عربی لغت میں تجارتی چیزوں کے لیے پائے جاتے ہیں۔چنانچہ صندل (چندن)، کافور (کپور)، اطریفل (تری پھل)، نیلوفر (نیلو پھل) وغیرہ ہندء الاصل الفاظ ہیں۔قرآن شریف میں بھی ہندی کے تین الفاظ کی نشاندہی کی ہے: مسک (موشکا)، کافور (کپور) اور زنجبیل (زنجابیر)۔

ابوالمجاھد سیتاپور

ڈاکٹر نجیبہ عارف: علمی و ادبی جہات

ڈاکٹر بی بی امینہ
(راولپنڈی)

برصغیر پاک و ہند کی علمی و ادبی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطّہ ریاضی، طب، نجوم، فقہ، حدیث، تفسیر، تاریخ و سیر وغیرہ کے حوالے سے گہوارۂ علم و ادب رہا ہے۔ ان تمام شعبوں میں ماہرین علوم و فنون نے ایک وقیع اور یادگار سرمایہ چھوڑا ہے اور مختلف ادوار میں جہاں اس ضمن میں حضرات کے کارہائے نمایاں سامنے آئے ہیں وہیں خواتین بھی مردوں کے دوش بدوش دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ابتدا میں یا تو ان کی خدمات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا یا پھر ان کی تعلیم و ترقی پر ایسی سماجی اور معاشرتی قدغنیں لگائی گئیں کہ وہ اپنی تخلیقات تک میں اپنی شناخت چھپانے پر مجبور ہو گئیں اور مخففات یا مردوں کے ناموں کا سہارا لینے لگیں۔ تاہم جب تعلیم عام ہوئی؛ تحریک آزادیِ نسواں، صحافت اور دیگر اقدامات کے سبب خواتین کو ان کے حقوق اور ذمے داریوں کا احساس ہوا اور انھوں نے اپنے طبقے کو فرسودہ رسوم و رواجات سے نکال کر اسے ملکی ترقی اور نشو و نما کے لیے کارآمد بنانے کی سعی کی تو جہاں عورت کی سماجی حیثیت اور اہمیت کا منظر نامہ تبدیل ہوا وہیں خواتین نے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ ہو کر اپنی استعداد اور صلاحیت کے بل بوتے پر اپنا مقام پیدا کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف کا شمار بھی انھی خواتین میں کیا جاتا ہے۔ وہ اس وقت اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد میں صدر نشین کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ وہ اپنی اہلیت و قابلیت، فہم و فراست، مثبت نقطۂ نظر، تعمیری اندازِ فکر، دور اندیشی اور جدت پسندی کی روش کے سبب اپنے شعبے کی شناخت اور پہچان ہیں اور اس کی مسلسل ترقی اور بہتری کے لیے کوشاں ہیں۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف ۲۴ ستمبر ۱۹۶۴ء کو پنجاب کے ضلع خوشاب میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز خوشاب ہی سے کیا۔ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول، خوشاب سے میٹرک کرنے کے بعد انھوں نے سائنسی مضامین کا انتخاب کرتے ہوئے گورنمنٹ جوہر کالج برائے خواتین، جوہر آباد سے ایف۔ ایس سی کی۔ ۱۹۸۳ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین، سرگودھا سے اردو ادب، فلسفہ اور فارسی کے مضامین کے ساتھ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر اس وقت کے جدید رجحان کے مطابق پنجاب یونی ورسٹی، لاہور سے ۱۹۸۶ء میں کانسی کے تمغے کے ساتھ ایم۔ پی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ لیکن چوں کہ ابتدا ہی سے زبان و ادب سے گہری دل چسپی تھی اس لیے ۱۹۸۷ء میں پنجاب یونی ورسٹی، لاہور سے ایم۔ اے۔ اردو کے امتحان میں طلائی تمغہ حاصل کیا۔ انھی دنوں معلوم ہوا کہ اسلام آباد کی علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی میں اقبالیات میں ایم۔ فل کے پروگرام کا آغاز ہوا ہے، تو وہاں داخلہ لیا اور ۱۹۹۵ء میں طلائی تمغے کے ساتھ ایم۔ فل اقبالیات کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اسی ادارے سے ۲۰۰۳ء میں "ممتاز مفتی کا فکری ارتقا" پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی اُردو کی ڈگری بھی حاصل کی۔ جب کہ ۲۰۰۸ء میں نیشنل یونی ورسٹی اوف ماڈرن لینگویجز (NUML)، اسلام آباد سے حاصل کردہ ایم۔ اے۔ انگریزی کی ڈگری اور ۲۰۱۳ء میں چارلس ویلس پوسٹ ڈوک فیلوشپ، یونی ورسٹی اوف لندن اس کے علاوہ ہیں۔

اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی تعلیم کی تکمیل سے پہلے ہی کر دیا تھا۔ ابھی ایم۔ پی۔ اے کا آخری سمسٹر تھا کہ انھیں لاہور کی ایک بڑی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ فرم میں ایک اچھی نوکری کی پیش کش ہوئی۔ انھوں نے امتحان دینے کے بعد ہی نوکری شروع کر دی۔ تاہم چھے ماہ کے قلیل عرصے میں اس ملازمت سے استعفیٰ دے کر ایم۔ اے۔ اُردو کا امتحان دے دیا۔ جنوری ۱۹۸۸ء میں انھوں نے گورنمنٹ ایلی منٹری ٹیچرز ٹریننگ کالج، جوہر آباد میں اردو کی استاد کی حیثیت سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا دوبارہ آغاز کیا اور ۱۹۹۲ء تک اسی ادارے سے وابستہ رہیں۔ جون ۱۹۹۲ء سے ۲۰۰۴ء تک فیڈرل گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین، ایف۔ سیون ٹو، اسلام آباد میں اردو کی لیکچرار کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیے۔ ۲۰۰۴ء تا ۲۰۰۷ء اسلام آباد ماڈل کالج فار گرلز، ایف۔ سیون فور، اسلام آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی ذمے داریاں انجام دیں اور وہاں ایم۔ اے۔ اُردو کی کلاسوں کا آغاز کیا۔ ۲۰۰۷ء میں انھوں نے اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد میں درس و تدریس کا آغاز کیا، جہاں وہ تا حال اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس دوران میں ۲۰۱۶ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور ۲۰۱۸ء میں پروفیسر کے عہدوں پر ترقی ہوئی۔ وہ اولاً ۲۰۰۸ء تا ۲۰۱۰ء اور بعد ازاں ۲۰۱۳ء تا ۲۰۱۹ء شعبۂ اردو (خواتین) کی سربراہی کا فریضہ انجام دیتی رہیں؛ اسی دوران میں اسٹوڈنٹس ایڈوائزر کے عہدے پر بھی فائز رہیں اور دوسری انتظامی اور منصبی ذمے داریوں سے بھی عہدہ برآ ہوئیں۔ دسمبر ۲۰۱۹ء میں وہ رضا کارانہ طور پر صدرِ شعبۂ اُردو کے منصب سے علاحدہ ہوئیں۔ ۲۰۱۲ء سے ۲۰۲۳ء تک ڈین کلیۂ زبان و ادب رہیں اور بحیثیت پروفیسر شعبۂ اردو سے بھی وابستہ رہیں۔

اس اعتبار سے شعبۂ اردو میں ان کی سربراہی کے دو ادوار ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ پہلے دور میں انھوں نے پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل کی سرپرستی میں جامعہ کے تحقیقی مجلّے معیار کا اجرا کیا اور اس کے پہلے چار شماروں میں معاون مدیر کی حیثیت سے اس کا بنیادی ڈھانچا ترتیب دیا۔ بعد ازاں وہ اسی مجلّے کی مدیرِ اعلیٰ رہیں۔ دوسرے دور میں انھوں نے ڈاکٹر انوار احمد کی تحریک پر ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) سے منظور شدہ اردو کے تحقیقی مجلّات کی پہلی انڈیکسنگ ایجنسی قائم کی، جسے مذکورہ ادارے کی طرف سے بھی منظور کیا گیا۔ اس ایجنسی کے تحت اشاریہ اردو جرائد کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

انھی ادوار میں انھوں نے تعلیم و تدریس کے معاملات سے بھی بے توجہی نہیں برتی اور کئی اہم اور بروقت فیصلے کیے۔ انھوں نے نظم و ضبط اور استحکام پیدا کیا اور شعبۂ اردو میں بی۔ ایس، ایم۔ ایس اور پی ایچ۔ ڈی کی سطحوں پر طلبا و

طالبات کے لیے ادبیات کے ساتھ ساتھ لسانیات میں بھی تخصص حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا۔ انھوں نے ان تمام سطحوں پر پڑھائے جانے والے نصابات پر بھی نظر ثانی کی اور شعبے کے تمام اساتذہ کی معاونت سے بی ایس کے نصاب کو جدید بنیادوں پر استوار کرتے ہوئے اسے از سرِ نو مرتب کیا، جب کہ ایم ایس اردو اور پی ایچ ڈی اردو ادبیات کے نصابات انھوں نے اکیلے مرتب کیے۔ ان نصابات کی اہمیت اور ضرورت کے پیشِ نظر ملک کی دوسری جامعات نے بھی ان سے استفادہ کیا اور اپنے شعبوں میں لسانیات کی تعلیم کو رواج دیا۔ انھی کی زیرِ سرپرستی بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد کے کلیۂ زبان و ادب میں لسانیات کے ایک علاحدہ شعبے کی منظوری کے لیے ایک قابلِ عمل منصوبہ بھی بھیجا گیا ہے، جو منظوری کے بعد کسی بھی جامعہ کا ایک منفرد شعبہ ہوگا۔ مزید برآں ان کی کوششوں سے ۲۰۲۲ء میں شعبۂ اردو میں پوسٹ ڈوک فیلوشپ کا بھی آغاز ہوا، جو اس وقت پاکستان میں اردو زبان و ادب کا پہلا پوسٹ ڈوک پروگرام تھا۔ اس کے تحت چار اسکالروں نے فیلوشپ مکمل کی جب کہ مزید داخلے جاری ہیں۔ اب دیگر پاکستانی جامعات میں بھی ان کے اس طرزِ عمل کی پیروی کی جارہی ہے۔

ان کی سربراہی میں شعبۂ اردو میں علمی و ادبی سرگرمیوں کا آغاز بھی ہوا۔ شعبے سے فارغ التحصیل ہونے والی طالبات کے لیے ان کے اختتامی سمسٹر میں کیریئر کونسلنگ اور شخصی اوصاف کی تربیت کے لیے ورک شاپ بھی منعقد کی جاتی رہی اور مختلف النوع موضوعات پر سیمینار، کانفرنسیں اور ادبی نشستیں بھی منعقد ہوئیں۔ اس طرح انھوں نے ایک روایت کا آغاز کیا، جس کے تحت یہ تمام سرگرمیاں اب بھی جاری ہیں۔ انھوں نے کلیے کی سطح پر بھی ایک نئی اور مثبت روایت کا آغاز کرتے ہوئے ''حلقۂ خیال'' کے نام سے ایک ادبی فورم بھی قائم کیا ہے جس کے تحت ملکی اور بین الاقوامی ماہرین اور دانش وروں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ زبان و ادب سے متعلق کسی بھی موضوع پر جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ سے مکالمہ کریں۔ یوں شرکا کو ان کی فکر اور فن سے واقف ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اس ''حلقۂ خیال'' کے زیرِ اہتمام عامر حسین (برطانیہ)، مبین مرزا، ڈاکٹر داؤد شہباز (انقرہ)، ڈاکٹر تنویر انجم، افضال احمد سید، ڈاکٹر مارسیا ہرمنسن (شکاگو) اور احمد جاوید کے ساتھ کامیاب نقاریب منعقد کی جاچکی ہیں۔

شعبے میں تحقیقی سرگرمیوں کی معیار سازی میں بھی پروفیسر نجیبہ عارف کا مثالی کردار رہا ہے۔ تا دمِ تحریر ان کی زیرِ نگرانی پی ایچ۔ڈی کے ۱۳ اور ایم۔ایس کے ۲۵ مقالات لکھے جاچکے ہیں، جو نہ صرف اپنے موضوعات کے لحاظ سے متنوع ہیں بلکہ جدید تحقیقی معیارات اور رجحانات کے حوالے سے بھی معتبر اور مستند قرار دیے جاسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، یونی ورسٹی اوف پشاور، پشاور، قرطبہ یونی ورسٹی، پشاور، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد اور نیشنل یونی ورسٹی اوف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم۔ایس اور پی ایچ۔ڈی کی سطح کے مقالہ جات کے بیرونی ممتحن کے فرائض بھی انجام دیتی رہی ہیں۔

دیگر علمی شعبوں اور اداروں میں بھی ان کی مساعی لائقِ توجہ ہے۔ وہ ۲۰۰۴-۰۵ء میں Intel Award for the Most Innovative Use of Technology in Education حاصل کرچکی ہیں۔ انھوں نے اپنی قابلیت اور لیاقت کے بل بوتے پر این۔آر۔پی۔یو (NRPU) ریسرچ پروجیکٹ اور IIU پروجیکٹ کے تحت فنڈز بھی حاصل کیے، جن کی مدد سے شعبۂ اردو کے لیے نہ صرف ایک شان دار سیمینار لائبریری کا قیام عمل میں لایا گیا بلکہ شعبے کے لیے کئی کا آمد آلات اور مشینوں کی فراہمی بھی ممکن بنائی گئی۔ وہ ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) کی تشکیل کردہ کئی مجالس کی رکن رہی ہیں اور اردو کو بہ طور دفتری زبان رائج کرنے کے لیے حکومت پاکستان کی اعلیٰ سطحی مجالس میں بھی بہ طور کمیٹی رکن شرکت کرچکی ہیں۔

پینتیس سال سے زائد تدریسی اور تحقیقی سفر میں ان کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں میں ہے اور یہ بھی انھی کی مساعیِ مسلسل کا نتیجہ ہے کہ اس وقت بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد کے شعبۂ اردو (خواتین) میں تین سو کے قریب طالبات تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ انھوں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ ان کی نگرانی یا سربراہی میں حاصل کی جانے والی ڈگریاں محض ایک کاغذ کا ٹکڑا نہ ہوں یا پھر طالبات محض 'ڈاکٹر' کے لقب کے حصول کے لیے کوشش نہ کریں بلکہ صحیح معنوں میں اپنے آپ کو اس کا اہل بھی ثابت کریں۔ چناں چہ یہ ان کی کڑی نگرانی اور معیار پر اصرار ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کی سرپرستی میں کامیاب ہونے والی طالبات اس وقت پاکستان کی مختلف سرکاری اور نجی جامعات اور دیگر اداروں میں اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر اپنے فرائض انجام دے کر اپنے اساتذہ اور ادارے کا نام روشن کررہی ہیں۔

جس طرح علمی اور انتظامی کاوشوں میں تنوع کا ایک جہان آباد ہے، اسی طرح ادبی میدان میں بھی ڈاکٹر نجیبہ عارف ایک کثیر الجہت شخصیت کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ وہ اُردو، پنجابی اور انگریزی، فارسی، عربی اور سرائیکی زبانوں سے واقف ہیں۔ انھوں نے شاعری، افسانہ، ناول، سفرنامہ، یادداشت، مضمون، تنقید و تبصرہ، تحقیق و تدوین، لسان و لسانیات اور ترجمے کے شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ اس حوالے سے ان کا ایک مجموعہ معانی سے زیادہ کے عنوان سے ۲۰۱۵ء شائع ہو چکا ہے، جسے اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس کی طرف سے 'اردو ادب کی بہترین کتاب' (۲۰۱۵ء) کے اعزاز سے نوازا جاچکا ہے۔ اس مجموعے کے علاوہ بھی ان کی کئی نظمیں مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ شاعری ہی کے حوالے سے ان کی دوسری قابلِ قدر کاوش قصیدہ بردہ شریف کا منظوم اردو ترجمہ ہے، جو ۲۰۲۲ء میں نوارِ کاظمہ کے نام سے نہایت دیدہ زیب سرورق اور طباعت کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ اپنے رواں اسلوب کے سبب پذیرائی حاصل کررہا ہے۔

پروفیسر نجیبہ عارف نے افسانہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے، جس سے ان کی دل چسپی ان کے تعلیمی سفر کے ابتدائی ادوار ہی میں قائم ہوگئی تھی۔ ۲۰۲۲ء ہی میں ان کا افسانوی مجموعہ بھی شائع ہوا، جسے انھوں نے میٹھے نلکے کا عنوان دیا ہے۔ اس میں ان کے وہ افسانے بھی شامل ہیں جو مجموعے کی اشاعت سے قبل مختلف رسائل و

جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ مزید برآں اس کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ مجموعے میں شامل تمام اسکیچز مع سرورق ان کی بیٹی مومنہ وجاہت کے بنائے ہوئے ہیں۔

ناول نگاری کے میدان میں پروفیسر نجیبہ عارف کے ایک ناول ''گرد کے بگولے'' کا ذکر کیا جاسکتا ہے، جو ادبی مجلّہ "لوح" میں ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۸ء تک قسط وار شائع ہوتا رہا۔ یہ ناول کئی تبدیلیوں کے ساتھ ۲۰۲۳ء میں مکھوٹا کے نام سے طبع ہو چکا ہے، جس میں برتی گئی مابعد جدید تکنیک اور لسانی ولسانیاتی مباحث قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا چکے ہیں۔

تنقید وتحقیق اور تبصرہ نگاری کے حوالے سے جہاں کتب پر ان کے متعدد تبصروں اور مختلف کتابوں میں شامل ان کے مضامین کا ذکر کیا جاسکتا ہے وہیں مختلف ملکی اور بین الاقوامی تحقیقی مجلّات میں شائع شدہ انگریزی اور اردو مقالات بھی ہیں، جن کی تعداد ۶۰ سے زائد ہو چکی ہے۔ اس ذیل میں ان کی تحقیقی وتنقیدی کتابیں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ جن میں ممتاز مفتی : شخصیت اور فن (۲۰۰۷ء)، رفتہ وآیندہ: اردو ادب کا منظر نامہ (۲۰۰۸ء)، ممتاز مفتی کا فکری ارتقا: نفسیات، تصوف اور قرآن (۲۰۱۱ء) اور اسلام، پاکستان اور مغرب: علمی و ادبی تناظر (۲۰۱۵ء) شامل ہیں۔ ان میں سے رفتہ وآیندہ: اردو ادب کا منظر نامہ کو بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد کی طرف سے ۲۰۱۰-۲۰۰۹ء کی بہترین تحقیقی کتاب کا انعام بھی دیا جاچکا ہے۔ ممتاز مفتی کا فکری ارتقا: نفسیات، تصوف اور قرآن ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ جب کہ اسلام، پاکستان اور مغرب: علمی و ادبی تناظر کی دوسری اشاعت بھی منظرِ عام پر آچکی ہے۔

انھوں نے تدوین وتحقیق اور ترتیب وانتخاب کے شعبوں میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس سلسلے میں سیر ملک اودھ: یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامۂ اودھ (۲۰۱۷ء)، تاریخِ جدید: سفر نامۂ منشی اسماعیل (۲۰۲۱ء) اور اٹھارھویں صدی کے دو نادر سفر نامے (۲۰۲۱ء) کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ ان میں تاریخِ جدید: سفر نامۂ منشی اسماعیل ایران سے طبع ہوئی ہے۔ یہ تمام کتابیں تحقیق وتدوین کے لیے راہ نما ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عالمانہ مقدمات کے لیے بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کا اپنا سفر نامہ ''یادیں، جگہیں، چہرے اور خیال'' کے عنوان سے قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔ علاوہ ازیں راگنی کی کھوج میں کے عنوان سے وہ اپنی یادداشتیں بھی قلم بند کر چکی ہیں۔ یہ یادداشتیں معروف علمی اور مذہبی شخصیت عبید اللہ درانی سے متعلق ہیں۔ یہ کتاب موضوع کے ساتھ ساتھ اپنے اُسلوب کے سبب بھی علمی وادبی حلقوں سے داد حاصل کر چکی ہے۔

ترتیب انتخاب کے ضمن میں معیاری اردو قاعدہ (۲۰۱۰ء)، اردو ادب کا نو مزاحمتی رجحان: ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ (انتخاب و تجزیہ) (۲۰۱۱ء)، بکل دے وچ چور (۲۰۱۲ء)، انتخاب کلام اصغر گونڈوی (۲۰۱۶ء) کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے، جن میں سے اردو ادب کا نو مزاحمتی رجحان: ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ (انتخاب وتجزیہ) حوالے کی اہم ترین کتابوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف نے تراجم بھی کیے ہیں۔ ان ضمن میں انگریزی شاعری کیا اردو تراجم اور تلاش: اللہ۔ ماورا کا تعین کا ذکر کیا جاسکتا ہے، جو عکسی مفتی کی Measuring the Intangible کا اُردو ترجمہ ہے۔ جب کہ قصیدے کے منظوم ترجمے کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔

ادبی ادارت میں بھی ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ وہ مختلف اداروں میں اپنی ملازمت کے دوران میں ان کے رسائل کی مدیر رہیں۔ ۲۰۰۹ء تا ۲۰۱۰ء تک بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد (IIUI) سے شائع ہونے والے تحقیقی مجلّے معیار کی بانی اور شریک مدیر کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتی رہیں۔ ۲۰۱۳ء سے ۲۰۱۷ء تک لاہور یونی ورسٹی اوف مینجمنٹ سائنسز (LUMS) کے تحقیقی جریدے بنیاد کی مہمان مدیر رہیں۔ ان کی زیرِ ادارت بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد سے شائع ہونے والے اشاریہ اردو جرائد کی پانچ جلدیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جب کہ وہ کئی ملکی تحقیقی مجلّات مثلاً بازیافت (پنجاب یونی ورسٹی، لاہور)، اقبال (اقبال اکادمی، لاہور)، اسلامک اسٹڈیز (Islamic Studies) (اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اسلام آباد)، انسائٹس (Insights) (دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد)، بنیاد (لمز، لاہور)، تعبیر (علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد) اور معیار (بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد) کے ساتھ ساتھ غیر ملکی مجلّات کے لیے بہ طور ماہر مقالات کی جانچ پرکھ کی خدمات سرانجام دیتی رہی ہیں۔

ڈاکٹر صاحبہ کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کو دیے جانے والے انعامات واعزازات کے علاوہ ان کے فکر وفن کے حوالے سے کئی مضامین اور مقالہ جات تحریر کیے جاچکے ہیں۔ ان کا یہ ادبی اور تخلیقی سفر ہنوز جاری ہے۔ اس امر کا بین ثبوت ان کی وہ تخلیقات وتحقیقات ہیں، جو زیرِ طبع ہیں۔ ان میں بہ حوالہ تحقیق وتدوین ''جنوب ایشیائی مسلمانوں کا تصور مغرب: انیسویں صدی میں یورپ کے سفر ناموں کا سیاسی وسماجی مطالعہ'' اور ''تذکرۂ شعرائے لکھنؤ'' (عبد الغفور نساخ کا ایک غیر مطبوعہ تذکرہ) شامل ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف نہ صرف ہر شعبے اور ادارے کا فخر رہی ہیں بلکہ وہ ایک کامیاب منتظم، ماہرِ تعلیم، معلّمہ، محقق، نقاد اور تخلیق کار بھی ہیں۔ ان کی کاوشیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اردو زبان وادب کی ترقی اور ترویج کے لیے انھیں جب اور جو موقع بھی ملا انھوں نے اسے حتی المقدور کارآمد بنانے کی سعی کی ہے اور اس ضمن میں کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ چوں کہ وہ کمال پسند (perfectionist) ہیں اس لیے وہ اب بھی اردو زبان وادب اور اس کی تدریس کی موجودہ اور مجموعی صورتِ حال اور مختلف اداروں کے تحت اس کے لیے کیے جانے والے اقدامات سے مطمئن نہیں ہیں اور سمجھتی ہیں کہ اگر تدریس اردو پر مناسب توجہ نہ دی گئی اور اردو کو ایک علمی اور فکری زبان کے طور پر قبول نہ کیا گیا تو صورت حال بدستور تشویش ناک رہے گی۔ تاہم ان کی مذکورہ بالا خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد میں ان کی موجودگی اور سربراہی ادارے کے لیے خوش آئند ثابت ہوگی اور امید ہے کہ زبان وادب کے حوالے سے نئے اور کارآمد منصوبے سامنے آسکیں گے۔

''خلوت کی سماں بندی''

۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے نظمیہ کلام سے منتخبہ۔

عطیہ سکندر علی (سکھر)

سیمیا

اداسی
دھیان کی لمبی قطاروں کے سروں پر
چھپ کے بیٹھی ہے
اچانک وار کرتی ہے
نظر میں تیر جاتی ہے
تو جیسے زندگی مدھم سی ہو کر اپنے اندر ہی سمٹتی ہے
سکڑتی ہے
ادھوری سی
کسی بے شکل سے سیال جیسی
خود سے پہچانی نہیں جاتی!

سبھی لفظوں سے معنی یوں نکل جاتے ہیں
جیسے بے بسی کے پل میں
تن سے جاں نکلتی ہے
ہر اک آواز مردہ، بات لایعنی
مسرت، خواہشیں، دل کی تمنائیں
ارادے، خواب، رشتے، راحتیں
غم کے سبب
لکڑی کے گھوڑوں کی طرح اپنی جگہ پر منجمد
اور لفظ۔۔۔۔
جیسے ہاتھ میں تلوار لکڑی کی!
اسی کے بل پہ اترے کارزارِ زندگی میں ہم!!
اسی کے زور پہ دنیا سے ٹکراتے رہے ہیں ہم!!!

یہی آواز کی لہریں
یہی گرتی ابھرتی، ٹیڑھی میڑھی سی لکیریں تھیں
جنہیں ہم نے بڑے بھیدوں بھرے مفہوم کے جامے میں
دیکھا تھا
تو اس کے گھیر کو سمجھا تھا
خیمہ
کل حقیقت کا!

اداسی کی ہوا کا تیز جھونکا
لفظ کا خیمہ گرا دیتا ہے
اندر کچھ نہیں ہوتا
نہ آوازیں، نہ خاموشی
نہ تنہائی، نہ یکتائی،
نہ خلوت کی سماں بندی
نہ جلوت کی نظر گیری
نہ وحدت کا اندھیرا سا
نہ کثرت کی تجلی سی،
نہ پورا کچھ، نہ کچھ آدھا!

اداسی کس قدر عقدہ کشا ہے!!!
پھر بھی دل پر بار ہوتی ہے۔

وہی تلوار لکڑی کی
ہر اک پیکار میں آخر
ہمارے کام آتی ہے
وہی ہتھیار ہوتی ہے۔

○

ازل ابد کے درمیاں۔۔۔

اگر کبھی نصیب ہو
خود اپنے ساتھ ایک دن بسر کروں
طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک
نمودِ ماہتاب سے
ستارۂ سحر کی آخری جھلک تلک
کسی اکیلی رہگزر پہ
گمشدہ زمانوں کی مہک لیے
یوں سج سج پاؤں دھرتی سر پھری ہواؤں میں
گھنے عمیق جنگلوں کی سانس لیتی خامشی کی ملگجی فضاؤں میں
بلند کوہسار پر
قدیم جوگیوں کی خالی رہ گئی گپھاؤں میں
کنارِ چشمۂ ازل۔۔۔
پرانے برگدوں کی چھاؤں میں
زمین میں دبے ہوئے،
غبارِ وقت سے اٹے
کسی عجیب گاؤں میں
فشارِ زندگی سے اک قدم کے فاصلے پہ
شہرِ خامشی کی ٹوٹی پھوٹی قبر میں
زمان اور مکان کی اندھیری انتہاؤں میں
افق کے اس طرف کسی کی بارگاہِ ناز میں
فنائے ذات سے حیاتِ نو کی ابتداؤں میں!

○

کارِ ہوس تمام

زندگی سے موت تک حرص و ہوس کا سلسلہ ہے
آرزو کی دھند سے لے کر حقیقت کی کرن تک
مے کی مستی سے
خمارِ علم و آگاہی کے رنگیں، خوش نما، دلکش سرابوں تک،
جمالِ یار کے تاباں تصور سے
حصارِ ذات کے گہرے حجابوں تک
من و تو کے تعلق میں
بدن سے روح تک اور روح سے لے کر بدن تک
مختصر، لمبے، کڑے، آساں، اچانک، دیرپا،
سب مرحلوں میں،
میں سے تو تک،
بحرِ خاموشی سے سحرِ گفتگو تک،
لطف رسوائی سے نازِ آبرو تک،
درد سے اوندھی پڑی تخلیق کی ساعت سے لے کر،
مورچھل کے پر سجا کر رقصِ طاؤسی کی مشقِ خودنمائی تک،
یونہی درجہ بدرجہ
زندگی سے حظ اٹھانے کی تمنا
گل کھلائے جا رہی ہے۔
گل ستاں کے ہر تماشائی کو دیوانہ بنائے جا رہی ہے!

○

شہرِ آشوب

سہاگ سکھ کی یہ رات رانی
یہ مامتا کے جگر کی ٹھنڈک
صحن میں پھیلے شجر کی شاخیں
یہ شام ڈھلتے ہی کوئلوں کی
تڑپتی کوکو
یہ خواب گہ کی طلسمی کھڑکی
جسے پکڑ کر
ادھورے پورے
اترتے رہتے ہیں چاند دل میں
یہ سرسراتی ہوا کی آہٹ
خیال رستوں پہ گونجتی ہے
نشیلی بوندوں کی یہ ٹپاٹپ
نجانے کتنے پرانے رازوں
کے در پہ سم سم سا بولتی ہے۔

یہ شام جب بھی دلہن سی بن کر
ہمارے گھر میں اترنے لگتی ہے،
دل پہ کوئی
عجیب سا دکھ
چٹان بن کر یوں بیٹھ جاتا ہے
جیسے اب کے نہ سانس آئے گی
جیسے آنکھوں نے جتنے منظر چرا لیے ہیں
وہ حق سے بڑھ کے تھے
جیسے میں نے اکیلے خوشیاں سمیٹ لی ہیں زمانے بھر کی
سلگتا دل یہ سوال کرتا ہے
دکھ کے ایسے جوار بھاٹا میں
میں اکیلی ہی خواب ساحل سے جا لگی ہوں؟
ادھر بھی دیکھو،
وہ دور لہروں سے ہاتھ نکلے ہیں!
کوئی آنسو پکارتا ہے!!
کسی نے حسرت سے اس کنارے کی سمت دیکھا!!!

ہم ابنِ الفاظ، ابوالفاظ!

ہماری فکر پر
لفظوں کی کائی جم چکی ہے
اور آنکھوں پر
لغت کی پٹیاں ہیں
ہمارے سب ارادے کاغذوں پر
روشنائی کا عمل ہیں
ہماری پوری شخصیت
زباں کی نوک سے تعمیر ہوتی ہے
ہمیں بس پانچویں جانب کو چلنا راس آتا ہے
ہماری اصلیت کے غار پر ابجد کے جالے ہیں
ہمیں اپنی طرف دیکھے ہوئے بھی لازمانہ ہو گیا ہے
ہمیں معنی کہاں درکار
ہم ادراک ولاادری کی سرحد کے مکیں ٹھہرے
ہمیں پرچھائیوں سے انس ہے
گفتار کا مرہم ہی شافی ہے
ہمیں اور آنے والی ساری نسلوں کو
یہی میراث کافی ہے

○

نازائیدہ

میرے دل کی کوکھ میں آج
قیامت اٹھی
ان نظموں کی یاد میں
جن کا ناجائز اِسقاط ہوا تھا
چلتے پھرتے،
باتیں کرتے،
دفتر جاتے،
میٹنگ کی لمبی میزوں پر
باورچی خانے کے اندر
یا بستر پر!

جھوٹی کہانی

نجیبہ عارف
(اسلام آباد)

عصر کا وقت ہے یا شاید اس کے کچھ بعد کا۔ میں سوچتی ہوں کہ مغرب تک مجھے گھر پہنچ جانا چاہیے۔

''پہنچ جاؤں گی''۔ ارد گرد دیکھتے ہوئے میں اعتماد سے خود کو بتاتی ہوں اور اپنے قدم تیز کر دیتی ہوں۔ میرے ذہن میں کچھ دیر پہلے کے واقعات گھومنے لگتے ہیں۔ میں انھیں خوب اچھی طرح دہرانے اور یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں تا کہ گھر جا کر سب کو بتا سکوں کہ کیا کیا ہوا تھا۔ سب کو انتظار ہوگا۔ سب پوچھیں گے، بتاؤ کیا ہوا تھا؟

میں پھر سے اپنی یادداشت مرتب کرنے لگتی ہوں۔ واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں لیکن بار بار سوچنے سے وہ کچھ دھندلانے لگتے ہیں۔ جیسے گلاس پر گیلے ہاتھوں کے نشان۔ تھوڑی دیر بعد ہی کہیں کہیں سے مٹنے لگتے ہیں۔ جہاں جہاں گیلاہٹ باقی ہوتی ہے، وہاں وہاں میں نظریں جما دیتی ہوں اور ان مٹتے ہوئے نشانوں کی مدد سے مٹ گئے ہوئے نشانوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آدھی باتیں یاد رہتی ہیں اور آدھی بھول جاتی ہیں؟ جو بھول جاتی ہیں وہ بھی پوری طرح نہیں بھولتیں بلکہ ان کے دھبے یادداشت کی سلیٹ پر مسلسل موجود رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ان دھبوں سے شکلیں سی بن جاتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ شکلیں پہچانی بھی جاتی ہیں لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ بس انسان ساری عمر یہی سوچتا رہتا ہے کہ یہ کیا تھا؟ کیسے تھا؟ کیوں تھا؟ کچھ یاد نہیں آتا؛ سوائے اس کے، کہ کچھ تھا ضرور۔

میں اپنے خیالوں میں گم تیزی سے چلتی ہوں کہ اچانک میرا راستہ مجھے روک لیتا ہے۔ رک کر اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں جو بے دھیانی سے مگر اس یقین کے عالم میں چلی جا رہی تھی کہ گھر جا رہی ہوں، وہ دھیان ٹوٹ سا جاتا ہے۔

میں چونک کر ادھر ادھر دیکھتی ہوں۔ دونوں طرف کے منظر نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔ اجنبیت فرش سے اٹھ اٹھ کر میرے گلے پڑتی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے آندھی چلے تو دھول آنکھوں میں گھس کر اپنا آپ جتا دیتی ہے۔

یہ کون سی گلی ہے؟ باغبان پورہ کی؟ نہیں، انارکلی کی؟

نہیں انارکلی تو نہیں؛ کوئی اور ہے؟

پہچانی کیوں نہیں جا رہی؟

میں تو ہزاروں دفعہ یہاں سے گزری ہوں۔ ہر بار گھر جانے کے لیے یہیں سے تو گزرتی تھی۔

اولڈ کیمپس سے نکل کر گھر جانے کے لیے۔

اولڈ کیمپس؟

میرا ذہن کسی اور ہی زمان و مکاں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ پھر اچانک یاد آتا ہے کہ میں اولڈ کیمپس میں نہیں پڑھتی تھی، میں تو نیو کیمپس میں تھی۔ اور گھر کیسا؟ تب تو میں ہوسٹل میں رہتی تھی۔

''ہاں ٹھیک ہے، ہوسٹل میں تھی لیکن انارکلی تو اکثر آنا ہوتا تھا۔ انارکلی سے گھر جاتے ہوئے۔۔۔'' میرا ذہن پھر بھٹک جاتا ہے۔

مجھے اپنی الجھن پر الجھن ہونے لگتی ہے اور میں جھلا کر اپنی سوچ کو جھٹک دیتی ہوں۔

''اچھا چلو، جو بھی ہے، میں ان راستوں سے تو کئی بار گزری ہوں۔ میں ضرور گھر پہنچ جاؤں گی''۔

میں خود کو تسلی دیتی ہوں۔ لیکن دل میں خدشہ سا ہونے لگا ہے اس لیے میں گلی کو خوب اچھی طرح، غور غور سے دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کرتی ہوں۔

کبھی دائیں اور کبھی بائیں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ گلی پہلے کی نسبت تنگ ہوتی جا رہی ہے اور دونوں طرف کی دکانیں اوپر چڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔ میں گھبرا کر نیچے دیکھنے لگتی ہوں، فرش پر پتھر بھی اکھڑ اکھڑ کر باہر نکل رہے ہیں۔ اونچے نیچے، غیر ہموار، گندگی سے لتھڑے ہوئے کالے کالے پتھر۔ جن سے کسی کو بھی ٹھوکر لگ سکتی ہے۔

''غریب لوگ یہاں کیسے گزارا کرتے ہیں''۔

ایک اچٹتا ہوا خیال میرے ذہن سے ٹکرا کر گزرتا ہے اور مجھے خود پر شرم آتی ہے۔

''مجھے آج برسوں بعد اس گلی سے گزرنا پڑا ہے تو میں کیسے جھلا رہی ہوں۔ یہ غریب لوگ، جو یہیں رہتے ہیں، یہیں جیتے مرتے ہیں، ان کے بچے انھی فرشوں پر کھیل کھیل کر بڑے ہو جاتے ہیں، ان کے جنازے انہی گلیوں سے نکلتے ہیں۔''

ساتھ ہی مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے کتنی آسانی سے خود کو ان غریب لوگوں سے جدا کر لیا ہے۔ ''غریب لوگ'' کہہ کر میرے اندر اپنی بڑائی کا، ان سے الگ ہونے کا، برتر ہونے کا جو طمانیت بھرا احساس پیدا ہوا ہے، اس کا تعفن میرے وجود کا حصہ بن گیا ہے۔

''میں خود بھی کبھی انھی گلیوں کا روڑا تھی''۔

میں اس تعفن کو جھاڑنے کی ندامت بھری مگر ناکام کوشش کرتی ہوں۔

میرا دل بھر آتا ہے اور میں گلی کی دونوں سمتوں میں بے ترتیبی سے بنی ہوئی چھوٹی بڑی دکانوں کو دیکھنے لگتی ہوں۔ سب کے اندرونی منظر ایک سے تاریک ہیں۔ بجلی کے، مکھیوں کے فضلے سے اٹے ہوئے، تاروں سے لٹکے ہوئے چالیس واٹ کے بلب، جن کی پیلی پیلی روشنی، ڈھلتے دن کی اداس کرنوں کے ساتھ مل کر ایک مایوس کن ماحول پیدا کر رہی ہے۔۔۔ کسی جعلی عامل یا جادوگر کی کوٹھڑی

''چہارسُو''

جیسا۔۔۔جس میں ہڈیوں کے جلنے کی آواز اور گوشت کے سڑنے کی بو ہوتی ہے۔

میں دیکھتی ہوں ایک دکان پر بان کی رسیاں پڑی ہیں۔ کچھ گولوں کی شکل میں لپٹی ہوئی، کچھ بڑے بڑے لچھوں کی صورت میں۔ دکاندار ایک موٹی توند والا آدمی ہے جس نے مٹ میلا سا سفید کرتا پہن رکھا ہے اور وہ ایک ہاتھ میں بان کی رسی کا لچھا پکڑے ہوئے ہے دوسرے ہاتھ میں گولا۔ پتا نہیں وہ گولے کا لچھا بنا رہا ہے یا لچھے کا گولہ۔ مجھے کچھ ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا لیکن اس کی شکل دیکھ کر کوئی ناگوار سا احساس مجھے اپنی اندر باؤ گولے کی صورت اٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ میں منہ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگتی ہوں۔

ایک تیلی کی دکان نظر آتی ہے۔ کالے کالے پیپوں میں کالا کالا تیل۔ وہ ایک پیپے کو الٹ کر اس کا تیل شیشے کی ایک تنگ بوتل میں ڈال رہا ہے۔ بوتل کے منہ پر سلور کی قیف پڑی ہے جو کبھی سفید ہوتی ہوگی لیکن اب بالکل کالی ہو چکی ہے۔ میں اس منظر میں محو ہو جاتی ہوں۔ پورے دھیان کے ساتھ۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ ابھی سارا پیپا الٹ جائے گا اور تیل زمین پر بہہ جائے گا۔ میں احتیاطاً اپنی سانس روک لیتی ہوں اور کافی دیر تک روکے رکھتی ہوں۔ پھر اچانک میرا دم گھٹنے لگتا ہے تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ تیل کا پیپا میں نہیں، تیلی الٹ رہا ہے۔ میرے سانس روکنے سے تیل کا بہہ جانا رک نہیں سکتا۔ میں یہ مشقت نما احتیاط بلاوجہ کر رہی تھی۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگتا ہے۔ میں یوں ہی اپنے ساتھ ظلم کرنے کی عادی ہوں۔ دوسروں کی زندگیاں خود پر بتا بتا کر میں نے خود کو وقت سے بہت پہلے بوڑھا کر لیا ہے۔ اسی لیے میں زندگی کے لطف سے محروم ہو گئی ہوں۔ زندگی جو ایک ہی دفعہ ملتی ہے، اسے بھرپور طریقے سے جینا تو چاہیے۔ میں یوں ہی دوسروں کی فکر کرتے کرتے اپنے جینے کا عمل بے لطف کرتی رہتی ہوں۔

مجھ پر ایک بیزار کن مایوسی اور بے دلی سی چھا جاتی ہے۔ گلی کچھ اور تنگ ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ میں اپنے قدم اور تیز کر دیتی ہوں اور خود کو یقین دلاتی ہوں کہ ابھی ادھر سے مڑ کر ایک دو گلیاں اور ہوں گی، پھر گھر آ جائے گا۔ یہ گلی بس ختم ہونے کو ہے۔

سامنے ایک گھر یا دکان کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ لوگ کچھ زیادہ ہو گئے ہیں۔ مجھے اپنے جسم پر نظروں کے پتھر برستے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، میں سر اٹھا کر دیکھتی ہوں، بہت سے لوگ کھڑے شور مچا رہے ہیں۔ شاید لینٹر ڈالا جا رہا ہے۔ سیمنٹ کی بھری ہوئی تغاریاں اٹھا اٹھا کر اوپر پہنچائی جا رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ اونچی آواز میں قہقہے لگ رہے ہیں۔ مزدور پیشہ لوگ قہقہے لگا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں سیمنٹ کی تغاریاں ہیں، ان کے اردگرد گیلی اینٹوں کے ڈھیر ہیں۔ ایک طرف گلی میں سریہ پڑا ہے۔ لمبے لمبے نیزے گلی میں بچھ گئے ہیں اور وہ زور زور سے ہنس رہے ہیں۔

کس پر ہنس رہے ہیں؟

مجھ پر؟

میں جوا کیلی یہاں سے گزر رہی ہوں۔

میں جوا ایک عورت ہوں۔

ایک عورت جوا کیلی اس وقت گلی سے گزر رہی ہے۔

ہاہاہا

یہ عورت ضرور کوئی۔۔۔

شاید وہ ایک دوسرے کو آنکھ مارتے ہیں اور قہقہے لگاتے ہیں۔ میری خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے۔ میں اندر سے لرزنے لگتی ہوں اور قدم تیز کر دیتی ہوں لیکن گلی فوراً ختم ہو جاتی ہے۔ اور ختم ہونے سے ذرا پہلے ایک اور گلی کا سرا اس میں کھلتا دکھائی دیتا ہے۔ میں تیزی اور قدرے بدحواسی سے اس گلی میں داخل ہو جاتی ہوں۔

یہ دوسری گلی ٹیڑھی میڑھی اور چھوٹی سی ہے۔ بالکل سامنے کُب نکالتی ہوئی دائیں ہاتھ کو مڑتی ہے۔ لیکن مجھے بالکل اجنبی محسوس ہوتی ہے۔ اس گلی سے مانوسیت کی کوئی لہر نہیں اٹھتی۔ کچھ بھی جانا پہچانا نہیں۔ نیم جانا پہچانا بھی نہیں۔ ایک دم اجنبی۔

تو کیا میں راستہ بھول گئی ہوں؟

یہ خیال پہلی بار میرے شعور سے ٹکراتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ یہ خیال پہلے بھی میرے ذہن میں موجود تھا لیکن میں اسے اپنے شعور میں آنے سے روک رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ میں راستہ بھول رہی ہوں لیکن میں خود کو یہ فریب دینا چاہتی تھی، کہ مجھے راستہ معلوم ہے۔

ٹیڑھی میڑھی گلی میں کوئی چیز بھی جانی پہچانی نہیں لگ رہی۔ میں ایک لمحے کے لیے رک کر ادھر ادھر دیکھتی ہوں۔

اب کیا کروں؟

واپس جاؤں یا اسی گلی میں آگے بڑھ جاؤں؟ کہیں نہ کہیں سے تو راستہ مل ہی جائے گا۔

لیکن اگر دائیں مڑنے والی گلی بند ہوئی تو؟

مجھے یاد آتا ہے کہ ان علاقوں میں گلیاں کتنی پر پیچ اور گمراہ کن ہوتی ہیں۔ مغرب کی طرف مڑو تو مشرق کی طرف لے جاتی ہیں، کہیں میں کسی اور ہی سمت میں نہ نکل جاؤں؟

کس سمت میں؟ دنیا میں بس چار ہی سمتیں ہیں کیا؟ کوئی اور سمت ہوتی تو کس طرف ہوتی؟

ایک فلسفیانہ سا خیال شریر ضدی بچے کی طرح میرے ذہن سے سر نکالتا ہے اور میں بدمزاج ماں کی طرف اسے چپت مار کر واپس دھکیل دیتی ہوں۔

میں راستہ بھول گئی ہوں اور ادھر یہ ذہن کم بخت سمتوں کی تعداد اور ابعاد پر غور کرنے چلا ہے۔

مجھے اپنے ذہن پر غصہ آنے لگتا ہے جو ہمیشہ بے وقت، چوکس ہو جاتا ہے اور جب ضرورت ہوتی ہے تو کام نہیں آتا۔

''چہارسُو''

اب بتاؤ بھلا، مجھے یاد ہی نہیں آ رہا کہ کس طرف جانا تھا۔اب کیا کروں، اسی گلی میں چلتی جاؤں یا واپس ہو جاؤں؟ ہوسکتا ہے میں پہلے ہی غلط گلی میں داخل ہوگئی ہوں۔

مجھے واپس جا کر کسی دوسری گلی میں داخل ہونا ہو، جو گھر تک جاتی ہو۔

یہ کشمکش کے چند لمحے مجھ پر قیامت کی طرح بھاری ہوتے ہیں۔ فیصلہ کرنا مجھے ہمیشہ مشکل لگتا ہے۔ میری زندگی کی ناکامیوں کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں دو امکانات میں سے ایک کو چننے کا فیصلہ جلدی اور قطعیت سے نہیں کر سکتی۔ چنتی ایک کو ہوں اور دیکھتی دوسرے کو رہتی ہوں۔ خیر یہ تو میری شخصی کمزوری ہے، اللہ مجھے معاف کرے۔ کر ہی دے گا۔ اسی نے مجھے ایسا بنایا ہے لیکن اب کہاں جاؤں۔

میرا خیال ہے مجھے کسی سے پوچھ لینا چاہیے۔

مگر کس سے پوچھوں،

جو ذرا شریف دکھائی دیتا ہو، جو مجھے غلط نہ بتائے، جو میری طرف گندی نظروں سے نہ دیکھے،

آؤ میرے ساتھ آ جاؤ،'' کہتی غلیظ اور مکروہ نظریں، جو میرے جسم پر ایسے گرتی ہیں جیسے کسی نے پیشاب کی دھار ماردی ہو،

گرم گرم، بدبودار، پیلے پیشاب کی دھار۔

میرے اندر متلی ہونے لگتی ہے اور میں لڑکھڑانے لگتی ہوں۔

کس سے راستہ پوچھوں؟

مجھے یاد آتا ہے کہ گلی مڑنے سے پہلے بائیں ہاتھ ایک چائے والا نظر آیا تھا۔ سر پر گول ٹوپی اور گلے میں مٹیالا سا کرتا۔ وہ سلور کے پیالے کو ہاتھ میں پکڑے چائے اچھال رہا تھا اور بڑی توجہ سے اپنا کام کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ میرا گزرنا بھی اس کی نظر سے نہیں گزرا۔

چائے والے سے پوچھتی ہوں، اسے ضرور معلوم ہوگا۔

مجھے معلوم نہیں کہ میں نے چائے والے کو کیوں منتخب کیا؟ اس کی گول ٹوپی کی وجہ سے؟ اس کی اپنے کام میں محویت کی وجہ سے یا اس کی بے نیازی کی وجہ سے۔

واپس مڑ کر میں دوبارہ اسی پچھلی گلی میں داخل ہوتی ہوں۔

چائے والے کے پاس رک کر اس سے پوچھتی ہوں کہ یہ گلی مڑ کر کہاں نکلتی ہے؟

لیکن چائے والے کے جواب دینے سے پہلے ہی میرے اردگرد ایک ہجوم جمع ہو جاتا ہے۔ نوجوان شریر لڑکوں کا ہجوم۔

وہ سب دانت نکال رہے ہیں۔ مجھے راستہ بتا رہے ہیں لیکن ہر ایک الگ الگ راستہ بتاتا ہے۔ ان کے لہجے بتاتے ہیں کہ انھیں خود کچھ معلوم نہیں۔ وہ محض اپنی لاعلمی چھپا رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کے انداز میں اتنا تیقن ہے جیسے میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے زبردستی اس طرف لے جائے گا۔

سامنے ہی مزدوروں کا پورا جتھا جمع ہے۔ انھوں نے اپنا کام چھوڑ دیا ہے اور تغاریاں زمین پر رکھ کر سب ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھ رہے ہیں۔

اب میں واقعی گھبرا جاتی ہوں۔ میں اپنے لہجے کو درشت اور خود اعتماد بناتے ہوئے ڈانٹ ڈانٹ کر لڑکوں کو پیچھے ہٹنے کو کہتی ہوں۔ مگر وہ سب پوری طرح لطف اٹھانے کے موڈ میں ہیں۔

ایک نوجوان لڑکی۔۔۔

مگر میں تو اب نوجوان نہیں رہی۔ یہ عمر گزرے تو مدتیں ہوگئیں۔

اچھا تو ایک فیشن ایبل عورت۔۔

لیکن میں کہاں فیشن ایبل ہوں۔ میں تو۔۔۔

ہاہاہا۔۔۔ کٹے ہوئے بالوں والی بوڑھی عورت۔۔۔ جوان کے نرغے میں ہے اور ان سے راستہ پوچھ رہی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے اس انوکھے موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

میں چلّانے لگتی ہوں جس پر وہ اور ہنستے ہیں۔

میں بے بسی سے چائے والے کی طرف دیکھتی ہوں۔ وہ اسی بے نیازی سے پیالے سے چائے انڈیل رہا ہے۔

پھر میرے چلّانے پر وہ ایک طرف ہٹ جاتے ہیں اور میرا راستہ کھلا چھوڑ دیتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں، اچھا تو پھر جاؤ، جہاں جاتی ہو، دیکھتے ہیں ہم بھی، راستہ کیسے ملتا ہے۔

یہ بات وہ منہ سے نہیں کہتے مگر ان کے پورے وجود چلا رہے ہیں۔

ان کے باہر نکلے ہوئے دانت، ان کے چڑھے ہوئے ابرو، ان کے کرتوں کی الٹی ہوئی آستینیں، ان کے چہروں پر حظ اٹھانے کی خواہش۔

میں جلدی سے واپس اسی گلی میں مڑ جاتی ہوں اور ایک لمبا سانس لے کر نئے سرے سے یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

کیا میں پہلے کبھی اس گلی سے گزری ہوں؟

اگر میں یہاں سے آگے نکل جاؤں تو کس طرف کو مڑوں کہ گھر تک پہنچ جاؤں؟

لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

اوفوہ! میں ٹیکسی کیوں نہ لے لوں؟ اوہ میرے خدا، یہ خیال پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟ میں ایک لمبا سانس لیکر اپنی بدحواسی کو کوستی ہوں۔

ہاں ٹھیک ہے، میں ٹیکسی لے لیتی ہوں۔

میں ادھر ادھر دیکھتی ہوں؛ کہیں کوئی ٹیکسی نظر نہیں آتی۔

ان گلیوں میں ٹیکسی کہاں سے آئے گی۔ ٹیکسی تو یہاں سے گزر ہی نہیں سکتی۔

اچھا تو پھر رکشا؟

ہاں رکشا تو یہاں سے گزرتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک رکشا گزرا تھا اور اسے جگہ دینے کے لیے مجھے ایک دکان کی دیوار کے ساتھ جڑ کر کھڑا ہونا پڑا تھا۔

باقی صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیجیے

مکھوٹا

(ناول کا باب)

نجیبہ عارف

کلینک کا دروازہ آہستہ سے بھیڑ کر اس نے دایاں ہاتھ ریلنگ پر رکھا اور رک رک کر، سیڑھیاں اترنے لگی۔ ہر زینے پر دونوں قدم رکھتے ہوئے، بہت آہستگی سے، بالکل بے آواز، کسی مکمل بے دھیانی میں، ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کی کسی حالت میں، عدم اور وجود کے برزخ پر۔

آخری زینے کے بعد بیرونی دروازہ تھا جس کے شیشوں کے پار سے سورج کی سنہری شعاعوں کا رنگ جھلملا رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر ان شعاعوں کو دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ باہر کی روشنی نے زینے کے نیم تاریک ماحول کو اور بھی تاریک بنا دیا تھا۔ اس نے ایک لمحہ رک کر عادت کے مطابق کچھ سوچنا چاہا لیکن پھر بغیر کچھ سوچے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

عصر کا وقت آن پہنچا تھا۔

وَ الْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔

نجانے کہاں سے یہ بھولے بسرے لفظ اس کے ذہن کے پردے پر روشن ہوتے گئے۔

اس نے ایک لمبی سانس لی اور ہاتھ میں پکڑے بڑے سے خاکی لفافے کو دیوار سے لگے ہوئے کوڑے کے ڈرم میں ڈال دیا۔ پھر دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے پر رگڑا، جیسے اس بات کا اعلان کر رہی ہو کہ اس نے اپنا دامن جھاڑ دیا ہے۔

کلائی اٹھا کر گھڑی میں وقت دیکھا؛ سہ پہر کے تین بجے تھے۔ ستمبر کے مہینے کی زرد زرد ہوا چل رہی تھی۔ ہلکی ہلکی خنکی، ہلکی ہلکی تپش، خزاں کی بڑی مکارسی سستی، ایک غیر محسوس سا بوجھل پن جیسے دلھن کا لمبا عروسی لباس، اس کے پیچھے پیچھے، آہستہ آہستہ گھسٹتا جاتا ہو۔ بہت اہم مگر اتنا ہی بے وقعت۔ اسے وقت کے گھسٹنے کا احساس ہوا، بلکہ آواز تک سنائی دی۔

گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح چھلانگ لگاتی ہوئی آواز نہیں، سوکھے پتوں کے ہوا میں اڑنے کی مسلسل، لمبی سی آواز، جھاڑیوں میں سے آتی ہوئی سانپ کی پھنکار جیسی، لمبی لکیر کی صورت چلتی چلی جاتی ہوئی، جیسے وہ کبھی نہ رکنے والی ہو۔ حالانکہ اس کے کچھ دیر رک جانے کی خواہش بہت دور کہیں گہرائی میں پھن اٹھانا چاہتی ہو۔۔۔ شعور کی سطح سے بہت نیچے۔۔۔ جسے دیکھنا، چھونا اور روک لینا بس میں نہ ہو۔ بس اس سے آنکھیں چرائی جا سکتی ہوں۔

اس مکمل خلا میں نہ جانے کتنی دیر بیت گئی۔

اسے تو یوں لگا جیسے ایک زمانہ ہو، لیکن گھڑی تو صرف چند ثانیے ہی آگے بڑھی تھی۔

ایک جھٹکے سے وہ اس کیفیت سے باہر نکل آئی۔

اس نے ایک نظر کوڑے کے ڈرم میں پڑی میڈیکل رپورٹوں، ڈاکٹر کے نسخوں اور تشخیص ناموں پر ڈالی اور خود سے پوچھا۔

میں کہاں ہوں؟

اب کہاں جاؤں؟

کیا کروں؟

سامنے ایک مصروف شاہراہ کا منظر یکا یک اجاگر ہونے لگا۔ بڑی بڑی ڈبل ڈیکر بسیں، ہجوم کی وجہ سے رینگ رینگ کر چلتی ہوئی گاڑیاں، فٹ پاتھ پر تیزی سے ایک دوسرے سے بچ بچ کر نکلتے ہوئے انسانی جسم، دکانوں کے شوکیسوں میں لگی ہوئی سجاوٹیں، دکان داروں کے منتظر چہرے، ممکنہ خریداروں کی للچائی ہوئی نظریں، بڑے بڑے ڈگ بھرتے مرد اور عورتیں، بسوں میں چڑھتے اترتے مسافر، جنھیں کہیں نہ کہیں پہنچنے کی جلدی ہو، گھڑی کی ٹک ٹک سے بندھے ہوئے۔۔۔ ٹک ٹک ٹک۔۔۔ ٹک ٹک ٹک۔۔۔ ٹک ٹک ٹک۔۔۔

اس نے بھی بے اختیار اپنی کلائی کی طرف دیکھا جیسے کلائی پر گھڑی نہ ہو، کسی بم کا ٹائمر ہو۔۔۔ جو ایک ایک ثانیہ کم ہونے کا اعلان کر رہا ہو۔ ایک پل کو تو وہ بوکھلا گئی۔۔۔ جیسے بم پھٹنے ہی والا ہو۔۔۔ پھر اس نے خود کو شانت کیا۔

اب بم پھٹ بھی جائے تو کیا ہے۔۔۔۔

سامنے ہی ۲۷ نمبر بس کا سٹاپ تھا۔ ابھی وہ اسی بس میں بیٹھ کر کلینک آئی تھی۔ اس نے بائیں سمت دیکھا، دور سے بس کی پیشانی ابھرتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ سٹاپ پر بنی چھوٹی سی قطار میں کھڑی ہو گئی۔ بس میں سوار ہو کر اس نے اپنا ٹریول کارڈ ٹکٹ مشین کی درز میں ڈالا اور سوچا کہ کارڈ کا بیلنس کم رہ گیا ہے، ٹاپ اپ کروا لینا چاہیے۔ پھر خیال آیا، کہ اب شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔ یہ دوسرا خیال اتنا سادہ نہیں تھا، ایک دھچکے کی طرح تھا۔ اس نے بہادری سے اس دھچکے کو سہا اور ایک خالی سیٹ پر خالی الذہن ہو کر بیٹھ گئی۔

بس چلتی رہی لیکن اس نے اپنی عادت کے برخلاف اپنی خالی الذہنی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور کچھ بھی سوچنے سے گریز کیا۔

۱۸

بس تھوڑی دیر بعد ہی شہر کی ہماہمی سے نکل آئی تھی اور مضافاتی علاقوں کی سرسبز کشادگی میں داخل ہو گئی تھی۔ سڑک پر ٹریفک کا بہاؤ کم ہو گیا تھا اور بس کے اندر اور باہر شور تقریباً نابود ہو گیا تھا۔ تقریباً پون گھنٹے کی مسافت کے بعد، بس اپنے آخری سٹاپ پہ پہنچی تو اس نے دونوں ہاتھ اپنے سمرکوٹ کی جیب میں ڈالے اور بس سے اتر آئی۔

سامنے ہی ایک چھوٹی سی سبز ڈھلوان تھی جس پر رنگ برنگے پتوں کی پتنگیں سی ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ سیکامور کی پھیلی ہوئی شاخوں پر پھڑپھڑاتے ہوئے زرد، نارنجی اور آتشی گلابی، کٹاؤدار پتے۔

وہ سیکامور کے پاس پاس اگے درختوں کے گھنے جھنڈ سے رستہ بناتی بڑھتی گئی یہاں تک کہ ڈھلان کے اوپر پہنچ گئی۔ سیکامور کے درخت یہاں تک نہیں آتے تھے۔ بس ہری کچور گھاس کا ایک چھوٹا سا قطعہ تھا جس کے دوسری طرف ایک ترچھی ڈھلوان تھی جو دور تک جاتی تھی اور سیدھی سمندر میں گرتی تھی۔ ڈھلوان کے عین اوپر ایک چھوٹی سی جھاڑی تھی۔۔۔ بالکل تنہا۔۔۔ جس کے پتوں کا رنگ گہرا سرخ تھا۔ گھاس کے سرسبز میدان میں کسی فلیگ پول کی طرح نمایاں اور سربلند۔ اس نے شاہراہ کی طرف پشت کرلی اور اس جھاڑی سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

چند لمحے کی خاموش بے توجہی کے بعد اس نے آنکھیں کھول کر ڈھلوان کی طرف دیکھا تو ایک عجیب منظر نظر آیا۔

اس نے آنکھیں ملیں اور دوبارہ غور سے ڈھلوان کو دیکھنے لگی۔ منظر غائب ہوگیا تھا۔

اس نے پھر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا لیکن اس بار بھی وہی ہوا۔ اب کے منظر ساکت نہیں تھا، اس میں آوازیں بھی تھیں اور حرکت بھی۔

''کیا یہ کوئی التباس ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا؟

''کیا میرا ذہن کام کرنا چھوڑ رہا ہے؟''

''کیا شعور پر میری گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے؟''

''کیا ''وقت'' آگیا ہے؟''

اس کے ذہن میں ڈاکٹر کی آواز گونجی۔

''وہ وقت کبھی بھی آسکتا ہے! آج رات، کل صبح، پرسوں شام، اگلے ہفتے، کبھی بھی۔۔۔''

''کبھی بھی۔۔ ٹھیک ہے۔۔ مگر زیادہ سے زیادہ کتنی دیر۔۔۔'' اس نے سکون اور ٹھہراؤ سے پوچھا تھا۔

ڈاکٹر اس کے لہجے کے سکون سے متاثر ہوا اور میز پر دھرے اس کے ہاتھ کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے چونک کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ ابھی اس نے انجانے میں اس کی کتنی پرانی یاد، کیسی متروک آرزو کو زندہ کردیا تھا۔

''دو ہفتے!'' اس نے نرمی اور آہستگی سے کہا۔ وہ اپنے ہاتھ پر اس کے لمس کی گرمی محسوس کررہی تھی۔

''دو ہفتے؟ یعنی چودہ دن؟ بہت ہیں!''

اس نے زندہ دلی سے مسکرانے کی کوشش کی۔ پھر دل میں سوچا،

''اب کسی دکھاوے کی ضرورت تو نہیں!''

لیکن پھر اسے محسوس ہوا کہ عمر بھر کی عادت سے نجات پانا ممکن نہ تھا۔ اس نے مسکرا کر ڈاکٹر کو دیکھا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ، ڈاکٹر صاحب!''

ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور بہت گہری ہم دردی سے اسے دیکھا۔ اس کے پاس لفظ ختم ہو چکے تھے، صرف اس کا لمس بول رہا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے وہ بھی چپ ہوگیا۔ ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر سے اٹھا لیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ڈاکٹر بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا اور اسے رخصت کرنے دروازے تک آیا۔

Have a good day my dear!، یہ ڈاکٹر کے آخری الفاظ تھے جو اس نے سنے۔

لیکن اب وہ کلینک سے باہر نکل آئی تھی اور مسکرانے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔

۱۹

سورج اس کے بالکل سامنے سمندر میں اتر رہا تھا اور اس کا سنہری پن دور دور تک اچھل رہا تھا۔ پانی کی نیلاہٹ میں کئی رنگ گھل مل گئے تھے۔

''سورج روز اس سمندر میں ڈوبتا ہے''، اس نے اطمینان سے سوچا،

''اور پھر اگلے روز دوبارہ طلوع ہوجاتا ہے۔۔۔ لیکن میں۔۔۔ کیا میں بھی دوبارہ یہاں آسکوں گی؟''

اس نے آخر کار اپنی خالی الذہنی سے رخصت طلب کرلی۔

''عین ممکن ہے، میں بھی سورج کی طرح دوبارہ، اس دنیا میں طلوع ہوسکوں۔ یہاں، اس ڈھلوان پر بیٹھ کر پھر سے ستمبر کی خنک خنک سی تپش میں سستی سے آنکھیں موند کر پڑی رہ سکوں اور ڈھلوان پر بکھری ہوئی دنیا کو پھر سے لمحہ لمحہ کر کے جی سکوں۔۔۔

یا پھر یہاں نہیں، کہیں اور۔۔۔

کہیں اور کہاں؟

کہیں بھی۔۔۔

مثلاً افریقہ کے کسی جنگلی قبیلے کی حبس زدہ جھونپڑی میں۔

یا آرکٹک کے کسی دور دراز اگلو میں،

یا صحارا کے کسی نخلستانی پڑاؤ میں،

یا یہیں کہیں یورپ کے کسی مضافاتی علاقے کی سرد مہر خاموشی میں

یا پھر

وہیں،

اُسی شہر،

اُسی ماحول،

اُسی ریتلی فضا میں۔۔۔''

''تو کیا میں اسی شعور کے ساتھ واپس آسکتی ہوں؟ انھی یادوں، انھی تجربوں کی روشنی ساتھ لے کر؟''

اس نے ڈوبنے والے کی طرح آخری بار ہاتھ پاؤں مارنے کی کی کوشش کی۔

''نہیں، یہ روشنی ساتھ نہیں آتی، یہ ہر بار نئے سرے سے کمانی پڑتی ہے''۔

اسے ایک گونجتی ہوئی آواز سنائی دی جو کسی گہرے کنویں کی تاریکی سے اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''نئے سرے سے؟ ایک بار پھر؟ ان سارے لمحوں کو بتانے کی ریاضت، ان تمام سانسوں کی مشقت، ان سب دنوں اور راتوں کی مسافت؟''

تھکن کا گہرا احساس اس پر غالب آ گیا۔

ہاتھ سے چھوٹتی ہوئی دنیا کے رنگ اسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے لیکن تھکن سے مغلوب ہو کر اس نے ہر کوشش ترک کر دی اور بازو اور ٹانگیں پھیلا کر گھاس پر لیٹ گئی۔

آنکھیں بند کر کے اس نے پرسکون ہونے کی کوشش کی۔

ایک۔۔۔دو۔۔۔تین۔۔۔چار۔۔۔پانچ۔۔۔

نجانے کتنے لمحے اسی سکوت اور ٹھہراؤ کی حالت میں گزر گئے۔

اچانک گھاس پر، سر سے اوپر، اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے روئیں کھڑے ہو گئے اور کسی مدھم سی سانس نے اسے چھوا۔ غیر ارادی طور پر اس نے بازو کھینچ لیے اور سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔

ایک ننھی سی گلہری کی سلیٹی دھاری دار دم جھاڑی کے تنے کے دوسری طرف غائب ہوتی نظر آئی۔

وہ مسکرا دی۔ بغیر کسی شعوری کوشش کے، بغیر کسی دکھاوے کے، بغیر یہ سوچے کہ کوئی دیکھ رہا ہے۔

کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے دو چھوٹے چھوٹے اخروٹ نکالے اور اپنی آنکھوں کی سیدھ میں،

جھاڑی کے تنے کے قریب رکھ دیے۔

تھوڑی ہی دیر میں گلہری نیچے اتر آئی اور اخروٹ کترنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی گول گول آنکھوں سے اسے دیکھتی بھی جاتی تھی۔ وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔۔۔مٹی کے مادھو کی طرح۔ کسی لاش کے مانند۔ کسی ایسے وجود کی طرح جو کبھی زندہ نہ رہا ہو۔ جس نے کبھی حرکت نہ کی ہو، جس نے کبھی سانس تک نہ لی ہو۔

''یہ وجود، یوں ہی پڑا رہے گا۔۔۔بے حس و حرکت۔۔۔جیسے اب ہے۔۔۔تو میں کہاں ہوں گی؟

اسی وجود کے اندر یا کہیں اور؟

باہر اس کھلی فضا میں؟

کیا میرے ہونے کا احساس باقی رہے گا یا یہ احساس بھی بکھر جائے گا؟

کیا اس احساس کو کوئی اور وجود میسر آئے گا یا نہیں؟

اس نے گھاس پر بکھرے ہوئے اپنے وجود کو ایسے دیکھا جیسے وہ خود اس سے باہر ہو۔

اپنے وجود سے باہر نکلنے کا تجربہ عجیب تھا۔

اسے عجیب و غریب آزادی کا احساس ہوا اور یہ خیال آیا کہ وہ اپنے لیے کوئی بھی وجود منتخب کر سکتی ہے۔

گلہری نے نتھنے پھڑپھڑائے تو وہ بے ارادہ اور آہستگی سے جیسے اس کے جسم میں داخل ہو گئی۔

اوپر درخت کے تنے میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا، جہاں اس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے اس کے منتظر تھے۔ ماں کے نرم نرم لمس میں ان کی مسرت کا جہان پوشیدہ تھا۔ کترے ہوئے اخروٹ کا گودا ماں کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا اور وہ اسے اپنے بچوں کے منہ میں ڈال رہی تھی۔ اسے زندگی کا حاصل مل چکا تھا۔ بچے اخروٹ کا گودا چبا رہے تھے۔ وہ اپنی دم پھیلا کر سوکھے ہوئے پتوں اور تنکوں کے فرش پر لیٹ گئی اور کامل سکون کے اس لمحے کو محسوس کرنے لگی جو اپنے بچوں کو ایک محفوظ گھونسلے میں غذا فراہم کرنے کے بعد اس پر اتر آیا تھا۔ اس جھاڑی میں کوئی سانپ نہیں رہتا تھا۔ اس کے سامنے مستقبل کا کوئی لائحۂ عمل نہیں تھا، کوئی منصوبہ، کوئی خواب، کوئی ڈیڈ لائن نہیں۔ وہ آزاد تھی۔ زندگی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہنے کے لیے بالکل آزاد۔ ماضی کا کوئی آزار، مستقبل کا کوئی اندیشہ اسے اندر سے کھرچتا اور کم کرتا ہوا محسوس نہیں ہوتا تھا۔

''تو اگر مجھے اگلی بار گلہری بھی بننا پڑے تو کیا مضائقہ ہے!''

تنے سے لپٹ کر نیچے اترتے ہوئے اس نے سوچا۔

اس کا وجود ابھی تک گھاس پر یوں ہی پھیلا ہوا تھا۔ سمندر میں اترتے سورج کے بالمقابل۔ سبز گھاس کے فرش پر، بانہیں سر سے اوپر پھیلی ہوئیں، پاؤں کا رخ نیچے کی طرف۔

وہ اپنے ہی پہلو میں سیدھی کھڑی ہو گئی اور جھک کر اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔

یہ چہرہ، اس نے کتنی بار دیکھا تھا۔ کتنے برس، ہر روز، دن میں کئی کئی بار۔ سنگھار میز کے بڑے آئینے میں، پرس میں پڑے ہوئے چھوٹے سے گول آئینے میں، اندھیرے میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے شیشے میں، گاڑی کی سن سکرین کی پشت پر لگے چھوٹے سے مستطیل آئینے کے ٹکڑے میں، کتنی ہی ندیوں کے شفاف پانیوں کی سطح پر۔ بچپن سے لے کر اب تک۔

تب بھی جب وہ اس سے نفرت کرتی تھی اور آئینے میں اسے دیکھ کر اسے خود سے کھرچ ڈالنا چاہتی تھی۔

تب بھی جب اس نے اپنے تئیں اسے قابلِ قبول بنا لیا تھا اور یہ سمجھنے لگی تھی کہ اب اس کا چہرہ دوسروں کے لیے دلکش ہو گیا ہے۔

اور تب بھی جب اس نے اپنے چہرے سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اچھا، یا برا، وہ اس کا چہرہ تھا، اس کی شناخت تھی۔

اس چہرے میں آنے والی ہر تبدیلی کو اس نے لحہ بہ لحہ دیکھا اور سہا تھا۔

اب، جب یہ مسافت ختم ہونے کو تھی اور یہ شناخت مٹ جانے والی تھی، تو اسے اپنے چہرے میں ایک عجیب بات نظر آئی، جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا چہرہ ایک کھوپڑی کے ڈھانچے میں بھری ہوئی

گوشت کی فلنگ کے سوا کچھ بھی نہیں۔کھوپڑی کے ڈھانچے تو کم وبیش سبھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔کم از کم کسی غیر ماہر، عام آدمی کے لیے تو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔سارا فرق تو اس فلنگ سے پڑتا ہے، کہاں کم ہے، کہاں زیادہ، کہاں گہرائی ہے، کہاں اونچائی۔یہ سب پیمانے جن سے حسن کی پیمائش ہوتی رہی، یہ سب معیار جن پر پورا اترنے کے لیے کس قدر تگ ودو کی تھی، ان سب سے کیا فرق پڑتا ہے؟

لیکن ان سے کتنا فرق پڑتا ہے۔اس نے یکا یک پیچھے مڑ کر دیکھا، ان سے کتنا فرق پڑا تھا۔

اگر یہ فرق نہ پڑتا تو اس کی زندگی کا ڈھب کتنا مختلف ہوسکتا تھا۔

یہ بات اس کے ادراک پر یوں بجلی کے جھماکے کی طرح روشن ہوئی کہ وہ سُن ہوگئی۔

وہ سب باتیں، جو اس کی زندگی کے نشیب وفراز کا تعین کرتی رہی تھیں، سب کی سب اتنی ہی بے معنی تھیں کیا؟

اتنی ہی غیر اہم۔۔۔جیسے کوئی مکھی، جو پل پھر کو آنکھوں کے سامنے لہرائے اور پھر غائب ہوجائے۔

وجود کی یہ ساری آویزش، خود اپنے آپ سے جنگ کے یہ سب مرحلے، کس لیے تھے۔

اور کچھ بھی حاصل نہیں تھا تو جینے کی اتنی ہوس کیوں تھی۔

اس ہوس سے آزاد ہوجانا ہی تو اصل زندگی تھی۔

اصل زندگی کا ذائقہ اس کے لبوں سے اترا اور وجود کے ریشے ریشے میں پھیل گیا۔

بقیہ : جھوٹی کہانی

اچھا تو میں رکشا لے لیتی ہوں۔

اب مجھے کچھ اطمینان ہوتا ہے اور میں دائیں کندھے سے لٹکے اپنے بیگ کو کھول کر دیکھتی ہوں۔میرا بٹوہ؟

میں گھبرا کر دوبارہ بیگ میں جھانکتی ہوں۔

بٹوہ کہاں گیا؟ پیسے تو اسی میں تھے۔

مجھے یاد آتا ہے وہ تو میں نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ہاں، وہ ہاتھ میں ہی تھا۔جب میں ان شریر لڑکوں سے بات کر رہی تھی۔

میں جلدی سے اپنے ہاتھ کھول کر دیکھتی ہوں۔گھبراہٹ میں اپنے کپڑے جھاڑتی ہوں۔

دونوں ہاتھ خالی ہیں۔کپڑوں سے بھی کوئی برآمدگی نہیں ہوتی۔

اچھا چلو کوئی بات نہیں، میں گھر جا کر رکشے والے کا کرایہ ادا کردوں گی۔میں خود کو اطمینان دلاتی ہوں اور اس بات پر خود کو شاباش دیتی ہوں کہ میرا ذہن ہر مشکل میں کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ ہی نکالتا ہے۔

اچھا تو اب کوئی خالی رکشا ڈھونڈتے ہیں۔تاکہ میں مغرب کی اذان سے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔

روزہ کھلنے سے پہلے پہلے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ آج تو میرا روزہ ہے۔

لیکن اس یاد کے ساتھ ہی ایک اور خیال اچانک جست لگا کر عقب سے اچھلتا ہے اور میرے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ابھی اس گلی میں داخل ہونے سے پہلے میں جہاں بیٹھی تھی، وہاں تو میں نے پیٹ بھر کر کھایا پیا تھا؟

چائے، پکوڑے، پیٹیز، اور بھی بہت کچھ تھا۔میں صوفے پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گئی تھی اور جی بھر کر کھاتی پیتی رہی تھی۔

تو میرا روزہ ٹوٹ چکا ہے۔

میرا روزہ ضائع ہوگیا ہے۔

جیسے بچہ ضائع ہوجائے۔

روزے کے ٹوٹ جانے کا الم میرے اندر ایسے اترتا ہے جیسے شیشے کی بوتل میں گاڑھے گاڑھے تیل کی دھار۔دیواروں کے ساتھ ساتھ چپکتی ہوئی، پوری طرح لتھڑ جاتی ہوئی۔

اچانک گلی میں مغرب کی اذان گونجنے لگتی ہے۔

روزہ کھل گیا ہے۔

لیکن میرا روزہ تو ٹوٹ چکا ہے۔

اب گھر جانے کی جلدی کیا ہے۔

کلماتِ حسن

فرحان افتخار
(راولپنڈی)

نجیبہ عارف کی ایک ساتھ کئی کہانیاں پڑھنے کو ملیں۔ سب کی سب بہت خوب صورت ہیں۔ عنوانات ہی دیکھ لیجیے ''جھوٹی کہانی''، ''صدیوں بھرا لمحہ''، ''سخت بے زمینی ہے'' اور ''اندیشۂ جاں تھا پہلے''۔ پہلی تین کہانیاں سنانے والی عورتیں ہیں۔ چوتھی کہانی ایک مرد سنا رہا ہے۔ ٹھہریے! ایک وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کہانی میں نے اس لیے پسند نہیں کی کہ اسے کوئی مرد سنا رہا ہے۔ یہ اس لیے اچھی لگی کہ مجھے اس کے بیانیے نے دوسری کہانیوں سے زیادہ گرفت میں لیا ہے۔ سبحان اللہ۔ میری دعا ہے کہ نجیبہ عارف اسی طرح اردو کہانی کو پُر مایہ کرتی رہیں۔

(اسد محمد خان)

نجیبہ عارف کے افسانے چلتے چلاتے پڑھنے کی چیز نہیں ہیں کہ لاہور سے کراچی کی اڑان میں پڑھا اور منزل آنے پر وہیں چھوڑ کر اُتر گئے کہ اگلا کوئی تنہا مسافر پڑھے گا یا اس ارادے کے ساتھ لیتے گئے کہ فرصت ملنے پر دوبارہ پڑھنے کی چیز ہے۔ کچھ سمجھ میں آئی، کچھ نہیں مگر ہے دل چسپ۔ نجیبہ عارف کے افسانوں میں مجھے ان کے دل چسپ ہونے کے وہ عنصر نظر نہیں آئے جو اردو کے مروجہ نسخوں میں پڑھنے میں آتے ہیں۔ ان کی تعداد چار یا پانچ ہے۔ خود گن لیجیے۔ نجیبہ عارف کا ذہنی سفر، جسن میں وہ پڑھنے والے سے پردہ نہیں کرتیں، نہ اس کی ضرورت ہے، کیفیات کا سفر ہے، جن سے ان کے کردار گزرے۔ کیا عورت اور کیا مرد۔ اور یہاں پڑھنے والا دوسروں سے نہ سہی، خود اپنے سے کہتا ہوا نظر آتا ہے: یہی حال میرا فلاں وقت ہوا تھا، یہی کیفیت میری تھی۔ جہاں نجیبہ عارف کے کرداروں کو ان کیفیتوں سے گزرنا پڑا نہ وہ جگہیں خیال ہیں، نہ کردار۔ وہ واقعات تک انوکھے نہیں ہیں جو انسان کو محبت بھرا دل رکھنے کے باوجود بعض لحاظ سے بے حس بنا دیتے ہیں۔

(حسن منظر)

نجیبہ عارف نے کمال ہنرمندی کے ساتھ قصیدے کی اصل لغت سے مکمل وفاداری کا اہتمام کیا ہے۔ عربی کے ہم قبیلہ لفظوں سے استفادہ اس ترجمے کی بڑی خوبی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ سادہ اور رواں زبان میں اصل قصیدے کی مجموعی فضا کو خوش اسلوبی سے منتقل کر دیا گیا ہے۔ عرفائے متجبین کا اجماع ہے کہ اللہ کریم جب کسی فرد کو اپنی نسبتِ خاص کے لیے پسند فرماتے ہیں تو پہل فرماتے ہوئے اول اول اس کے دل میں اپنے لیے محبت پیدا کرتے ہیں۔

(افتخار عارف)

اس منظوم ترجمہ کے مطالعے سے جو کیفیت بنی، آخر تک بڑھتی ہوئی حالت میں برقرار رہی۔ دل سے دعا نکلی کہ بارگاہِ رسالت میں قبولیت کی سند پانے والے قصیدے کا یہ ترجمہ بھی اللہ کو راضی، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو متبسم اور اہلِ دل کو سرشار کر دے۔

(احمد جاوید)

اس منظوم ترجمے کے کئی امتیازات ہیں۔ مجھے پہلے کے چند تراجم کے مقابلے میں یہ سعیِ جمیل متن کے زیادہ قریب بھی لگی اور زیادہ سلیس و رواں بھی۔ لکھنے کو تو یہ بات ایک مختصر سے جملے میں لکھ دی گئی ہے مگر واقفانِ کار جانتے ہیں کہ اس کڑے معیار تک پہنچنا کس قدر دشوار ہے۔ تائیدِ ایزدی شاملِ حال نہ ہو تو محض علم و فضل، صلاحیت، مہارت اور تجربے کے زور پر یہ چوٹی سر نہیں ہوا کرتی۔ اب یہاں یہ اشارہ بھی برمحل لگ رہا ہے کہ اس ترجمے میں سوز و گداز بھی زیادہ ہے اور لفظوں کی تہ میں کچھ اور بھی ہے، اچھا اچھا سا، جسے بیان کرنے کے لیے مجھے سرِ دست موزوں لفظ نہیں مل رہے۔ اقبال کے بہ قول: اصل اس کی نَے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نَے۔

(معین نظامی)

اخلاص، توفیق، تاثیر اور سرشاری۔ ان چار لفظوں کی گہری معنویت سے آگاہ ہونا ہو تو قصیدہ بردہ شریف کا یہ اردو ترجمہ پڑھ لیجیے۔ اخلاص نہ ہو تو ایسا کام سرانجام دینے کی توفیق عطا نہیں ہو سکتی۔ توفیق نہ ہو تو ایسی تاثیر نہیں پیدا ہوتی۔ اور یہی تاثیر ہے جو قاری کو سرشاری میں مبتلا کر دیتی ہے۔

(حارث خلیق)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کا زیرِ نظر منظوم ترجمہ منفرد مقام کا حامل ہے۔ وہ قائلِ قیل و قال نہیں، صاحبِ حال ہیں۔ قسّامِ ازل نے ان کے دوسرے امتیازات کے ساتھ یہ عظیم سعادت بھی ان کے لیے مقدر کی تھی کہ اس بابرکت قصیدے کو، جسے شفاالامراض اور دفع بلّیات کے وظیفے کی حیثیت حاصل رہی ہے، اردو میں تازہ شعری جامہ پہنائیں۔ عربی قصیدے کی روح کو کسی بھی اور زبان میں منتقل کرنا کارِ دشوار ہے مگر یہ ترجمہ زبان کی شستگی و ثروت مندی، تراکیب کی چستی اور صحتِ ابلاغِ معانی میں ممتاز ہے۔ جادۂ شوق کے راہ نورد اس ترجمے میں ادبی تلذّذ کے ساتھ ساتھ روحانی وجد و ابتہاج کی دہری کیفیت سے بہرہ اندوز ہوں گے۔

(ایس۔ ایم۔ زمان)

بطور ہندی مسلمان میری مذہبی جمالیات کی تشکیل میں مقامی رنگ اگر احمد رضا خان صاحب بریلوی کی کثیر لسانی نعت ''قصیدہ بردہ شریف'' کی صورت موجود ہے اور مجھے زمین سے جوڑتے ہوئے میرے خون میں گردش کرتی ہے تو قصیدہ بردہ اس کا ایک اور رنگ ہے جو میرے وجود میں ترفع کی نمائندگی کرتا ہے۔ حاملِ وحی سے میرے تعلق کو رفعت عطا کرتا ہے، صاحبِ معراجؐ سے میرے عشق کو عروج بخشتا ہے۔ پیدا ہوتے ہی میرے کان ان دونوں آوازوں سے مانوس ہوتے رہے، میری تہذیب اور مزاج کی تشکیل کرتے رہے۔ عربی زبان نہ جاننے کے باوجود مجھے اس کلام سے کبھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ حال ہی میں شائع ہونے والا ڈاکٹر نجیبہ عارف کا قصیدہ بردہ شریف کا منظوم ترجمہ، نوارِ کاظمہ کے نام سے پڑھنا گویا اس غیر موجود اجنبیت اور پہلے سے مانوس کو باضابطہ جاننے کا عمل ثابت ہوا۔

(شاہد اعوان)

اے ربِ سماوات

حمد باری تعالیٰ

یہ کون و مکاں 'کُن فیکوں' ہی کی عطا ہے
''اے ربِ سماوات، تری ذات وَرا ہے''

جو کچھ کہیں موجود سرِ ارض و سما ہے
ایمان ہمارا ہے کہ سب تیری عطا ہے

کچھ اورگلستاں میں ہے کیا تیرے علاوہ
ہر پھول میں، ہر خار میں تُو جلوہ نُما ہے

ہے تیری ہی تعمیل میں، جو کچھ ہے جہاں بھی
جینا ہے کہ مرنا ہے، ہَوا ہے کہ خَلا ہے

ہر جزو میں تُو جلوہ نُما ہوتا ہے ، لیکن
اب تک ترے کُل کا کسے ادراک ہوُا ہے !

تُو ہی نے گناہوں کی طرف جانے سے روکا
احساس رہا مجھ کو کہ تُو دیکھ رہا ہے

آغوش میں لے لے گی تری شانِ کریمی
مُجھ کو یہی ڈھارس ہے کہ تُو میرا خُدا ہے !

اِک روز سب اصنام بھی دیں گے یہ گواہی
مُسلم کا خدا ہے جو، ہمارا بھی خدا ہے

نسیم سحر (راولپنڈی)

نعت

رسولِ پاک تیری ذات کو ہزاروں سلام
کہ تیرے وصفِ سخن سے نصیحتوں سے تری

پیامِ امن و محبت تری دعاؤں سے
شعاعِ نور الٰہی سے آشکار ہوئے
جزائے عالمِ برزخ نجاتِ انسانی
ضیائے حسنِ صداقت سے ہمکنار ہوئے
دلوں میں جذبہء ایماں رگوں میں برق عمل
حیات وزیست کے رازوں سے آشکار ہوئے
بڑھائے ہاتھ جو اپنے لئے خدا کی طرف
جہاں کا درد لئے ہم بھی بے قرار ہوئے
رسول پاک ہراک سمت آندھیاں کیوں ہیں
تیرا کرم ہے مگر بدگمانیاں کیوں ہیں
ہزار فرقوں میں تقسیم ہے یہ دینِ حیات
زمیں پہ آج یہ شیطاں کی بانیاں کیوں ہیں
ہر ایک گام پہ خونی قزاق تیر بکف
صنم کدوں میں وہ زہریلے ناگ پھرتے ہیں
گرج رہے ہیں کہیں بم کہیں پہ شعلہء نار
پگھل رہی ہیں سِلیں یخ کے کوہساروں کی
چمن کے دھوکے میں دوزخ سے ہمکنار ہوئے
رہِ خدا میں ہر اک گام پر شکار ہوئے
کہیں پہ قید و سلاسِل نصیبِ دار ہوئے
ہرایک سمت سے تیروں کے ہم پہ وار ہوئے
جو اس جہان میں شاہوں کے بادشاہ ہوئے
وہ خاک میں جو دبے ہیں تو زارزار ہوئے

رسولِ پاک تیری ذات کو ہزاروں سلام
تری دعاؤں کو تیری نصیحتوں کو سلام

عارف نقوی (برلن)

''وجہِ لب''

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

میں اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر جانے کے لیے نکلا ہی تھا کہ برآمدے میں سارہ مل گئی۔

''ڈاکٹر ہاشم! آپ کو ڈاکٹر سلمان بلا رہے ہیں۔''

سارہ نے جو تیز تیز چلنے کی وجہ سے ہانپ رہی تھی، کہا۔

''کہاں ہیں ڈاکٹر سلمان؟'' میں نے پوچھا۔

''ایمرجنسی میں''

میں اور سارہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ایمرجنسی پہنچے۔ مجھے دیکھتے ہی ڈاکٹر سلمان بولے۔

''یار ابھی ابھی ایک ایکسیڈنٹ کا کیس آیا ہے۔ مریضہ کی حالت سیریئس لگتی ہے۔ تم دیکھ لو میں ان مریضوں کے ساتھ بہت مصروف ہوں۔'' میں وارڈ میں گیا ایک ضعیف العمر خاتون بہت زخمی تھیں۔ فرحین ان کے زخموں کو صاف کر رہی تھی۔ مریضہ بے ہوش تھی۔ میں نے ان کا معائنہ کیا اور فوری طور پر ڈرپ کے ذریعے دوائیں دینے کا انتظام کرنے لگا۔ سارہ میری مدد کر رہی تھی۔ اچانک پولیس انسپکٹر اندر آیا۔

''سر! مجھے مریضہ کا بیان لینا ہے۔'' پولیس انسپکٹر نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

''مریضہ کا بیان۔۔۔ آپ خود دیکھ لیجیے۔۔۔ کیا یہ بیان دے سکتی ہیں؟''

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مریضہ کو کتنی دیر میں ہوش آ جائے گا؟'' پولیس انسپکٹر نے پوچھا:

''کچھ کہا نہیں جا سکتا'' میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''او۔ کے سر! ہم باہر انتظار کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر پولیس انسپکٹر اور اس کا ساتھی سپاہی باہر جانے لگے تو سارہ نے انہیں روک کر مریضہ کا پرس دیتے ہوئے بتایا ''دو آدمی ان خاتون کو اپنی گاڑی میں لے کر آئے تھے، ایمرجنسی میں اندر تک ساتھ آئے اور یہ پرس بھی رکھ گئے۔ ہم نے اس پرس کو نہیں کھولا ہے۔ انسپکٹر پرس لے کر باہر چلا گیا۔ اتنے میں ڈاکٹر شمس داخل ہوئے ''سوری ڈاکٹر ہاشم میں لیٹ ہو گیا۔ اس اچانک ٹریفک جام نے بہت پریشان کیا ہے۔'' ڈاکٹر شمس نے اپنے لیٹ پہنچنے پر معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''اِٹس او کے یار'' کہہ کر میں نے مریضہ کے متعلق جو ٹریٹمنٹ وغیرہ اس کو دیا تھا سب کے بارے میں ڈاکٹر شمس کو بتایا اور پارکنگ کی طرف چلا۔ دیکھا برآمدے میں انسپکٹر اور اس کا ساتھی سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔

''آفیسر! آپ نے پرس چیک کر لیا، کسی رشتے دار وغیرہ کا فون، ایڈریس وغیرہ کچھ ملا۔۔۔ گھر والوں کو اطلاع وغیرہ۔۔۔'' میں نے پولیس انسپکٹر سے سوال کرنا مناسب سمجھا۔

''چیک بھی کر لیا۔ ہسپتال کے آفس کے عملے سے اس کے اندر کے سامان کی انونٹری بھی تیار کروالی۔'' انسپکٹر نے افسرانہ شان سے کہا۔

''یہ محترمہ سعدیہ ہمدانی ہیں۔ انہیں پورا شہر جانتا ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے'' انسپکٹر کے لہجے میں تعجب کی آمیزش تھی۔

پھر انسپکٹر نے سعدیہ ہمدانی کے بارے میں تھوڑی بہت تفصیل بتائی۔ ''آفیسر میں جا رہا ہوں، ڈیوٹی ڈاکٹر آ چکے ہیں آپ ان سے مریضہ کی حالت کے بارے میں معلوم کر سکتے ہیں'' یہ کہہ کر میں پارکنگ کی طرف نکل گیا۔

دوسرے روز ڈیوٹی انجام دے کر گھر جا رہا تھا کہ اچانک مجھے سعدیہ ہمدانی کا خیال آیا۔ میرے قدم خود بخود ایمرجنسی کی جانب اٹھ گئے۔ وارڈ میں جھانک کر دیکھا وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں۔ ان کے بیڈ کے ساتھ ہی کرسی پر وہ خاتون بیٹھی ہوئی تھیں جنہوں نے سعدیہ ہمدانی کے ساتھ ''مسکن'' کی ساری ذمہ داری سنبھالی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ علیحدہ ہٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ میں نے رپورٹس پر ایک نظر ڈالی اور مریضہ کو ڈسٹرب کیے بغیر چپ چاپ باہر نکل گیا۔ باہر سارہ مل گئی اس نے بتایا:

''مریضہ کی حالت اب کافی بہتر ہے۔ خون بہت ضائع ہونے سے کمزوری البتہ بہت ہے۔ شاید کل تک روم میں شفٹ کر دیں گے۔''

''گاڑی میں بھی میرا ذہن سعدیہ ہمدانی ہی کی جانب لگا رہا۔ ''کتنی عجیب بات ہے ان کے پاس کوئی ان کا اپنا نہ تھا'' میں سوچ رہا تھا۔

گھر پہنچا تو دیکھا ابّو، عاطف انکل کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی چھوٹی سی میز پر سادہ کاغذوں کے پیڈ کے ساتھ نئی کتاب کی فائل رکھی تھی۔ وہ ستر پلس کے تھے لیکن قلم و قرطاس سے ان کا رشتہ نہیں ٹوٹا تھا۔ یہی حال عاطف انکل کا تھا ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ شاہراہوں اور پلوں کے مختلف اسائنمنٹ اپنے ذمہ لیتے رہتے ہیں۔ اضافی پنشن کی خاطر نہیں بلکہ بقول ان کے آخری سانس تک کچھ کرنے کے جذبے کے تحت۔۔۔ دونوں بوڑھوں کی زندگی مثالی بھی تھی اور ناقابل یقین بھی۔۔۔ میں دونوں کی داستانِ حیات سے بڑی حد تک واقف ہو چکا تھا جب میں ابّو کے پاس جا کر بیٹھتا تو وہ اپنا قلم بند کر کے مجھ سے باتیں کرنے لگتے تھے۔ ان کی باتیں ایک طرح کی ''آپ بیتی'' تھی جو وہ مجھے جستہ جستہ سناتے رہتے۔ میں نے جب بھی ان سے کہا کہ آپ اور کتابوں کے ساتھ اپنی خود نوشت بھی لکھ ڈالیے۔ وہ جواب میں کہتے ''ڈاکٹر صاحب! اگر میں نے اپنی حیات رفتہ کی سرجری کی تو دیگر لوگوں کی خانگی زندگیوں پر بھی چھری چلے گی کیا وہ میرے لئے جائز ہوگا۔۔۔؟'' یہ سب کہہ کر وہ ہنسنے لگتے،

دیر تک ہنستے۔۔۔ پتہ نہیں اپنے یا دیگر لوگوں کے ماضی میں جھانکتے ہوئے۔۔۔

میرے ابّو محمد یوسف اسمٰعیل اور انکل عاطف ایک محلّے، ایک ہی گلی اور ایسے مکان میں پیدا ہوئے تھے جو ایک دروازے کے ذریعے آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے دالان اور صحن میں ساتھ ساتھ رینگتے پھرے، ساتھ ہ پاؤں پاؤں چلنا سیکھا۔ ابّو نے بتایا تھا:

''میری والدہ نے ہم دونوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا، میرے والد نے ہم دونوں کو مسجد سے متعارف کروایا جو بغدادی صاحب کی مسجد کہلاتی تھی۔ عاطف کی والدہ نے دونوں گھروں کی بچیوں کو کھانا پکانا، سینا پرونا اور گھر داری کے طور طریقے سکھائے۔ وہ خود بھی بہت سلیقہ مند تھیں۔ انہوں نے اپنے گھر کو بہت خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا۔''

ابّو اور انکل عاطف نے ابتدا سے انٹر تک تعلیم ساتھ ہی حاصل کی۔ گویا دونوں ہم مدرسہ، ہم جماعت، ہم اسکول اور ہم کالج رہے۔ اب بھی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر پیار اور محبت سے رہتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ جس وقت وہ دونوں اکٹھے دکھائی دیتے ہیں میں ان دونوں کو عجوبۂ قدرت کے روپ میں تصور کرتا ہوں۔۔۔ اس وقت بھی میرے جذبات ایسے ہی تھے۔

میرے سلام کے جواب میں دونوں نے ''وعلیکم السلام'' کہا۔ ''کہیے ڈاکٹر ہاشم! کیسا چل رہا ہے آپ کا ہسپتال۔ مریضوں کی خدمت کر کے سیدھے جنت الفردوس میں جگہ بنا رہے ہیں۔ آج کی رپوٹ پیش کیجیے''۔ انکل عاطف نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ان کے اس فقرے نے پلک جھپکتے کے وقت میں مجھے ہسپتال سعدیہ ہمدانی کے وارڈ میں پہنچا دیا۔

آج کی روداد میں بعد میں پیش کروں گا پہلے آپ یہ بتائیں کہ ''آپ 'مسکن' کے بارے میں کیا جانتے ہیں۔'' میں نے انکل عاطف سے سوال کر ڈالا۔

''مسکن، کیسا مسکن، کون سا مسکن۔۔۔؟'' یہ تم مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہو۔ میں کیا جانوں کسی مسکن وسکن کو۔۔۔ پوچھنا ہو تو کسی شاہراہ کی مرمت یا کسی اوور ہیڈ برج کے بارے میں پوچھو۔۔۔'' عاطف انکل نے مذاق کے موڈ میں جواب دیا۔

''مسکن'' خواتین کی فلاح کا ادارہ ہے جس کی سرپرست اعلیٰ سعدیہ ہمدانی ہیں۔ وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر ہمارے ہسپتال میں داخل ہیں۔ کیا آپ ان سے واقف ہیں؟ میں نے عاطف انکل سے ایک اور سوال کر دیا۔ میرے سوال کے جواب میں عاطف انکل نے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا لیکن ابّو بیچ میں بول پڑے۔

''بیٹے تم نے کیا نام بتایا تھا، دوبارہ بتاؤ۔۔۔؟''

میں نے قدرے بلند آواز میں ایک ایک حرف کو علیحدہ علیحدہ کر کے کہا ''سعدیہ ہمدانی''

نام سن کر ابو نے ''سعدیہ، سعدیہ، سعدیہ'' تین بار کہا اور عاطف انکل کی جانب دیکھا۔ ابّو کی آنکھیں اپنے پپوٹوں کے غلافوں سے خاصی باہر نکل پڑیں۔ ساتھ ہی انکل عاطف سے بولے:

''چل یار عاطف آج ہاشم بیٹے کے ہسپتال چلتے ہیں۔''

عاطف انکل پہلے تو ابّو کے اس اچانک ردِّعمل سے حیران سے ہوئے پھر فوراً ہی جیسے کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ تھوڑے توقف کے بعد بولے:

''کل چلیں گے۔۔۔ اور یہ تو سوچو دنیا میں جگہ جگہ ہمدانی لوگ ہیں۔ پاکستان کے ہر شہر میں کوئی نہ کوئی ہمدانی مل جائے گی یا مل جائے گا۔۔۔ کس کس کے پیچھے بھاگیں گے۔۔۔؟''

ابّو جو بڑھاپے میں بھی کسی کام میں خود اہل غرض سے دو چار قدم آگے رہنے کی فطرت سے چھٹکارا نہ پا سکے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے۔ کوٹ وغیرہ پہنا اور واکنگ اسٹک سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ عاطف انکل بھی ابّو کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے وہ واکنگ اسٹک نہیں لیتے تھے۔ ان دو سینئر لوگوں نے مجھے بھی اسمارٹ بنا دیا اور ہم تینوں ہسپتال کے لیے نکل پڑے۔

میرا ذہن مجھے تیزی سے ماضی کی طرف لے گیا۔ حیدر آباد دکن ہمدانی خاندان۔۔۔ عاطف انکل کے والد، والدہ، بڑے بیٹے محسن بھائی جان، سعدیہ آپا، دوسری بہن کشور آپی (ان کے بال سنہری اور آنکھیں بھوری تھیں) سب سے چھوٹا بھائی حمزہ۔۔۔ ابّو کا بتایا ہوا ایک ایک لفظ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ابّو بتا رہے تھے ''یہ اس وقت کی بات ہے جب محسن بھائی محکمۂ پولیس میں افسر لگ گئے تھے ان کی پوسٹنگ دہلی میں ہو گئی تھی۔ وہاں محسن بھائی کو اپنے ہی محکمے کے ڈی آئی جی صاحب کی بیٹی پسند آ گئی۔ یہ پسند یک طرفہ نہیں تھی۔ اس وجہ سے چٹ منگنی پٹ بیاہ کی نوبت آ گئی۔ شادی کے فوراً بعد عاطف واپس آ گیا کیونکہ اس کے امتحان تھے باقی سب لوگوں کو محسن بھائی نے روک لیا تھا۔ پھر یہ ہوا نئے شادی شدہ جوڑے کا ہنی مون پر جانے کا پروگرام بنا۔ اگرچہ دو ہفتوں کا پروگرام تھا، محسن بھائی نے جانے سے پہلے سب لوگوں کو ٹرین میں بٹھا دیا اور ٹیلی گراف لنک کے ذریعے اطلاع بھجوا دی۔ عاطف والدین کو لینے اسٹیشن پہنچا، میں بھی عاطف کے ساتھ تھا۔۔۔'' ابّو چند لمحے کے لیے خاموش ہو گئے پھر بولے:

''پلیٹ فارم پر ہم دونوں ایک ایک ڈبّے میں ڈھونڈھتے پھرے۔ عاطف کی آنکھیں ماں باپ، بہنوں اور بھائی کی تلاش میں پھٹی جا رہی تھیں۔ عاطف اور میں تھک ہار کر گھر لوٹے۔ گھر آنے کے بعد عاطف کو اطلاع ملی کہ ''کسی وجہ سے یہ لوگ نہیں آ رہے ہیں۔'' دوسرے دن خاموشی رہی، تیسرے دن عاطف کو اطلاع دیئے بغیر محسن بھائی اور بھابی کے ساتھ سب لوگ پہنچ گئے البتہ عاطف کی دونوں بہنیں اور چھوٹا بھائی حمزہ ساتھ نہیں تھے۔ جب ان کی ٹرین گوالیار جنکشن کے قریب کسی اسٹیشن کو پار کر رہی تھی کہ ٹرین کے تین ڈبے پٹڑی سے اتر گئے ان میں سے ایک میں عاطف کے اہل خاندان سوار تھے۔ ریلوے والوں نے ان ڈبوں کو دوبارہ پٹڑی پر لانے کی کوشش کی۔ جب اس میں ناکامی

ہوئی تو تینوں ڈبوں کے مسافروں کو جہاں جگہ ملی وہاں بٹھا دیا۔اسی اثنا میں اغوا کاروں کے ایک منظم گروہ (Human Trafficking) نے ٹرین پر حملہ کر دیا اور ٹرین میں سوار کئی جوان لڑکیوں اور لڑکوں کو اٹھا کر لے گئے۔محسن بھائی نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا۔حمزہ مل گیا۔۔۔لیکن زخمی۔۔۔اس کو پولیس کے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔'' ابو اتنا بتا کر خاموش ہو گئے۔اس وقت بھی ان کی آنکھیں آنسوؤں سے نم تھیں۔

''ابّو! دونوں بہنوں کا کچھ پتہ نہیں چلا؟'' میں نے سوال کیا۔

''عاطف نے روتے ہوئے بتایا تھا۔ابّو نے خاموشی توڑی۔محسن بھائی کے سامنے جن اغوا شدہ لڑکیوں کو لایا گیا تھا ان میں سعدیہ آپا اور کشور آپی بھی تھیں۔محسن بھائی پولیس آفیسر کی حیثیت سے لڑکیوں کو دیکھنے آئے تھے۔اپنی بہنوں کو پہچان کر بھی نہیں پہچانا۔۔۔ چلتے چلتے قدم ایک لمحے کے لیے رکے، لڑکیاں نگاہیں جھکائے کھڑی تھیں، پھر قدم آگے بڑھ گئے۔۔۔ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔آواز پر نگاہیں اوپر اٹھیں اور دوسری طرف نگاہیں نیچی ہو گئیں۔اٹھی ہوئی نگاہیں سوال کر رہی تھیں۔۔۔'' ہمارا کیا قصور ہے۔۔۔؟''

''لو بھئی ہسپتال آ گیا۔'' ابّو کی آواز سے میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

میں سعدیہ ہمدانی کے وارڈ میں پہلے داخل ہوا۔وہاں نرس موجود تھی، ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔مریضہ ہوش میں تھیں۔میں نے نرس سے مریضہ کا حال پوچھا۔اس نے بتایا بہت بہتر ہے البتہ زخموں میں بہت تکلیف ہے۔پھر میں نے مریضہ سے بات کی۔خیریت معلوم کرنے کے بعد اجازت مانگی کہ باہر میرے والد اور ان کے دوست آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

کیا ان کو ''مسکن'' سے متعلق کوئی کام ہے؟ ''مسکن'' کے سارے معاملات صادقہ نبھاتی ہیں۔مریضہ نے مجھ سے کہا۔میں نے مریضہ کو صاف بتا دیا کہ ''مسکن'' سے متعلق کوئی کام نہیں ہے۔میرے ابّو محمد یوسف اسمٰعیل اور ان کے دوست انکل عاطف آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

مریضہ نے دونوں نام بغور سنے۔۔۔میں نے مریضہ کے چہرے پر پیدا ہونے والے تغیر کو نوٹ کیا۔۔۔مریضہ نے ہاتھ کے اشارے سے اوکے کیا۔میں فوراً ہی باہر گیا اور ان کے ساتھ لے کر وارڈ میں داخل ہوا۔سب سے آگے انکل عاطف تھے، ان کے بعد ابّو اور سب سے پیچھے میں۔انکل عاطف نے سلام کیا۔۔۔ابھی وہ الفاظ پورے بھی نہ کر پائے کہ فوری طور پر آگے بڑھ کر مریض پر جھک گئے۔میں نے تیزی سے آگے بڑھ کو ان کو پیچھے سے تھام لیا ورنہ وہ مریضہ پر گر جانے والے تھے۔مریضہ سعدیہ ہمدانی نے دونوں بازو ان کے لیے کھول دیئے تھے۔''سعدیہ آپا'' انکل عاطف کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل پڑی تھی۔ابو دونوں بھائی بہنوں سے قدرے جدا ہو کر کھڑے ہوئے تھے لیکن انہوں نے بھی اپنا سینہ پکڑا ہوا تھا جیسے کسی طوفان کو روک رہے ہوں۔

ایک طویل جدائی کے بعد اچانک اور غیر متوقع ملاقات سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی ہسپتال کا ماحول بھی درمیان میں حائل تھا۔چھوٹا بھائی اپنی بڑی بہن سے کیا کہے، کیا نہ کہے۔بہت ساری باتیں کہنی ضروری ہو گئی تھیں۔۔۔ اور ایک اہم سوال زبان کی نوک پر آ کھڑا ہوا تھا سب سے پہلے وہی کرنا پڑا۔۔۔ آپا۔۔۔کشور آپی کہاں ہیں؟ کیسی ہیں؟

عاطف انکل کے اس سوال سے سعدیہ ہمدانی کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیل گئے۔انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کی جانب دیکھے بغیر بڑے ضبط وتحمل سے جواب دیا۔''عاطف! ہماری سونے کے بالوں والی شہزادی کہیں گم ہو گئی۔محسن بھائی نے جب ہم بہنوں کو ''ڈس اون'' کیا اور ہمیں پہچاننے سے انکار کیا تو وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئی۔۔۔بہت تلاش کیا۔۔۔وہ کہیں نہیں ملی۔میں جب کسی لائق ہوئی تو اخبارات میں اشتہارات لگوائے، ریڈیو سے اعلانات کروائے، اطلاع بہم پہنچانے والے کے لیے انعام کی نوید بھی دی۔۔۔ اور۔۔۔آج تک اس کی راہ دیکھ رہی ہوں۔

جب سعدیہ آنٹی کشور آپی کے بارے میں یہ سب بتا رہی تھیں میں نے دیکھا ابو اپنے رونے کو ضبط کرتے ہوئے وارڈ سے باہر نکل گئے۔میں بھی ان کے ساتھ وارڈ سے باہر نکل گیا۔باہر نکل کر میں نے ابو کو ایک بنچ پر بٹھایا اور ایک بار پھر دبے پاؤں وارڈ میں داخل ہوا۔جس وقت میں دوبارہ وارڈ میں پہنچا عاطف انکل محسن بھائی جان کی ہوائی جہاز کے حادثے میں وفات کا ذکر کر رہے تھے۔ ''محسن بھائی کی وفات کے ایک ماہ بعد امّی معمولی سے بخار میں مبتلا ہو کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ابّو امّی جان کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے اور مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔'' یہ کہہ کہ عاطف انکل بلند آواز میں رو پڑے۔سعدیہ ہمدانی جن کو دل ہی دل میں میں نے سعدیہ ہمدانی سے سعدیہ آنٹی بنا لیا تھا پیار سے عاطف انکل کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر صبر کی تلقین کرنے لگیں۔

کچھ دیر وارڈ میں گہرا سکوت چھایا رہا۔۔۔اس سکوت کو سعدیہ آنٹی نے توڑا۔

''حمزہ۔۔۔؟'' ان کے ہونٹوں سے نکلا۔

''حمزہ امریکہ میں سٹیل ہو گیا ہے۔لیکن مجھے یقین ہے جیسے ہی اسے آپ کے متعلق پتہ چلے گا، پہلی ملنے والی فلائٹ لے کر آئے گا۔'' انکل عاطف نے سعدیہ آنٹی کو یقین دلایا۔حمزہ امریکہ میں کیا کر رہا ہے؟ سعدیہ آنٹی نے پوچھا:

وہ محسن بھائی جان کے ساتھ رہنے لگا تھا انہوں نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ بھیجا اور وہ وہیں کا ہو گیا۔وہ کیسے۔۔۔؟ سعدیہ آنٹی بولیں۔

وہ ایسے کہ پڑھائی ختم ہوئی تو جاب تلاش کی۔اس کو جاب ملی اور کسی گوری میم کو وہ مل گیا۔یہ ہے ہمارے امیر حمزہ صاحبِ قرآں کی ''داستانِ امیر حمزہ''۔عاطف انکل کے اس فقرے نے سعدیہ آنٹی کے لبوں میں جنبش پیدا کی۔۔۔ہلکی سی جنبش جس کو مسکراہٹ بھی کہا جا سکتا ہے۔

☆

نیا رواج

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
(جموں کشمیر)

''شکیلہ!۔۔۔اری ۔۔۔او شکیلہ۔۔۔سُنتی ہو!میرے دوست بحرعدل کے بڑے بیٹے سبزار احمد کی شادی کا دعوت نامہ آیا ہے۔اُس نے مجھے فون بھی کیا تھا۔دعوت نامے پر مع اہل وعیال لکھا ہے یعنی ہم سب کو اُس نے اپنے بیٹے کی شادی پہ بُلایا ہے''

فصاحت احمد کی باتیں سُن کر اُن کی بیوی شکیلہ اختر ڈرائنگ روم میں جانے ہی والی تھی کہ وہ فوراً رُک گئی اُس نے شادی کا دعوت نامہ دیکھا، بڑے خوب صورت ڈیزائن میں چکنے موٹے کاغذ پر لڑکے اور لڑکی کا نام، مہندی رات، دعوت ولیمہ اور زماں ومکاں سب درج تھا۔اُس نے فصاحت احمد کو کہا

''اُنھوں نے ہمیں شادی کا دعوت نامہ بھیجا ہے تو جانا پڑے گا اور تمول بھی اچھا خاصا دینا پڑے گا''

فصاحت احمد نے حیرت سے بیوی کا چہرہ تکا۔پھر اُس سے پوچھنے لگے

''اچھا خاصا تمول دینے کا مطلب میں نہیں سمجھا، آخر تم کتنا تمول دلانا چاہتی ہو؟''

بیوی نے کہا

''کم از کم پانچ ہزار ایک روپیہ لفافے میں ڈال دینا''

فصاحت احمد نے حیرت سے پوچھا

''پانچ ہزار ایک روپیہ تمول! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔مجھے کیا اپنے دوست بحرعدل کا کوئی قرض چکانا ہے۔میں ایک ہزار ایک روپیہ تمول دینا چاہتا ہوں۔میں تحصیلدار کے آفس کا ایک معمولی کلرک ہوں۔میری اتنی اوقات نہیں ہے کہ پانچ ہزار ایک روپیہ تمول دوں''

فصاحت احمد کی باتیں سُن کر اُن کی بیوی شکیلہ اختر کے ماتھے پر شکنیں سی اُبھر آئیں، اُس نے کہا

''ایک ہزار ایک روپیہ تمول دیتے ہوئے کیا اچھا لگے گا؟ پھر بھی اکیس سو ایک روپیہ لفافے میں ڈال دینا''

فصاحت احمد نے بادل ناخواستہ کہہ دیا

''ہاں ٹھیک ہے اتنا ہی ڈال دوں گا'' یہ کہنے کے بعد وہ جھنجھلاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔وہ نرم خوب صورت بستر پر دراز ہوگئے۔اسی دوران میں اُنھیں دیہات میں گزارے دن یاد آنے لگے کہ جب وہ بچپن، لڑکپن اور جوانی کی منزلوں میں تھے۔وہ بڑے چاؤ سے شادیوں میں جاتے تھے۔اُس زمانے میں بھی شادیوں میں تمول دیا اور لیا جاتا تھا۔برات واپس آنے کے بعد دوسرے دن دعوت ولیمہ ہوتی۔ایک آدمی کو تمول لکھنے کے لیے چارپائی پر بٹھایا جاتا پھر اُسے کاپی پین سونپا جاتا۔وہ تمول لکھتا۔لکیر دار کاپی پہ چار کالم بنائے جاتے۔سب سے پہلے نمبر شمار، پھر تمول دینے والے کا نام، اُس کے بعد سابقہ رقم اور پھر موجودہ رقم لکھی جاتی تھی۔حسب توفیق پانچ روپے سے لے کر پچاس روپے تک لوگ تمول دیتے۔گھر میں تمول والی کاپی بڑی احتیاط کے ساتھ سنبھالی جاتی تھی۔تمول دینے کے بعد لوگ شادیوں میں کھانا کھاتے تھے۔فصاحت احمد کو یہ سب بہت معیوب معلوم ہوتا تھا۔وہ دل ہی دل میں سوچتے یہ کیسا رواج ہے شادی میں پیسہ دو اور کھانا کھالو! دیہات سے نکل کر جب وہ ملازمت کے سلسلے میں شہری زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تو اُنھیں دیہاتی اور شہری زندگی میں زمین وآسمان کا فرق معلوم ہوا۔اُس زمانے میں دیہاتی لوگوں کا رہن سہن، بودوباش اور طرز زندگی نہایت سیدھا سادہ اور شریفانہ ہوا کرتا تھا، جب کہ شہری زندگی میں اُنھیں ظاہرداری، نمود ونمائش، خودغرضی اور تاجرانہ ذہنیت کے حامل لوگ نظر آرہے تھے۔وہ اس بات پر حیران تھے کہ شادیوں اور خوشی کی تقریبات میں تحفے تحائف دیے جائیں تو کسی حد تک ٹھیک ہے لیکن ہزاروں روپے لفافے میں ڈال کر کسی صاحب ثروت کی شادی میں دے کے آجانا بڑی حیرت کی بات ہے! اُنھیں یہ باتیں سوچتے ہوئے ذہنی کوفت سی محسوس ہورہی تھی۔اچانک اُنھیں یہ بھی احساس ہوا کہ جب ہم کسی رشتے دار یا دوست کی خیر پرسی کے لیے اسپتال میں جاتے ہیں تو روپے والا لفافہ ساتھ نہیں لے جاتے، خالی ہاتھ جاتے ہیں۔اُس کی بیماری اور صحت کا حال معلوم کرتے ہیں۔وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہوتا ہے۔اُسے اس نازک مرحلے پر مالی معاونت کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن ہم اُسے زبانی سہارے دے کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آتے ہیں۔شادیوں میں ہم لوگ پانی کی طرح پیسہ خرچتے ہیں۔مختلف طرح کی بھونڈی رسموں اور رواجوں کو عقیدے کے طور پر اپناتے ہیں لیکن بے سہارا اور محتاج لوگوں کی مدد نہیں کرتے۔یہ تمام باتیں فصاحت احمد کو مایوس کررہی تھیں کہ اچانک اُن کے دماغ میں یہ بھی سوال پیدا ہوا کہ شادیوں میں تمول دینے کی کوئی شرعی جوازیت ہے بھی یا نہیں؟ کیا شریعت میں یہ جائز ہے یا لوگوں نے یہ اپنی مرضی سے ایک رواج قائم کیا ہے؟ اُنھوں نے بستر پر لیٹے لیٹے مفتی انور حسین کو فون کیا۔دعا وسلام کے بعد فصاحت احمد نے کہا:

''مفتی صاحب! مجھے ایک سوال نے پریشان کررکھا ہے۔اس سلسلے میں میری رہنمائی فرمائیں''

مفتی صاحب نے پوچھا

''کیا سوال ہے؟''

''جناب سوال یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں شادیوں میں تمول دینے کا رواج ہے۔ہم لوگ جب کسی کی شادی میں جاتے ہیں تو ایک خوب

صورت رنگین لفافے میں ہزار، دو ہزار، پانچ ہزار بلکہ دس ہزار روپے تک اُس میں ڈال کے دُلہے کے باپ کو دینے کے بعد کھانا کھا کر واپس گھر آتے ہیں۔مفتی صاحب! شرعی اعتبار سے مجھے یہ بتایئے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز؟''

مفتی انور حسین نے دوٹوک جواب دیا۔کہنے لگے

''یہ ناجائز ہے''

فصاحت احمد کو مفتی صاحب کا جواب سُن کر تھوڑی سی تسلّی ہوئی پھر کہنے لگے۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تمول دینے کا رواج لوگوں نے سوشل سیٹ اپ کو برقرار رکھنے کے لیے جاری کیا ہے۔مفتی صاحب! اسی حوالے سے آپ سے یہ بات بھی جاننا چاہتا ہوں کہ کہ سماجی میل جول کو قائم رکھنے کے لیے اس رواج کو اپنانے کی کوئی گنجائش نکلتی ہے؟''

مفتی صاحب نے کہا:

''سُنیے! شریعت میں اس کی کوئی بھی گنجائش نہیں نکلتی ہے۔البتہ خوشی کے موقعے پر اگر کوئی تحفہ تحائف دیتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے''

فصاحت احمد ایک عملی انسان تھے۔وہ باتیں کم اور کام زیادہ کرنے پر یقین رکھتے تھے۔وہ سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہنچے کہ خوشی اور غمی انسانی زندگی کے دو ایسے دائرے ہیں جن سے آدمی راہ فرار حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ہمارے معاشرے میں بے سہارا اور مفلوک الحال لوگوں کی بھاری تعداد ہے۔لنگڑے ،لُولے،اپاہج اور بیماروں کے قریب جا کر اُن کا حال معلوم کرنے کوئی نہیں جاتا ہے۔مندروں اور مسجدوں کے باہر بھیک مانگنے والے کھڑے رہتے ہیں ۔اُنھیں ہم پانچ روپے بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں،لیکن اپنے بچّوں کے یوم پیدائش منانے پر ہم بے دریغ ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں۔ہمارے گھروں کی الماریوں میں پہننے کے کپڑوں کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں لیکن کسی ننگے، بھوکے کو کپڑے پہنانا کارِ خیر نہیں سمجھتے ہیں۔کہیں ہمارے ضمیر مردہ تو نہیں ہو چکے ہیں، کیونکہ جب ضمیر مردہ ہو جاتے ہیں تو آدمی اس زمین پہ زندہ لاش کی مانند رہ جاتے ہیں۔اسی صادق اور مخلصانہ جذبے نے فصاحت احمد کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اُنھوں نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک تنظیم ''تنظیم محتاجاں'' کے نام سے قائم کی۔اس تنظیم میں اُنھوں نے اپنے گہرے دوستوں چین سنگھ ،ایشور چند،مجاز الحق اور دیگر اپنے ہم خیال وہم مزاج ساتھیوں کو ممبر شپ میں شامل کیا۔ایک روز جب فصاحت احمد کی صدارت میں ''تنظیم محتاجاں'' کی میٹنگ ہوئی تو اُنھوں نے اس تنظیم کا منشور میٹنگ میں تمام ممبران اور شرکاء کے سامنے رکھا۔منشور میں چند اہم باتوں کو عملی جامہ پہنانے پر خاص زور دیا گیا تھا۔پہلی بات یہ کہ ہر پندرہ دن کے بعد ایک روز ''تنظیم محتاجاں'' کی میٹنگ ہوا کرے گی۔دوسری بات یہ کہ ہر دس دن کے بعد تنظیم کے ممبران اپنے شہر کے اسپتالوں اور چوک چوراہوں پر جا کر بیمار اور محتاج لوگوں کو روٹی، کپڑے اور پھل وغیرہ تقسیم کیا کریں گے۔

پہلی میٹنگ کے بعد جب فصاحت احمد اور اُن کے ساتھیوں نے روٹی، پُرانے کپڑے اور پھل خرید کر شہر کے مختلف مقامات پر بے بس و بے سہارا، لنگڑے،لُولے،اپاہج اور بیمار لوگوں میں تقسیم کیے تو اُنھیں ایسا کرنے سے روحانی سکون حاصل ہوا۔فصاحت احمد نے جب سڑک کے کنارے ایک اندھے کوڑھی کو اپنے ہاتھ سے روٹی اور پھل کھلایا تو اُس معذور کے چہرے پر کھوئی ہوئی رنگت اور مسرت لوٹ آئی۔فصاحت احمد کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اُنھوں نے پہلی بار زندگی میں کوئی نیک کام کیا ہو۔چند مہینوں میں ''تنظیم محتاجاں'' کے ساتھ سینکڑوں افراد جُڑتے چلے گئے۔یہ سب دیکھ کر فصاحت احمد کو جہاں خوشی محسوس ہو رہی تھی تو وہیں اُنھیں کسی شاعر کا یہ شعر یاد آ رہا تھا کہ ۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

☆

وطن پرستی

فیڈل کاسترو اپنے بوٹ پالش کر رہا تھا کہ ایک جوان آیا اور کاسترو کو کہا:

اپنے بوٹ مجھے دے دیں، میں پالش کر لیتا ہوں۔

کاسترو نے جوان کو کہا!

''بیٹا جاؤ! کسی پتھر پر کیوبا کا جھنڈا رنگ دو یا درخت پر لگاؤ کہ تمہیں وطن پرستی کا احساس ہو جائے۔

اگر تم نے میرے بوٹ پالش کیے،

تو تم اپنے آپ میں غلامی (احساسِ کمتری) کا اور

مجھ میں حکمرانی (احساسِ برتری) کا زہر گھول دو گے۔

دولاکھ روپے کا چیک

عمران عاکف خان
(راجستھان)

اس نے 'کالی چائے' کا پہلا ہی گھونٹ پیا تھا کہ اس کے کانوں میں دس سالہ رقیہ کی آواز پڑی:

''اماں! کیا ہمیں بھی دولاکھ روپے کا چیک مل سکتا ہے؛ کب ملے گا اور کیسے؟'' بتاؤ نا!

''کیا مطلب!'' اماں کی بھرّائی آواز اُبھری۔

''یہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ سرکار نے ٹرین میں گولی سے مرنے والے 'لوگوں' کے گھر والوں کو دو-دولاکھ روپے کا چیک دیا ہے۔'' شاید اس کے ہاتھ میں 'تازہ' اخبار کا کوئی ٹکڑا تھا۔

اس کے ذہن میں اچانک تیز ہواؤں کے جھکڑ چل گئے۔کرۂ ارضی گھومتا سا گیا یا اس کا ہی سر چکرا گیا تھا،آنکھوں کے سامنے داغ داغ اندھیر چھانے لگا۔اس سے اگلا گھونٹ پیا ہی نہ گیا۔بیٹی کی خواہش ہی ایسی تھی کہ اس کی بھوک پیاس ہَوا ہوگئی۔اچانک وہ دس بارہ دن میں نصیب ہوئی 'کالی چائے' چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے ایک گلی میں مڑ گیا؛ مین روڈ، دن چڑھے کی چہل پہل سے گردوغبار آلود تھا؛ ہر قسم کے سادھن، تیز وسست رفتار سے دونوں جانب سے آ جا رہے تھے اور صدہا برس سے کائنات کا سفر، بیکراں مسافتوں کی جانب گامزن تھا۔اس کے ذہن میں چلنے والے جھکڑ، اب کچھ دب سے گئے تھے اور کیفیت بہ حال ہونہ لگی تھی، مگر بیابانوں کی ویرانیاں اب بھی موجود تھیں، جن میں اب ایک طرح کی وحشت اور ہَول سا در آیا تھا۔اسی آمیزش میں دما دم کسی لہو خور درندے کی آواز اُبھرتی، جو اس کی پسلیوں اور جسم کے نازک حصوں میں سرسراہٹ دوڑا جاتی ۔۔۔۔اس نے تھوڑی دیر تو آتے جاتے سادھنوں اور کاروانوں کو دیکھا پھر کیفِ بے ساختگی میں ایک طرف چل پڑا،اس کا سفر بھی بیکراں مسافتوں کی جانب تھا۔اگلے چوراہے سے وہ جنوب کی سمت مڑ گیا جدھر چندر روز قبل پولیس اور انتظامیہ کی 'ایما' و 'معاونت' سے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے باعث، جلے گھروں اور جھگیوں سے ابھی تک دھواں اُٹھ رہا تھا اور بے گوروکفن لاشوں کی سڑاند سے فضا بوجھل بنی ہوئی تھی۔

''اے کون پاگل ہے ؛ کہاں جارہا ہے؛ سالے آتنک وادی، بھو۔۔۔کے، رنڈی کے تُو اِدھر کہاں جارہا ہے؛ ابے چو...رُکتا کیوں نہیں، پکڑو اس ۔۔۔کو!'' اچانک ایک وردی دھاری کی گرج دار آواز نے اس کے پیروں میں لرزاہٹ پیدا کردی مگر وہ اپنی ساری قوتیں جمع کر کے ایک طرف تیزی سے دوڑ پڑا۔سنگل اسٹار وردی دھاری لکیر ہی پیٹتے رہ گئے۔

فسادزدہ علاقے میں ایک بار پھر فساد پھوٹ پڑا۔پولیس کا حمایت یافتہ 'گروہ' انتقام پر آمادہ تھا، وہ اب اپنے سہولت کاروں سے بھی دودو ہاتھ کرنے کو تیار تھا اور حساب برابر کرنا چاہتا تھا کیوں کہ اس نے معاونت میں کچھ کوتاہی کی تھی، حالاں کہ پہلے بھی وہی غالب تھا مگر چوں کہ اس کا ایک آدمی بھی فساد میں کام آگیا تھا؛ اسے وہ اپنی شکست اور 'بھاری' نقصان تصور کررہا تھا۔حسبِ عادت پولیس فورس اور 'RAF' کے جوان، حصار بندی کیے کھڑے تماشا دیکھ رہی تھی اور غریبوں و بے قصوروں کی جھونپڑیاں پلک جھپکتے ہی شعلہ وغبار میں تبدیل ہورہی تھیں۔کہیں دُور شہری وریاستی انتظامیہ کے 'بلڈوزرس' میں نفرت وتعصب اور یکطرفہ کارروائی کا 'ڈیزل' بھی بھرا جارہا تھا۔اُجلا آسمان، تاریک وسیاہ ہورہا تھا اور بلندیوں پر اڑنے والے پرندے، بھُن بھُن کر نیچے گررہے تھے۔اسی عالم آتش وخون میں کچھ دل خراش نعرے بھی بلند ہورہے تھے:

''ایک ہی نعرہ ایک ہی نام-JSR-JSR!!''۔۔۔''ہندستان کی ایک پکار JSR JSR!!''-''کر کے رہیں گے اب کی بار-JSR JSR!!''-''ملے مارے جائیں گے۔رام رام چلائیں گے!!''

یہ نعرے گویا آسمانوں میں شگاف ڈالنا چاہتا تھا اوران کی گونج آگ کے شعلوں اور ستم رسیدہ انسانوں کی چیخوں سے بھی سِوا ہوا چاہتی تھی۔سروں پر بندھے مخصوص رنگ کے گمچھوں اور ہاتھوں میں لہراتی تلواروں، بھالوں اور طمنچوں نے 'انسانستان' کو 'حیوانستان' بلکہ اس سے بھی خوف ناک تر بنادیا تھا۔'انسان' ہر طرف بم بنے گھوم اور پھٹ رہے تھے۔دلوں کی نفرت آنکھوں اور دیگر اعضا کے ذریعے باہر آرہی تھی ،تعصب ودشمنی نے، شیطان کا روپ دھار لیا تھا۔خون کے پیاسے انسانوں نے درندوں کو بھی مات دے دی تھی اور 'جنت راندہ' شیطان قہقہے لگا رہا تھا۔

اچانک ایک انسانی پیکر ہوا میں اچھلا، اس کے جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور دم توڑتی سانسیں 'رقیہ۔۔۔رقیہ۔۔۔' کا ورد کررہی تھیں۔آخری ہچکی نے تو سخت کوش ظالموں کو بھی سکتے میں ڈال دیا:

''رقیہ بیٹی! اب تمھیں دولاکھ روپے کا چیک مل جائے گا! تیری تمنا پوری کر چلا۔۔۔خ۔۔۔خ۔۔۔خداح۔۔۔ح حاف۔۔۔'' پھر وہ ہچکی اپنے وجود سمیت سرخ وسیاہ شعلوں میں معدوم ہوتی چلی گئی۔شام ہوتے ہوتے مالکِ کائنات جلی سڑی لاشیں، تباہی، پھونکے گھر اور بدہیئت سوختہ املاک کا نظارہ کررہا تھا۔RAF کی ٹکڑیاں قطار اندر قطار فلیگ مارچ کر کے اپنا فرض ادا کررہی تھیں اور پیڈ' میڈیا' ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم ثابت کرتے ہوئے اپنی لن ترانیوں میں مصروف تھا۔

اگلے دن ریاستی اسمبلی کے در و دیوار لرز رہے تھے۔قائدِ ایوان، لاپتہ تھا، ٹیبل مائک اپنے فیڈ والیوم لیول سے بھی زیادہ تیز ساؤنڈ میں گونج رہے تھے

باقی صفحہ ۶۶ پر ملاحظہ کیجیے

جمیلہ

ڈاکٹر ولا جمال العسیلی
(قاہرہ)

صبح کے چھ بج رہے تھے۔ جمیلہ نے گھڑی کی ان سوئیوں کی طرف دیکھا جو مستقل گھومتی رہتی ہیں۔ جو مدہم ابہام میں عدم کی طرف لے جاتی ہیں۔ جمیلہ نے گھڑی سے نظریں ہٹا کر کھڑکی کی طرف دیکھا، تو اسے ہوا سے ہلتے درخت دکھائی دئے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا: 'یہاں تو درخت بھی پھل دیتے ہیں اور وقت کے ساتھ بڑھتے بھی ہیں اور میں اب بھی وہی ہوں جیسی تھی۔ میرے اندر کوئی نئی بات یا تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ میں بالکل اپنی ماں کی طرح بنتی جارہی ہوں، جو صرف اتنا کرسکتی تھی کہ بوڑھی ہوجائے۔'

لکھنے پڑھنے سے عشق کے باوجود جمیلہ مردوں کی طرح آزاد ہونے کی خواہش پوری کرنے سے تھک چکی تھی۔ وہ جو چاہتی ہے، لکھ نہیں پاتی، جو محسوس کرتی ہے، اس کا اظہار نہیں کرسکتی۔

معاشرہ شرم وحیا کے نام پر کنٹرول کرتا ہے، لہٰذا وہ الفاظ کو اپنے سینے میں دبانے اور انہیں روشنی میں نہ لانے پر مجبور تھی۔ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ معاشرہ عورت کی فطرت کو کیسے سمجھے گا اور کب تک وہ ہر لفظ، ہر احساس اور ہر خواہش کو دفن کرتی رہے گی۔ وہ سوچتی رہتی تھی کہ کیوں روایات کے مطابق عورت اپنے والدین کے گھر میں پرورش پاتی ہے۔ پھر اس کی شادی ہوجاتی ہے، وہ اپنے ساتھ ان روایات کو لے جاتی ہے۔ ان پر قائم رہتی ہے اور اپنے احساسات کو دفن کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا جسم مٹی میں دفن بھی ہوجاتا ہے۔ بار بار اس کے اندر سے آواز آتی کہ میں احساسات کے بغیر نہ جینا چاہتی ہوں نہ مرنا۔ میں مردوں کی طرح آزاد کیوں نہیں ہوں کہ ہر لفظ، ہر احساس، اور ہر شعور لکھ کر بیان کرسکوں؟

جمیلہ نے اپنے آپ سے ہی اونچی آواز میں یوں سوال کیا کہ جیسے وہ کسی سے بات کررہی ہے۔ ایسے ہی خیالات ہر شب اسے سونے سے پہلے اور جاگنے کے بعد ہمیشہ اس کے ذہن کو منتشر کرتے رہتے تھے۔

وہ لکھنا چاہتی تھی، لوگوں کو خوش کرنے کے لیے نہیں۔۔۔ صرف سورج اور چاند کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کے لیے نہیں۔۔۔ بوریت، تھکاوٹ، یا تنازعہ پیدا کرنے کے لیے نہیں۔۔۔ صرف تعریف حاصل کرنے اور مرچ کو چھونے کے لیے نہیں۔۔۔ کوئی وضاحت اور جواز پیش کرنے کے لیے نہیں۔۔۔ صرف اپنے اور اپنے بارے میں نہیں۔۔۔ وہ اس وقت لکھنا چاہتی تھی جب اس کی روح بے چین ہو اور دماغ کی نسیں پھٹ رہی ہوں۔۔ جب وہ تناؤ اور غصے کا شکار ہو۔ جب وہ اچانک پرجوش ہوجاتی تھی۔۔۔ جب اس کے دل میں کسی کے لئے پیار امڈ پڑتا تھا، جب وہ خوش ہوتی۔۔۔ جب وہ اپنے سائے اور اپنی آواز کی بازگشت پر قابو نہیں رکھ پاتی تھی۔۔۔ جب حقیقت تخیل کے جنون کے سامنے الجھ جاتی۔۔ جب اس کی انگلیاں چیخ اٹھتی تھیں کہ مجھے قلم چاہیے۔۔ جب وہ لکھے بغیر آرام سے سو نہیں پاتی تھی۔۔۔ جب ایک خالی سفید کاغذ اس کو مشتعل کردیتا۔۔۔ وہ لکھنا چاہتی تھی جب اسے محسوس ہوتا کہ اس کے آس پاس موجود ہر شخص اسے پکار رہا ہے اور اس سے لکھنے کی درخواست کررہا ہے۔

صبح کے سات بج چکے تھے اور وہ ابھی تک اپنے بستر پر پڑی سوچ رہی تھی۔۔۔ اچانک اس کی بلی اس کے پاس کود پڑی، پھر اس کے پیٹ پر چڑھ گئی اور (مومو) کیا۔۔۔ گویا اسے کہہ رہی تھی، میں تمہارے ساتھ ہوں، میں تمہیں سمجھتی ہوں اور میں تم کو محسوس کرتی ہوں۔

جمیلہ نے اپنی بلی کی طرف دیکھا اور اسے اپنی گود میں لے لیا، پھر اس سے مخاطب ہوکر کہا، 'میں تیری طرح ہوں، میں جو محسوس کرتی ہوں اس کا اظہار نہیں کرسکتی۔ میں ایک لڑکی ہوں، اس لیے مجھے بولنے یا لکھنے کا حق کوئی نہیں دیتا۔ وہ بس زندگی جینے کے لئے یہ چیزیں مجھے دیتے ہیں جیسے کھانا پینا اور لباس پہننا۔۔۔ گویا میں ایک ایسا جانور ہوں جس کا دماغ نہیں ہے۔۔۔ گویا کہ میرا وجود صرف بھوک اور شادی تک محدود ہے۔' بلی نے جمیلہ کی چھاتی سے خود کو آزاد کیا اور بستر سے اُتر کر کمرے سے باہر بھاگی۔ شاید اس کی بات پر بلی کو غصہ آگیا۔ جمیلہ طنزیہ انداز میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ بلی بھی لوگوں کی طرح حقائق بیان کرتے ہوئے غصے میں آجاتی ہے؟ اکثر لوگ وہم میں جینا پسند کرتے ہیں، سچائی سننا پسند نہیں کرتے۔ پھر جمیلہ سیدھی ہوکر بستر پر بیٹھ گئی اور پاس کی میز سے کاغذ اور قلم اٹھایا اور سوچنے لگی۔ کیا ہوگا اگر میں وہی لکھوں جو میں محسوس کرتی ہوں، میں اس خواب کے بارے میں لکھوں گی جو میں نے سوتے ہوئے دیکھا تھا۔۔۔ اس نے قلم اور کاغذ اٹھایا اور پھر تاخیر کئے بغیر وہ اپنے خواب کے واقعات لکھنے لگی۔

'وہ میرے قریب آیا، یہاں تک کہ اس کی گرم سانسوں نے میرے چہرے اور گردن کی دودھیا جلد کو بھڑکا دیا۔۔۔ اس کی مردانہ خوشبو اس کے عطر کی خوشبو میں پیوست ہوگئی، جسے میں اپنے حواس کو بھرتی ہوئی پسند کرتی ہوں۔ وہ خاموشی سے میرے بالوں پر اپنا ہاتھ پھیرنے لگا، وہ میری قربت سے اور میری مخصوص گلاب کی خوشبو سے (جو ہمیشہ مجھ سے پھوٹتی ہے) لطف اندوز ہورہا تھا۔ اپنی انگلیوں سے میری نرم جلد کو چھونے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ انتہائی عرق ریزی اور لطف اندوزی کے ساتھ میری گھومتی آنکھوں کی لرزش میں کھویا جارہا تھا۔ پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی قربت میرے لئے کس قدر الجھن اور تناؤ کا باعث بنتی ہے۔ اس کی مجھ سے قربت کی وجہ سے جس قدر الجھن اور تناؤ پیدا ہوا، وہ تقریباً قسم کھانے جارہا تھا کہ وہ میرے دل کی دھڑکنوں کو اور میری بے ترتیب سانسوں کی رفتار کو سن سکتا ہے۔ اس وقت میرے دل کی دھڑکنیں سمندر کی اونچی لہروں کی

مانند تھیں اور پسینے کے سادہ موتی میری پیشانی پر نمودار ہونے لگے تھے۔ میری نبض زور سے دھڑکنے لگی، وہ اور زیادہ قریب آیا، میرے بکھرتے ہوئے جذبات نے زور پکڑا تو میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں جانتی ہوں کہ میرے جذبات ہمیشہ اس کی قربت میں مجھ پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ایسا جذبہ جو میں نے کسی دوسرے شخص کے ساتھ محسوس نہیں کیا۔ میں اس کے بوسے کا ذائقہ کبھی نہیں بھولوں گی۔۔۔'وہ یہیں تک لکھ سکی تھی کہ اس کی ماں کی آواز آئی، جمیلہ۔

جمیلہ نے ماں کی آواز سن کر جلدی سے قلم اور کاغذ کو تکیے کے نیچے چھپا دیا، مگر جو لکھ رہی تھی اس سلسلہ کو ختم نہیں کیا۔

جمیلہ نے جواب دیا: جی ماں، آ رہی ہوں

ماں کی آواز پھر کچن سے آئی اور بولی: تم کب تک سوتی رہو گی، اٹھو، آؤ اور ناشتہ بنانے میں میری مدد کرو۔

جی ماں۔۔۔ میں آ رہی ہوں۔ اس نے بستر سے نکلتے ہوئے کہا، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ اس نے جو لکھا ہے وہ اچھی طرح سے تکیہ کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ اور اسے کوئی دیکھ نہیں پائے گا۔ اس نے اپنا منہ دھویا اور پھر ناشتہ بنانے میں اپنی ماں کی مدد کرنے کے لیے کچن میں چلی گئی۔

جمیلہ جیسے ہی کچن میں داخل ہوئی تو اس کی ماں نے اس سے کہا کہ آج ہمیں گھر میں بہت کام ہیں، میں آج ناشتہ بنانے کے لئے تم کو اکیلے چھوڑ دیتی ہوں اور گندے کپڑے واشنگ مشین میں ڈال دیتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ جب میں آؤں تو سب کچھ تیار ہو جائے۔ تم سمجھیں؟

ماں یہ کہہ کر کچن سے نکل گئی۔

جمیلہ جلدی جلدی ناشتہ تیار کرنے لگی، تا کہ اس کی ماں اس سے ناراض نہ ہو۔

جب جمیلہ ناشتہ بنانے میں مصروف تھی، تو اس نے اپنے آپ سے کہا: اے خدا، میں نے جو کاغذ لکھ کے تکیے کے نیچے رکھا ہے کہیں اس پر ماں کی نظر نہ پڑ جائے۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ اس کے دل کی دھڑکن خوف سے تقریباً رک سی گئی، جب اس نے دیکھا کہ اس کی ماں گندی چادریں بدل رہی ہیں۔ جمیلہ کے پیروں کے نیچے سے اس وقت زمین کھسکنے لگی اور پیر تھر تھر کانپنے لگے، اس کے حواس جاتے رہے، جب اس نے اپنی تحریر کو اپنی ماں کو پڑھتے ہوئے پایا۔

اس کی ماں نے غصہ بھری آواز میں چیخ کر پوچھا: یہ کیا ہے؟ اور یہ شخص کون ہے؟ بولو۔۔۔

اس لمحے، جمیلہ نے محسوس کیا کہ اچانک صبح گہری رات میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اسے لگا کہ اس کو چکر نہیں آ رہا ہے بلکہ زمین کی گردش تیز ہو گئی ہے۔ وہ اپنے ایک خواب کو ماں کی نظر میں حقیقت بنتے دیکھ کر شرمسار تھی اور اس کے کانپتے ہونٹوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ جواب دے سکتی۔

☆

- بقیہ -

دو لاکھ روپے کا چیک

اور چیئرس ٹیبل تیز طوفانوں میں کھڑکھڑاتی کھڑکیوں کی طرح کھڑک رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اپوزیشن جماعتوں نے حکومت کو دارالعوام میں لا کھڑا کیا۔ ان کا اولین مطالبہ تھا کہ ''فساد میں مرنے والے بے قصور افراد کے اہل خانہ کی مکمل بازآبادکاری کے ساتھ ساتھ حکومت دو دو لاکھ روپے کے چیک بھی دے!'' بصورتِ دیگر اسمبلی کا سیشن نہیں چلنے دیا جائے گا اور ہر ممکن کوشش کرتے ہوئے حکومت کی ناک میں دم کیا جائے گا۔ انصاف اور امن کی بحالی اور فساد برپا کرنے والوں کے سہولت کاروں پر کارروائی، ثانوی باتیں ہیں۔ اپوزیشن کے یہ تیور دیکھ کر حکومت کو سمجھوتے کی صورت نظر آئی تو اس نے مطالبات تسلیم کرتے ہوئے دو۔ دو لاکھ روپے کے چیکس کا اپوزیشن سے بھی مطالبہ کر دیا۔ یوں ریاست میں امن و امان بحالی صورت نکلتی دِکھی۔ رہی چیکس کی بات، تو متاثرین اب تک ان کے منتظر ہیں۔ وہ بلڈوز زدہ گھروں اور فلاحی تنظیموں کی جانب سے بنائے گئے عارضی ٹینٹس و سائبانوں میں سرکاری امداد کی آس لگائے صبح سے شام سے اور شام سے رات کر دیتے ہیں، پھر رات انھیں صدہا ہراس و آلام کے ساتھ آ گھیرتی ہے۔ حکومت کے پاس ہزار بہانے ہیں اور اپوزیشن جماعتیں، الیکشن کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ سماجی کارکن اور فلاحی تنظیمیں دونوں جانب سے 'چاندی' بٹور رہی ہیں۔ رقیہ جیسی سیکڑوں لڑکیوں کے ہاتھوں میں اب بھی 'تازہ' اخبار کے تراشے ہوتے ہیں، جن میں ان کے ابو یا کسی اور عزیز کی تصویر چھپی ہے۔ وہ سب اپنی ماؤں سے پوچھتی ہیں: 'اماں دو لاکھ روپے کا چیک کب ملے گا اور کیسے؟۔۔۔' اور ان کی مائیں صدمات و الم کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہیں جہاں سے انھیں کائنات کے ہنگام محض غوں غاں ہی سنائی دیتے ہیں۔ تقریباً ہر گھر میں 'کالی چائے' کی پیالیاں اب تک وہیں دھری ہیں، اب تو چائے ان میں جم سی بھی گئی ہے، اس کی سیاہی دن بہ دن مزید گاڑھی اور بدنما ہوتی جا رہی ہے۔

تماش بین

وسیم عقیل
(جلگاؤں، مہاراشٹر)

نوجوان وزیر نے ایک دفعہ پھر قدرے احترام سے بادشاہ کو متوجہ کیا۔

"جہاں پناہ! سلطنت کے حق میں میری یہ عرضداشت آپ کی خصوصی توجہ چاہتی ہے۔اس سے قبل بھی آپ کو حالات کی سنگینی سے باور کیا جا چکا ہے۔گستاخی معاف جہاں پناہ، لیکن اگر یہی سلسلہ دراز رہا تو مستقبل قریب میں حالات مزید سنگین ہو سکتے ہیں"

بادشاہ نے مسکراتی نظر سے وزیر کی طرف دیکھا اور اسی طرح مسکراتے ہوئے خلا میں ایک ٹک گھورنے لگا۔وزیر ابھی بادشاہ کی مسکراتی خاموشی کی ممکنہ تعبیر پر غور کر ہی رہا تھا کہ یکا یک بادشاہ نے ایک قہقہہ لگایا۔

دیوانِ خاص میں موجود کنیزیں، ملازم اور محافظ سب حسبِ معمول گونگے بہروں کی طرح گردن جھکائے کھڑے رہے، البتہ بادشاہ کے اس ردِعمل پر وزیر سکتے میں پڑ گیا۔

تب نوجوان وزیر نے ہمت مجتمع کی اور اُسی احترام سے عرض کیا:

"جہاں پناہ! اس ضمن میں آپ کی نظرِ کرم رعایا کو بڑی تباہی سے بچا سکتی ہے۔ اگر اجازت دیں تو سلطنت کی مفلوک الحالی کی تفصیل مختصراً بیان کروں؟"

بادشاہ اب کی دفعہ اس طرح ہنسا جیسے کسی بچے کی معصوم شرارتوں پر ہنسا جاتا ہے۔

بادشاہ سے اپنائیت کا جذبہ پا کر وزیر نے جرأت کی اور کہنا شروع کیا:

"جہاں پناہ! اول تو سلطنت قدرتی آفت کی زد میں ہے۔ برسات مستقل مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ جھیلیں، کنویں، تالاب سب سوکھے جا رہے ہیں۔ مویشی فوت ہو رہے ہیں۔ اناج کی قلت درپیش ہے۔غربت درپے آزار ہے۔شکم کی آگ آدمی کو سب کچھ کر گزرنے پر مجبور کیے ہوئے ہے۔معیشت تنزلی کی دہانے پر کھڑی سسکیاں لے رہی ہے۔ملازمت مفقود اور تجارت مسلسل خسارہ اٹھا رہی ہے۔غرض کہ حالات بد سے بدتر ہو چلے ہیں۔ جہاں پناہ، اگر اس صورتِ حال کا کوئی مناسب حل تلاش نہیں کیا گیا تو عنقریب۔۔۔"

بادشاہ نے وزیر کی التجا اس ذوق سے سنی، جیسے اس کے سامنے کوئی شاہکار تخلیق پارہ پڑھا گیا ہو۔اس سے پہلے کہ وہ داد و تہنیت پیش کرتا ایک خادم مخل ہوا اور اجازت طلب کرنے کے بعد فرشی سلام کرتا ہوا دیوانِ خاص میں داخل ہوا۔

خادم نے اطلاع دی کہ ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور سبھی آپ کی آمد کے منتظر ہیں۔

بادشاہ گداز گدے سے اٹھا، اس کے اٹھتے ہی دو نازک اندام کنیزیں وارد ہوئیں اور اس کے کپڑے کی سلوٹیں درست کرنے لگیں۔ پھر جوتیاں ڈالنے کے لیے دونوں فرش پر گویا بچھ سی گئیں۔اس کے بعد دو ملازم ایک سنہری فریم کا قدِ آدم آئینہ ڈھو کر لائے، جس میں بادشاہ نے اپنے شاہانہ جاہ و جلال کا جائزہ لیا۔ جاتے جاتے اس نے پھر ایک مسکراتی نظر وزیر پر ڈالی اور اپنے محافظوں کے سایے میں باہر نکل گیا۔کچھ دیر سر جوڑے خاموش رہنے کے بعد وزیر بھی بادشاہ کے پیچھے چل پڑا۔

مدور (حلقہ نما) تماشا گاہ میں بادشاہ کے جلوہ گر ہوتے ہی ایک دل دہلا دینے والا شور اٹھا، فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔سبھی لوگ بادشاہ کے احترام میں کھڑے ہو گئے اور جھک جھک کر اپنی عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔بادشاہ کے تخت پر بیٹھ جانے کے بعد سبھی لوگ خاموش ہو گئے اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

اس مدور تماشا گاہ کی پہلی صف میں سلطنت کے قد آور وزرا، دوسری رَو میں فوج کے بڑے عہدے دار، تیسری صف مذہبی شخصیات کے لیے مختص تھی، تو چوتھی میں سلطنت کے امرا و رؤسا تشریف رکھتے تھے۔نیز پانچویں صف میں مختلف شعبوں کے سارے فنکاروں کو جمع کر دیا گیا تھا۔اس کے بعد جتنی صفیں اوپر تک پھیلی ہوئی تھیں اُن میں سلطنت کے عوام تھے جو مختلف خلیہ شکلوں میں بیٹھے خاموشی سے بادشاہ کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔

کچھ شہانہ توقف کے بعد بادشاہ نے ہاتھ کے اشارے سے تماشا شروع کرنے کا اعلان کیا۔ایک بار پھر دل دہلا دینے والا شور بلند ہوا۔اس شور میں تالیوں، ڈھولوں، تاشوں، نگاڑوں کی آوازیں جیسے چھن چھن کر کانوں میں اترنے لگیں۔

اسی درمیان حلقہ نما اکھاڑے میں دو تلوار باز اتر آئے۔آن کی آن میں دونوں کی شمشیریں ایک دوسرے سے ٹکرانی شروع ہو گئیں۔ دونوں ہی تلوار باز اپنی سپہ گری کے جوہر دکھانے لگے۔شور میں ان کی شمشیروں سے پیدا ہونے والی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ دونوں ہی بہت دیر تک اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے رہے اور ایک دوسرے کو زخمی کرتے رہے۔آخر کار ان میں سے ایک کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور کچھ ہی دیر بعد وہ زخمی حالت میں کراہتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ جبکہ دوسرا شخص ہوا میں تلوار لہرا کر اپنی بہادری کی داد وصول کرنے لگا۔ وہ جیت چکا تھا۔ چاروں طرف سے مبارکبادیوں اور تالیوں کا سلسلہ دراز ہوا۔کچھ دیر بعد اکھاڑے میں ایک پنجرا لایا گیا جس میں ایک خونخوار چیتا باہر نکلنے کے لیے بے تاب نظر آ رہا تھا۔پنجرہ کھول کر چیتے کو اکھاڑے میں چھوڑ دیا گیا۔ یہاں اب صرف زخمی شخص کراہتے ہوئے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔اب شور شرابہ اس قدر بڑھ گیا کہ یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان پھٹ پڑے گا۔ چیتا دیر تک اس زخمی شخص کے ساتھ گویا کھیلتا رہا، شاید اسے ٹریننگ ہی ایسی دی گئی تھی، تاکہ تماشائی دیر تک اس منظر سے حظ اٹھا سکیں۔اس کے برعکس زخمی شخص دم توڑتی زندگی کو بچانے کے لیے اپنا بچا کھچا دم خم لگا رہا تھا۔مگر انجامِ کار زخمی شخص زندگی کی بازی ہار گیا۔ جب وہ پوری طرح ٹھنڈا ہو گیا تو چیتے نے بڑی بے رحمی سے اس کی گردن کو اپنے جبڑے میں دبوچا اور اسے گھسیٹتے ہوئے پنجرے کی طرف لے گیا۔

حوصلہ مند نوجوان وزیر ایک بار پھر دست بستہ بادشاہ کے سامنے

حاضر تھا۔شام کا وقت تھا، مشعلیں روشن کردی گئی تھیں، جن کی روشنی میں بادشاہ کا مسکراتا چہرہ تمتمار ہا تھا۔

"ہارنے والا متوفّی حالات کا مارا تھا"

وزیر نے اچانک کہنا شروع کیا، مگر بادشاہ کو کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔

"اس کے چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔اس کے پاس کوئی روزگار نہیں تھا۔انتہائی تنگدستی میں زندگی بسر کر رہا تھا۔وہ مضبوط قد کاٹھی کا ایک طاقتور انسان تھا اور ماہر تیغ زن بھی۔اسی لیے اس نے مدورا کھاڑے میں اترنے کا عزم کیا تھا کہ اس کی جیت یقینی ہوگی اور انعام کی صورت میں وہ آپ کی خاص نظرِ کرم کا حقدار ہوگا؛ اوراس کے دن پھریں گے۔مگر۔۔۔"

"ہمم، ہم جانتے ہیں۔"

بادشاہ تحکمانا لہجے میں بولا۔

"اس لیے کہ زندگی کے کھیل کا ہر بے بس مگر حساس آدمی اخیر میں موت کا داؤ چلنے پر مجبور ہوجا تا ہے۔"

بادشاہ کے ہونٹوں پر ابھری مسکان وزیر کے دل میں سوئی کی مانند چبھ رہی تھی۔

بادشاہ کچھ دیر ٹھہر کر پھر گویا ہوا:

"اے میری سلطنت کے انسانیت نواز نوجوان، تم ابھی میری سلطنت کے نئے وزیر ہو۔اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ہمیں عزیز ہو، اس لیے کہ تمھارے آبا واجداد اس سلطنت کے وفادار رہے ہیں، اور ہم تم سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔لیکن سن لو، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس ہارنے والے شخص کو اس کی بیوی اور بچوں نے بھی اپنی آنکھوں سے چیتے کے جبڑے میں پھنسا دیکھا تھا۔"

وزیر تڑپ اٹھا۔

بادشاہ کہتا رہا:

"پہلے تو اس شخص نے غلط جگہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہا، اگرچہ اس کے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا، مگر وہ چاہتا تو راستہ نکل بھی سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ متوفی شخص ان میں سے نہیں تھا جن کی مفلوک الحالی کا ذکر تم کررہے ہو۔اس نے حالات کو بدلنے کا راستہ چنا تھا جبکہ یہ لوگ خود نہیں چاہتے کہ ان کے حالات بدل جائیں۔اس لیے کہ وہ جانتے ہیں یہ راستہ تلوار کے سائے سے گزرتا ہے۔لہذا خوف اور بزدلی نے انھیں بے حس بنا دیا ہے۔وہ اب صرف تماش بین ہی بنے رہنا چاہتے ہیں۔"

نوجوان وزیر سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

بادشاہ رک رک کہتا رہا:

"اور حقیقت یہ بھی ہے کہ ان کی بے حسی نے انھیں اس درجے کا تماش بین بنا دیا ہے کہ وہ اب کسی کی جیت پر خوشی کا اظہار نہیں کرتے اور نہ ان کے لیے تالیاں بجاتے ہیں۔ بلکہ وہ ہارنے والے کی ہار پر خوش ہوتے ہیں۔ہارنے والا جب زخموں سے اٹھنے والے درد سے تڑپتا ہے یا جب درندہ اس کی گردن اپنے جبڑے میں دبوچتا ہے تو یہ لوگ خوشی سے اچھل پڑتے ہیں، شور مچاتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر بادشاہ نوجوان وزیر کے پاس چل کر آیا اور بڑی اپنائیت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا:

"تمھیں ان کی فکر میں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں، سلطنت کی رعایا بے حس ہو چکے ہیں اور بے حس رعایا سے میری سلطنت کو کبھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا۔ہاں ان میں سے جو حالات کو بدلنا چاہے گا وہ تلوار اٹھا کر اکھاڑے میں اتر آئے گا۔لیکن یہ کام بھی بہادروں کا ہے، تالی بجانے والوں کا نہیں۔"

بادشاہ کی باتیں سن کر حوصلہ مند نوجوان وزیر کے سارے حوصلے پست ہوگئے۔بادشاہ کے تخلیہ کہنے کے بعد وہ سر جھکائے بھاری قدموں سے اپنے حجرے کی طرف چل پڑا۔

کمال کی بات

ہم بھی تھے مالا مال ابھی کل کی بات ہے
سر پر تھے اپنے بال ابھی کل کی بات ہے

وہ لوگ با کمال سمجھنے لگے ہمیں
کہتے تھے بے کمال ابھی کل کی بات ہے

شادی نے دُم کو کتّے کی سیدھا بنا دیا
ٹیڑھی تھی اپنی چال ابھی کل کی بات ہے

جب سے رکی ہے پینشن لیتا نہیں خبر
رکھتے تھے سب خیال ابھی کل کی بات ہے

آتے ہی اقتدار میں سب بن گئے رئیس
لیڈر تھے یہ بدحال ابھی کل کی بات ہے

حالانکہ آج پچکے ٹماٹر کی طرح ہیں
تھے سیب جیسے گال ابھی کل کی بات ہے

بچے ہمارے آج ہمارے بھی باپ ہیں
ہم بھی تھے بے مثال ابھی کل کی بات ہے

اب تو مشاعروں کا وہ سب سے بڑا ہے نام
شاعر تھا یہ قوّال ابھی کل کی بات ہے

احمد علوی (احمد آباد)

"مشقِ تغافل"

میلا رام وفا

(۲۶۔جنوری ۱۸۹۵ء تا ۱۹۔ستمبر ۱۹۸۰ء)

کون کہتا ہے کہ مر جانے سے کچھ حاصل نہیں
زندگی اس کی ہے مر جانا جسے مشکل نہیں

ہاں یہ سارا کھیل پروانوں کی جاں بازی کا ہے
شمع روشن پر مدار گریۂ محفل نہیں

عام ہی کرنا پڑے گا ان کو فیض التفات
غیر ہرگز التفات خاص کے قابل نہیں

منتخب میں ہی ہوا مشق تغافل کے لیے
وہ تغافل کیش میری یاد سے غافل نہیں

حلقہ گرداب ہے گہوارۂ عشرت مجھے
ذوق آسائش مرا منت کش ساحل نہیں

دیکھیے کیا ہو ہمارے شوق منزل کا مآل
پاؤں میں طاقت بقدر دوری منزل نہیں

لاکھ دل قربان اس چشم ندامت کیش پر
یعنی مجھ کو آرزو خوں بہائے دل نہیں

مرجع برق بلا ہے اے وفاؔ دنیائے عشق
حاصل حسرت یہاں جز حسرت حاصل نہیں

○

نسیم سحر (راولپنڈی)

نسیمؔ اپنا مقدّر ہی کبھی یاور نہیں ملتا
کبھی آنکھیں نہیں ہوتیں، کبھی منظر نہیں ملتا

مَیں کُوئے یار تک جاتے ہوئے تھکتا نہیں لیکن
"تھکن اس وقت ہوتی ہے وہ جب گھر پر نہیں ملتا"

مُجھے جو چاک پر رکھ کر نئی ترتیب دے پائے
زمانے میں اب ایسا کوئی کوزہ گر نہیں ملتا

جدائی لوریاں دینے تو آ جاتی ہے کمرے میں
مگر وہ شخص شب بھر اپنے بستر پر نہیں ملتا

کبھی جس نے مجھے شہرِ طلسمِ شب دِکھایا تھا
بہت ڈھونڈا، مگر اب وہ پری پیکر نہیں ملتا

جسے منظر سے آگاہی میسّر ہو، وہ خوش قسمت
پسِ منظر تو مِلتا ہے، سرِ منظر نہیں ملتا

ہمیشہ مَیں کسی اِک چیز سے محروم رہتا ہوں
اگر آئینہ مِل جائے، مِرا پیکر نہیں ملتا

زمیں پر آ گرا تھا وُہ پرندہ، سب نے دیکھا تھا
مگر اُس کا کوئی ٹوٹا ہوُا شہپر نہیں ملتا

گلی کوچوں کی رونق تو اُسی کے دم سے قائم ہے
فصیلِ شہر پر لیکن مرا لشکر نہیں ملتا

یہاں کے موسموں میں ہے زوال آمادگی ایسی
یہاں اب آدمی کیا، پیڑ قد آور نہیں ملتا

اُسے مغرور کیوں رکھتی ہے پستہ قامتی اُس کی
اسے کیوں یہ شکایت ہے کہ میں جھک کر نہیں ملتا

اگر مقصود ہے گوہر تو غوّاصی ضروری ہے
کہ سطحِ آب سے تو قیمتی گوہر نہیں ملتا

نہ جانے کون نیندیں لے گیا ہے چھین کر ہم سے
نہ جانے کیا ہوا ہے، چین کیوں شب بھر نہیں ملتا

مجھے بھی شاید اُس جیسا نہ کوئی اَور مِل پائے
اُسے بھی غالباً مجھ سے کوئی بہتر نہیں مِلتا

میں یاروں دوستوں کے ساتھ تو دیکھا بھی جاتا ہوں
مگر اپنی معیّت میں تو مَیں اکثر نہیں ملتا

یہاں کی گرم بازاری میں بھی قِلّت کا عالم ہے
کہ دستاریں تو مِل جاتی ہیں، اُن میں سر نہیں ملتا

فقط کاغذ ہی کالے کرتے رہنے سے ہے کیا حاصل
لکھیں تو کیا لکھیں ہم، جب کہ آبِ زر نہیں ملتا

پرتپال سنگھ بیتاب
(جموں،کشمیر)

اوّل مرے مولا مرے ہاتھوں میں ہنر اور
پھر چاہیے تھوڑا سا دعاؤں میں اثر اور

اور آبلہ پائی ہے تھکن اور سفر اور
ہے وادیٔ پُرخار سے آگے بھی سفر اور

ہے خواب نیا خواب کی تعبیر نئی ہے
عالم ہے نیا چاند ستاروں سے اُدھر اور

موسم ہیں کئی اور مِری راہ میں آگے
دے میری تمنّا کو شجر اور ثمر اور

تا حدِ نظر دیکھ لیا تو ہوا محسوس
نظّارہ ابھی اور ہے درکار نظر اور

ہم ایک زمیں دیکھ نہیں پائے ابھی تک
ہے لاکھ زمین اور کئی شمس و قمر اور

کُچھ تو ہے مناظر میں طلسمات کا عنصر
اور اُس پہ کُچھ اپنا بھی ہے اندازِ نظر اور

دنیا تو ریا کار ہے عیّار ہے مانا
خود ہم بھی ہیں بیتاب اِدھر اور اُدھر اور

○

قیصر نجفی
(کراچی)

ایک سا آغاز ہے اب ایک سا انجام ہے
صبح خون آشام اپنی شام خون آشام ہے

ہر قدم پر اب صف ماتم بچھی ہے شہر میں
موت کا اس بار رہزن حملہ ور ہر گام ہے

جذبۂ مہر و محبت خواب ہو کر رہ گیا
رسمِ بے مہری قاتل کا رواج عام ہے

مفتیانِ عصر سے مسلک ہے جس کا بھی جدا
وہ ہے گردن زدنی یا لائق دشنام ہے

اب تو دہشت گرد ادب کے آ گئے ہیں سامنے
موت کا پیغام قرطاس و قلم کے نام ہے

لوگ بھی بے وجہ قیصر ہو رہے ہیں قتل اور
بے نشاں قاتل بھی ہے مقتول بھی بے نام ہے

○

ایوب خاور
(لاہور)

میری وحشت کو اب اس سینہ صحرا سے نکال
اے میرے دل مجھے اس ریت کے دریا سے نکال

کر مجھے غرق، کسی چشمِ غزالاں میں کہیں
پھر کسی روز اسی چشمِ تماشا سے نکال

کون سا دکھ ہے جو باقی ہے ابھی دیکھنے کو
غمِ دنیا مجھے اب دہشتِ دنیا سے نکال

رمِ آہو کی طرح بہتی ہوئی سبز ہوا
اک ذرا یاد تو اس کی دلِ سادہ سے نکال

یوں کر اے رخشِ خرد، کوچہ عریاں کے غلام
دلِ کمبخت کو اس پیکرِ خستہ سے نکال

○

اسلم راہی
(اسلام آباد)

جب کوئی قید جاں سے اٹھتا ہے
رسم سود و زیاں سے اٹھتا ہے

وقت پر اپنے اپنے ہر کوئی
اپنے اپنے مکاں سے اٹھتا ہے

عارضی ہے جہانِ دیدہ و دل
ہر مسافر یہاں سے اٹھتا ہے

مت کریدو اسے دھواں کچھ اور
قصۂ رفتگاں سے اٹھتا ہے

دفعتاً اک حجاب گرتے ہی
ہر تماشا جہاں سے اٹھتا ہے

سچ کی سولی سجائے صدیوں میں
ایک ہی درمیاں سے اٹھتا ہے

دشت میں جو غبار ہے راہی
گردشِ کارواں سے اٹھتا ہے

○

اشرف جاوید
(لاہور)

اقرار کی خو اُس کو ودیعت بھی نہیں ہے
ایسا بھی نہیں ہے کہ محبت بھی نہیں ہے

زخموں کو بھرے دیتا ہے اب وقت کا مرہم
لگتا ہے مسیحا کی ضرورت بھی نہیں ہے

مانگے کے چراغوں سے چراغاں نہیں ہوتا
اور اپنا جلانے کی سہولت بھی نہیں ہے

عشّاق ہیں، پھرتے ہیں فقط دید کی خاطر
کشکول کے لب پر کوئی حاجت بھی نہیں ہے

دہلیز پہ آ بیٹھا کوئی بھیس بدل کر!
جو دیکھ رہے ہو، وہ حقیقت بھی نہیں ہے

یادوں کے تسلّط میں بھی نیند آنے لگی ہے
اب آگ میں شدّت بھی، اذیّت بھی نہیں ہے

تحسین کریں کیسے ترے ظلم و کرم کی!
دامن میں گلِ سنگِ ملامت بھی نہیں ہے

کیا جانیے، کس واسطے پھرتا ہے زباں سے!
پہلے تو کوئی ایسی روایت بھی نہیں ہے

میں اپنی وفاؤں کی سزا کاٹ رہا ہوں
سر فخر سے اونچا ہے، ندامت بھی نہیں ہے

○

فیصل عظیم
(کینیڈا)

کس کو اتنی فرصت ہے، پہچانے کون
بانٹ رہا ہے لوگوں میں دستانے کون!

ٹوٹ کے اور بھی الجھے گی حالات کی ڈور
اب سلجھائے اس کے تانے بانے کون!

جس دھرتی نے برسوں دھوپ اگائی ہو
اس پر ننگے پاؤں چلیں دیوانے کون

اپنے گرد ہی گھوم رہا ہوں برسوں سے
دیواروں کے اندر قید ہے جانے کون

ہم نے بھی کچھ پیار کے دیپ جلائے ہیں
پر اس تاریکی میں ہم کو مانے کون

دنیا سے گزریں گے سائے کے مانند
اتنی تیزی میں ہم کو پہچانے کون

○

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

ہم بڑی چاہ سے آئے تھے منانے کے لیے
تُم نے رُخ موڑ لیا ہم کو ستانے کے لیے

تُم تو بیٹھے ہو فقط تیر چلانے کے لیے !
اپنا دل پیش کروں کیوں مَیں نشانے کے لیے

کتنے دن بیت گئے تیری جدائی میں مُجھے
دِل میں اِک ہُوک اُٹھی پھر تجھے پانے کے لیے

اِک طرف جور و جفا ، ایک طرف مہر و وفا
سب ادائیں ہیں تری دِل کو لُبھانے کے لیے

اتنے ہنس ہنس کے رقیبوں سے تھے گویا جو تُم
تھی یہ اِک چال فقط مُجھ کو جلانے کے لیے

مَیں نے یہ جانا کہ اب دُور ہی رہنا بہتر !
اِک یہی راہ بچی دِل کو بچانے کے لیے

جس نے بھی دِل کو سنبھالا وہی جیتا ہے ریاضؔ
سینکڑوں پھرتے ہیں یاں دل کو لُٹانے کے لیے

○

نبیل احمد نبیل

(لاہور)

پرانا ہوں، نئے منظر سے ہٹ جانا پڑا ہے
مجھے اپنے ہی پہلو میں سمٹ جانا پڑا ہے

مسلسل تشنگاں کا شوقِ گریہ دیکھتے ہی
پیالوں میں صراحی کو اُلٹ جانا پڑا ہے

مرا ہونا کسی بے سمت منزل کی طرف تھا
سو، اِک بہتے کٹاؤ سے بھی کٹ جانا پڑا ہے

ترے گھر تک مجھے رستے میں اندیشے بہت تھے
جہاں کل تھا، اُسی کل کو پلٹ جانا پڑا ہے

مری وحشت سمجھنے ہی نہیں دیتی مجھے کچھ
وہ کیا پرچھائیں تھی جس سے لپٹ جانا پڑا ہے

ترے بڑھتے ہوئے قدموں کی پامالی سے ڈر کر
مجھے خود اپنے ہی سائے سے گھٹ جانا پڑا ہے

زمیں کی اِس قدر تذلیل کرتے جا رہے ہو
کہ مجھ جیسے مکینوں کو بھی ڈَٹ جانا پڑا ہے

برس کر مِل سکی بارش کو بھی آسودگی کب
برستے وقت پھر بادل کو چھَٹ جانا پڑا ہے

مجھے زیبائشِ دُنیا نہ کام آئی تو آخر
میں مٹّی تھا، سو، مٹّی ہی میں اَٹ جانا پڑا ہے

نبیل اپنی ہی تنہائی سے گھبرایا ہوا تھا
اُسے اِس شہر کی گلیوں میں بَٹ جانا پڑا ہے

○

کیڑے مکوڑے

تابش خانزادہ
(لاس انجلس)

ہاتھیوں کا ہر خاندان ایک ریوڑ کی صورت میں رہتا ہے جس میں ہر عمر اور جسامت کے تیس سے ساٹھ کی تعداد میں ہاتھی ہوتے ہیں اور ریوڑ کے ہر نفس کا ایک کردار ہوتا ہے جسے وہ بدرجہ اتم پورا کرتا ہے ورنہ اسے ریوڑ سے نکال دیا جاتا ہے۔ جیسے انسانوں کے ہر خاندان میں رہن سہن کے اپنے اپنے آداب ہوتے ہیں اسی طرح ہاتھیوں کے ہر ریوڑ کے اطوار دوسرے ریوڑوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر ریوڑ میں ایک بڑی عمر کی لیڈر ہتھنی ہوتی ہے جو کھانے پینے کے جنگلی ذخائر کے علم سے لیس ہوتی ہے اور وہ بدلتے موسموں کے ساتھ اپنے ریوڑ کو وہاں وہاں لے جاتی ہے جہاں جہاں سب کے لیے کھانا پینا وافر مقدار میں اور بہ آسانی دستیاب ہوتا ہے۔ لیڈر ہتھنی کا دوسرا کام ریوڑ میں موجود اپنی اور سوتیلی نوجوان بیٹیوں کی تربیت ہوتا ہے۔ وہ انہیں گھر گرہستی کے وہ تمام آداب، علوم اور گُر سکھاتی ہے جو اُس نے اپنی ماں، نانی اور سوتیلی ماؤں سے سیکھے تھے۔ تربیت کا یہ دور مادہ ہتھنیوں کی پیدائش سے لے کر بیس سال کی عمر تک جاری رہتا ہے۔ بیس برس کا ہوتے ہی انہیں اپنے ریوڑ سے نکال دیا جاتا ہے تاکہ وہ کسی اور ریوڑ میں جہاں اُن کے بھائی نہیں ہوتے، شامل ہو کر افزائش نسل کریں۔ ہاتھی اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو فیرامونز کی مدد سے پہچانتے ہیں۔ اس لیے ان کے قریب نہیں جاتے۔ ہاتھیوں میں ریوڑ تبدیل کر کے افزائش نسل کا یہ فطری عمل اُن میں جنیٹک ویری ایشن کا سبب بنتا ہے۔ لیڈر ہتھنی کا تیسرا کردار یہ ہے کہ وہ دوسرے ریوڑوں سے آنے والی نوجوان ہتھنیوں کو اپنے ریوڑ میں شامل کرنے سے پہلے فیرامونز کی مدد سے ان کی (Genetic Compatibility with the help of Pheromones) پرکھنے کے بعد انہیں ریوڑ میں شمولیت کے آداب سکھاتی ہیں اور انہیں اپنے نر لیڈر ہاتھی کے ساتھ افزائش نسل کے لیے تیار کرتی ہیں۔ بڑی عمر والا ایک نر لیڈر ہاتھی بھی ہر ریوڑ میں ہوتا ہے جو ریوڑ میں پہلے سے موجود اور باہر سے آنے والی نئی نوجوان ہتھنیوں جن کی کُل تعداد دس سے پندرہ تک ہوتی ہے سے ملاپ کرنے کا بلاشرکتِ غیرے حق رکھتا ہے۔ لیڈر کے علاوہ ریوڑ میں موجود اس کے بیٹوں میں سے کسی کی اتنی جرأت کبھی نہیں ہوتی کہ وہ باہر سے آئی ہوئی کسی نوجوان ہتھنی کی جانب کبھی آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے۔ ایسی حرکت کرنے والے کو لیڈر باپ جان سے مارنے سے گریز نہیں کرتا۔

نر لیڈر کا دوسرا کردار اپنے خاندان کے بیٹوں کی تربیت کرنا ہوتا ہے۔ وہ انہیں لیڈر بننے کا ہر وہ داؤ پیچ سکھاتا ہے جو اس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ داؤ پیچ سکھانے کا طریقہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ ان کی عمر، طاقت اور سمجھ کے مطابق ہر روز دوستانہ کُشتی لڑتا ہے اور کُشتی کے دوران انہیں دوسرے خاندان کے نر ہاتھیوں کو پچھاڑنے کے گُر سمجھتا رہتا ہے۔ تربیت کا یہ دور دو سال کی عمر سے شروع ہو کر بیس سال کی عمر تک ہوتا ہے۔

بیس برس کی عمر میں نوجوان بیٹے ہاتھی کا جسم پہلی بار نر ہارمونز خارج کرتا ہے جسے شہوت کی مستی کہتے ہیں۔ اس کے اگلے پانچ برس لیڈر باپ اپنے شہوت میں مست بیٹے کو دوسرے لیڈر ہاتھیوں کا اقتدار حاصل کرنے کے لیے للکارنے اور پچھاڑنے کی تربیت دیتا رہتا ہے۔

وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ بیٹے کی مستی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور پچیس برس کا ہوتے ہی لیڈر باپ اپنے نوجوان مست بیٹے کو اپنے ریوڑ سے نکال دیتا ہے۔ ہارمونز کی مستی میں اکیلا نوجوان ہاتھی آس پاس کے کسی اور ریوڑ، ایسے ریوڑ میں جہاں اس کی بہنیں نہیں ہوتیں، میں جا کر وہاں کے نر لیڈر کو اس کا اقتدار حاصل کرنے کے لیے للکارتا ہے۔ نئے اور پرانے نر کے درمیان کڑی جنگ ہوتی ہے جو کئی دن، بعض اوقات ہفتوں، جاری رہتی ہے۔ جیتنے والا ہاتھی اُس ریوڑ کی ساری ہتھنیوں سے ملاپ کا حقدار متصور ہوتا ہے اور ہارنے والا اپنے اقتدار کے دوبارہ حصول کے لیے اگلی جنگ کی تیاری کی مشق کرنے لگتا ہے۔ میدانِ جنگ میں ہاتھیوں کی اس لڑائی کی ضد میں آنے والے لاکھوں حشرات الارض یعنی چونٹیاں، مینڈکیں، چوہے، گلہریاں، کینچوے، کاکروچ اور نہ جانے کتنے اور چھوٹے موٹے جاندار روزانہ مرتے رہتے ہیں۔ جی ہاں جب بھی دو سیاسی ہاتھی حصولِ اقتدار کی ہوس اور شہوت کے زیرِ اثر ایک دوسرے سے گھمسان کی جنگ لڑتے ہیں، تو میدانِ جنگ کی ضد میں آنے والے عوامی کیڑے مکوڑے مرتے ہیں۔

شجرۂ نسب

پروفیسر محمد ایوب قادری ایک محقق آدمی ہیں۔ شجرۂ نسب مانگ رہے تھے۔ ہمارے ہاں کہاں سے آتا؟

ہم نے کہا کہ بزرگوں میں ہمیں اپنے والد کا نام یاد ہے یا ایک اور مورثِ اعلیٰ کا کہ اپنے زمانے کے مشہور پیغمبر تھے۔

بولے کون؟

ہم نے حضرت آدم علیہ السلام کا نام بتایا تو عقیدت سے ادھ موئے ہو گئے۔

ابنِ انشاء
(خمارِ گندم)

سائنس دانوں کا قبرستان

توصیف بریلوی
(بریلی)

یہ اس نوجوان کی خوش قسمتی ہی تھی یا اس کا مقدر بدلنے والا تھا کہ اس نے وہ سب کچھ دیکھا جو اس کے باپ دادا کے نصیب میں بھی نہیں تھا۔ اپنی ناکامی سے بددل ہوکر وہ جس پہاڑی پر دو دن تک رہا تھا اب وہاں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ پہاڑی کے جس درخت پر وہ بیٹھا تھا وہاں سے اس نے دیکھا کہ تین طرف باغات سے گھرے ہوئے قبرستان میں ایک سونے کا تابوت بڑے ہی تزک واحتشام کے ساتھ لایا گیا جسے پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ زمین کے حوالے کیا جانا تھا۔ نوجوان کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ کوئی سائنس دان اپنے مالک حقیقی سے جا ملا ہے۔ پورے ملک کے سائنس دانوں کے لیے یہ ایک بہت انوکھا قبرستان تھا جہاں انہیں حکومت کی جانب سے عزت واحترام کے ساتھ سونے کے تابوت میں دفنایا جاتا تھا۔ اس قبرستان کی تاریخ بھی اتنی ہی صدیوں پرانی تھی جتنی کہ اس شہر کی عمر تھی جہاں پر قبرستان واقع تھا۔ سیکڑوں برس پہلے ہی یہ قبرستان اور اس کے اصول وضوابط بنائے گئے تھے اور یہ قبرستان صرف سائنس دانوں کے لیے وقف تھا لیکن تب بات اور تھی۔

اس نے اپنے ملک اور اس تاریخی قبرستان کے بارے میں ایک کتاب پڑھی تھی جس میں مختلف سائنس دانوں کی ایجادوں اور بادشاہ کی جانب سے ان کو ملنے والی مراعات کا بہت ہی مفصل اور حیرت انگیز بیان تھا۔ سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ کسی بھی سائنس دان کو مرنے کے بعد اس تاریخی قبرستان میں سونے کے تابوت میں رکھ کر دفنایا جاتا۔ ہر سال اس قبرستان کو سجایا جاتا اور اس کے باہر کے میدان میں میلا لگ جاتا۔ میلے میں پورے ملک سے لوگ باگ آکر جمع ہوجاتے اور قبرستان میں مدفون اپنے اپنے عزیزوں کے لیے دعائیں کرتے لیکن انہیں قبرستان کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی اور دروازے پر بادشاہ کے سپاہی ہمہ وقت طعینات رہتے تھے۔ ہاں جب کوئی سائنس دان دنیا سے رخصت ہوتا تو اس وقت صرف اس کے پسماندگان میں سے کسی ایک کو تابوت کے ساتھ قبرستان میں جانے کی اجازت ہوتی تھی۔ یہ سب عجیب تھا..... لیکن تھا..... برسوں سے تھا۔

اس نوجوان نے اپنے اسکول کے دنوں میں سائنس، حساب، ریاضی اور الجبرا کے ساتھ تھوڑی بہت تاریخ بھی پڑھی تھی۔ ہاں ادب جیسی کوئی بھی شے اس ملک میں طلبا کو نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ وہ بہت جلد پڑھائی سے بددل ہوگیا کیوں کہ اس کی طبیعت ان مضامین کی طرف مائل ہی نہیں ہوتی تھی جو اسے اسکول میں پڑھائے جاتے تھے۔ ایک روز وہ پہاڑی پر گیا اور سپاہیوں کی نظر بچا کر فصیل شہر پر چڑھ گیا۔ اس نے پہلی بار اپنے شہر کے باہر کا نظارہ کیا تھا۔ ایک اچٹتی سی نظر شہر سے باہر کے کہساروں، وادیوں، جنگلوں، پانیوں اور دور کے پہاڑوں پر دھندلی دکھائی دینے والی عمارتوں پر پڑی ہی تھی کہ اسے سپاہیوں نے پکڑ لیا۔ ایک سپاہی اس کا دور کا رشتے دار تھا اس لیے بچ گیا نہیں تو سزا کا مستحق تو وہ تھا ہی۔ رات کو بستر پر اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کی جاگتی ہوئی بے چین آنکھوں میں صرف ان دھندلی عمارتوں کی تصویر تھی جن کا دیدار اسے آج ہی نصیب ہوا تھا۔

یہ شہر چوں کہ دارالخلافہ تھا اس لیے سب سے زیادہ پابندی یہیں پر تھی حالاں کہ بادشاہ وقت کی سلطنت میں جتنے بھی شہر، گاؤں اور آبادیاں تھیں ان تمام پر پابندیاں عائد تھیں۔ دارالخلافہ تو کسی بھی سلطنت کا دل ہوتا ہے جو کہ پسلیوں کے درمیان محفوظ ہوتا ہے۔ سپاہیوں، وزیروں اور دیگر سرکاری ملازموں کو دوسرے شہروں تک آنے جانے کا اجازت نامہ حاصل تھا۔ کسان اپنی فصلیں تیار کرتے اور بیل گاڑیوں میں لاد دیتے، اس کے بعد سپاہی انہیں دوسرے شہروں یا ملکوں تک لے جاتے۔ اسی طرح دوسرے شہروں یا ملکوں سے اجناس یا دیگر سامان لایا جاتا تھا۔ دریاؤں پر بادشاہ کے بیڑے تیار رہتے تھے۔ دارالخلافہ کا رقبہ اتنا بڑا تھا کہ چھوٹا موٹا ملک اس میں آباد ہوجائے۔ فصیل شہر کو پہاڑوں، جنگلوں اور کہیں کہیں پر دریا کے اوپر سے بھی گزارا گیا تھا۔ چاروں طرف سبزہ زار تھا، مویشی تھے، پرندے تھے اور سکون جیسی خاموشی تھی۔ بادشاہ نے جو تجربہ گاہ تعمیر کروائی تھی اس میں شاہی سائنس دان ہمہ وقت آلات، ادویات اور کیمیائی مادوں کی ایجاد میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ محافظ اپنے فرائض جاں فشانی سے انجام دے رہے تھے۔ پڑوسی ممالک سے بھی خوشگوار تعلقات تھے اور ایک دوسرے کے ممالک میں سفارت خانے بھی قائم کر رکھے تھے۔ سرکاری اسکول نونہالوں کو سائنس، حساب اور ریاضی پڑھا رہے تھے۔ سب کچھ تو ٹھیک تھا..... کیا واقعی سب کچھ ٹھیک تھا؟ یہ کشمکش ابھی اس ملک کے کسی بھی باشندے کے ذہن میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔

مختلف تالابوں میں کنول بدستور کھل رہے تھے، بطخیں تیر رہی تھیں اور مچھلیاں..... ان کی تو ادا ہی نرالی تھی۔ رنگ برنگی تتلیاں معطر ہواؤں میں رنگین خواب بن رہی تھیں جنہیں دیکھ کر بچے اپنی ماؤں کی گود میں لہرانے لگتے۔ پرندے اپنا گیت سناتے بالخصوص کوئل..... لیکن ان گیتوں کو سن کر کسی کا دل نہیں مچل اٹھتا۔ مور جا بجا ناچتے پھرتے لیکن کوئی ان کا ناچ دیکھ کر عش عش نہیں کرتا۔ شہر میں کوئی ناکارہ نہیں تھا سوائے اس نوجوان کے۔ وہ نوعمر تھا، نوخیز تھا، کم سن تھا اور لاابالی بھی۔ اس کا باپ سپاہی تھا جس کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ ماں کو بادشاہ کی طرف سے ملنے والی پنشن کا سہارا تھا۔ اس قلیل رقم سے ماں بیٹے کے اخراجات کسی طرح پورے ہو ہی جاتے تھے کیوں کہ نوجوان کی ماں کو کبھی کبھار محل میں جا کر ملکہ کی خدمت کا موقع بھی مل جاتا جس سے کچھ نہ کچھ مزید مل ہی جاتا تھا۔

نوجوان کے اندر نہ تو پڑھنے لکھنے کا شوق تھا اور نہ ہی فنون سپاہ گری کو سیکھنے کا مادہ۔ اسے خود بھی نہیں پتا تھا کہ اس کی یہ لاپروائی آخر اسے کہاں لے جائے گی۔

دھندلی عمارتوں کو دیکھے ہوئے کئی روز گزر چکے تھے اور اب وہ عمارتیں اس کی نظر میں دھندلی نہیں رہی تھیں بلکہ ان کا رنگ وروغن اور یہاں تک کہ ان کی

نقاشی بھی اس کے ذہن میں مستحکم ہو چکی تھی۔اس کی خواہش آنکھوں سے ہوتے ہوئے دل میں پہنچی تو ارادے میں تبدیل ہوگئی۔وہ کوئی سرکاری آدمی تو تھا نہیں جو خارجہ پروانہ دستیاب ہو جاتا۔اپنی ماں کو بغیر بتائے وہ چپ چاپ اناج سے لدی ایک گاڑی میں چھپ کر شہر سے باہر چلا گیا۔دوسرے شہر کی حدود میں داخل ہونے کے بعد موقع ملتے ہی وہ بیل گاڑی سے اتر کر جنگل میں غائب ہوگیا۔

ایک رات جنگل میں گزارنے کے بعد جب وہ بازار میں پہنچا تو بازار میں کسی کا جنازہ نکل رہا تھا اس لیے بہت بھیڑ تھی۔نوجوان نے تابوت کو بغور دیکھا لیکن یہ سونے کا نہیں تھا۔اس نے جنازے سے نظریں ہٹا کر دیکھا بازار بارونق، جاذب اور مختلف قسم کی قیمتی اشیا سے سجا ہوا ہے۔بھوک نے جب ستایا تو اس نے اپنی گوٹ سے سکّہ نکالا اور دکان پر چڑھ گیا جہاں کھانے کا کچھ سامان رکھا ہوا تھا۔ابھی وہ دکان دار سے کچھ کہتا اسے پردے کے پیچھے سے ایک سریلی آواز سنائی دی۔

''بابا میں عبادت گاہ جا رہی ہوں۔وہاں سے خانقاہ بھی جاؤں گی۔''

آواز اتنی باریک تھی کہ کانوں کے ساتھ ساتھ شریانوں میں بھی اترتی چلی گئی اور وہ نوجوان اپنی رگ رگ میں مٹھاس کو تحلیل ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔دکان کی ساری چیزیں اسے مہنگی لگ رہی تھیں یا یوں کہیں کہ اس کے پاس سکّے کم تھے اس لیے وہ بغیر کچھ خریدے ہی دکان سے باہر نکل گیا۔گلی میں کسی سے عبادت گاہ کی سمت معلوم کر کے وہ اس طرف چل دیا۔وہاں پہنچ کر وہ باہر ہی رک کر کچھ سوچنے لگا اور کچھ دیر بعد جنگل میں غائب ہوگیا۔اگلے روز بھی نوجوان عبادت گاہ تک آیا لیکن اندر نہیں گیا۔تیسرے دن جب وہ پھر جنگل کا رخ کرنے ہی والا تھا کہ اسے پیچھے سے کسی نے پکارا۔

''کیا آپ کو کسی کی تلاش ہے؟''

جانی پہچانی سی آواز سن کر نوجوان پلٹا۔سامنے ایک دوشیزہ تھی جو عمر میں اس سے ذرا نکلتی ہوئی تھی لیکن خوبصورتی میں بے مثال تھی۔نوجوان گھبرا رہا تھا۔اس کی چوری جو پکڑی گئی تھی۔

''جی.....وہ.....میں.....''

''میں خانقاہ جا رہی ہوں، میرے پیچھے ذرا فاصلے سے آیئے۔خانقاہ قریب ہی ہے اور اتنی دیر میں میرے سوال کا کوئی معقول جواب بھی سوچ لیجیے گا۔ ورنہ.....!''

خانقاہ کے خوبصورت باغیچے کی ہری اور ملائم گھاس پر نوجوان کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے دوشیزہ نے اپنا سوال دہرایا۔جواب میں نوجوان نے بھی سب کچھ کہہ سنایا۔اس کے پاس سنانے کو تھا بھی کیا، سوائے چوری سے بھاگ آنے والے واقعے کے۔

''یہاں کس لیے آئے ہو؟'' دوشیزہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

''معلوم نہیں، شاید زندگی کا کوئی مقصد مجھے یہاں کھینچ لایا ہو۔'' کہہ کر نوجوان دوشیزہ کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔بدلے میں وہ بھی مسکرا دی اور اس کے بعد مزید سوالات کی گنجائش نہیں رہی تھی۔اب نوجوان کے لیے کھانے کا سامان بھی آجاتا تھا۔وہی مہنگا سامان جو نوجوان کی حیثیت سے باہر تھا۔اس سے پیشتر اس کے پیٹ کی آگ کو جنگل نے بجھایا تھا، کبھی پھل اور میوہ جات سے تو کبھی پرندوں کے نرم گوشت سے۔دوشیزہ سے میل ملاقات بڑھتی ہی گئی تو ایک دن نوجوان نے کہا:

''کیا تم میرے ساتھ تاعمر رہو گی؟ مجھے تمہارے ساتھ اپنا گھر بسانا ہے۔''

''ہاں میرے عزیز.....لیکن یہ سب کیسے ممکن ہوگا؟'' دوشیزہ کی کالی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''پرانے قائدوں، ضابطوں، حد بندیوں اور بندشوں کو توڑ کر.....''

نوجوان نے دور خلا میں دیکھتے ہوئے بے فکری سے کہا۔

''مطلب بغاوت.....!'' دوشیزہ سہم کر نوجوان سے لپٹ گئی۔

دونوں ہی بخوبی جانتے تھے کہ بغاوت کا راستہ موت کی وادی سے ہو کر گزرتا ہے۔اور موت بھی کیسی.....؟ گمنام موت.....! سائنس دانوں والی اعزازی موت تو ہرگز نہیں۔سائنس دانوں والی موت تو ملک کے ہر انسان کی حسرت ہوتی تھی جو وہ اپنے ساتھ ہی لے کر پیدا ہوتے تھے۔تاریخ میں درج تھا کہ سائنس دانوں کی طرح اعزازی موت تو اس ملک کے سارے بادشاہوں کو بھی میسر نہیں آئی تھی۔

''میرے اخراجات کیسے اٹھائیں گے آپ؟'' دوشیزہ نے اچانک پوچھا۔

''ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں لیکن گھبرانے کی بات نہیں کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گا۔شاہی سپاہی نہ سہی شاہی ملازم.....نہیں نہیں ہم کاشت کریں گے۔'' نوجوان نے اعتماد سے کہا۔

دوشیزہ نے اپنے کم عمر عاشق کی نادانی اور عزم پر مسکراتے ہوئے اس کے بالوں میں اپنی لمبی اور گوری انگلیاں ڈالیں۔عاشق بھی مسکرانے لگا۔مسکراہٹ دلوں کی راحت ہوا کرتی ہے اور جب مسکراہٹوں کا تبادلہ صدق دل سے ہو تو راحت کے علاوہ بھی اپنے ساتھ بہت کچھ لے کر آتی ہے۔ایک عظیم توانائی جس کا نام عشق ہے انہیں مسکانوں، مسکراہٹوں اور قہقہوں کی مرہون منت ہے۔

''کیا آپ کو اپنی ماں کی فکر نہیں ہے؟'' دوشیزہ نے نوجوان کو احساس دلایا۔

''آج رات ہی واپس اپنے شہر جا رہا ہوں۔ویسے بھی میں کئی کئی روز اپنی عادتوں سے مجبور ہو کر جنگل میں گزارتا ہوں اس لیے ماں کے نزدیک یہ عام بات ہوگئی ہے۔میری وجہ سے ماں فکرمند تو بہت ہے لیکن میری بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں.....؟ لیکن اب آپ سے ملنے کے بعد کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

نوجوان کے پاس اپنی معشوقہ سے بدلنے کے لیے کوئی نشانی بھی نہیں تھی اور اس نے دوشیزہ کی انگوٹھی کو یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا:

''نہیں ہماری محبت کسی نشانی کی محتاج نہیں۔محبت کے جو نقوش ہمارے دلوں میں ہیں وہی اصل ہیں۔میں اپنی اس غیر فانی محبت کے بارے میں دنیا کو

بتاؤں گا تا کہ زمانوں تک ہماری محبت کے گیت دنیا میں گونجتے رہیں۔''

نوجوان کی جوشیلی باتیں سن کر دوشیزہ خائف ہوگئی۔ دونوں ہی جانتے تھے کہ ملک میں عشق ومحبت کو معیوب اور ناکارہ لوگوں کا مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ عشق تو وہاں صرف سائنس، ریاضی اور حساب جیسے مضامین سے کرنا سکھایا جاتا تھا۔ ایسے میں اس نوجوان اور دوشیزہ کے عشق کا پنپنا ٹھیک ویسے ہی تھا جیسے کسی بنجر زمین پر کوئی خودرو پودا اگ آئے۔

نوجوان اب غروب ہوتے ہوئے سرخ آفتاب کو دیکھ رہا تھا لیکن دوشیزہ کے گلابی ہونٹ دیکھ کر وہ تو یہیں بس جانا چاہتا تھا۔

''ہماری ملاقات پھر کب ہوگی؟'' دوشیزہ نے امید وار نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سائنس دانوں کے قبرستان کے باہر جب میلا لگے تو اس میں شرکت کے لیے آیئے گا، وہیں ملاقات ہوگی۔ نوجوان نے دوشیزہ کی آنکھوں میں دیکھا۔

''ہاں ضرور..... بابا جان کے ساتھ بچپن میں ایک مرتبہ گئی تھی۔ وہاں میرے پردادا مدفون ہیں۔ وہ طبیب تھے اور انہوں نے ایک ایسا نسخہ ایجاد کیا تھا کہ جسے کھا کر انسان اپنی فکرمندیوں سے آزاد ہو جاتا۔ نسخہ ضبط کر کے اس لیے ضائع کر دیا گیا کیوں کہ حکومت کو لگتا تھا کہ اگر فکر سے نجات مل گئی تو انسان کاہل اور آرام پسند ہو جائے گا اور یہ سلطنت کی بقا کے لیے ٹھیک نہیں۔ پردادا کو کوئی وظیفہ تو نہیں دیا گیا البتہ جب ان کا انتقال ہوا تو سائنس دانوں کے قبرستان میں جگہ دی گئی جس کا اعلان بادشاہ نے نسخہ ضائع کرواتے وقت ہی کر دیا تھا۔

''اس میلے میں تو بڑی بھیڑ ہوتی ہے.....'' دوشیزہ نے کہا۔

''فکر نہ کیجیے، ہم ایک دوسرے کو ڈھونڈ ہی لیں گے۔'' نوجوان مسکرایا۔

نوجوان جب دوشیزہ سے الگ ہو کر جانے لگا تو دوشیزہ نے کہا:

''اب آپ کیا کرنے والے ہو؟''

''ہماری محبت کی کہانی لکھوں گا۔'' اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''محبت کی کہانی.....؟ یہ بھی کوئی لکھنے کی چیز ہے؟ ہمارا معاشرہ تو اسے۔''

''ہاں اب وقت آ گیا ہے کہ ہمارے معاشرے اور ملک کا ذائقہ بدلا جائے۔ پہلے میں نے کاشت کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اب محبت کی کہانی لکھوں گا..... ہماری محبت کی کہانی۔ ذریعۂ معاش کے لیے خدا بندکی بنائی ہوئی یہ زمین اور اس پر اگے ہوئے جنگل ہی کافی ہیں جن پر ہر جان دار کا حق ہے۔''

محبت کی کہانی اس ملک میں کسی نے نہیں لکھی تھی اس لیے اس کا لکھا جانا آسان نہیں تھا کیوں کہ نمونے کے طور پر محبت کی کوئی بھی کہانی ملک کی کسی دانش گاہ یا کتب خانے میں دستیاب نہیں تھی۔ محبت کیا شے ہے؟ سب جانتے تھے لیکن کسی نے محبت کی کہانی کو پڑھا نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے محبت کی کہانی لکھنے کا عزم کیا۔ آخر وہ نوجوان تھا اور اپنے شہر میں سب سے انوکھا واقع ہوا تھا۔ اسے سائنس سے انکار نہیں تھا لیکن وہ اس مضمون کو پڑھنے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اسے صبح کی نرم دھوپ، تالاب میں کھلے ہوئے کنول، باغوں میں کھلے گلاب، ہوا میں اڑتے پرندے اور سبزہ زار کے معنی کچھ الگ ہی نظر آتے تھے۔ یہی اجزا اس کی محبت کی کہانی کے محرکات تھے۔

نوجوان نے اپنے شہر جا کر پہلا تجربہ کیا۔ اس نے اپنی محبت کی کہانی لکھی اور خفیہ طور پر اپنے نوجوان دوستوں کو سنائی۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ لوگ محبت کی کہانی سن رہے تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے ہمیشہ سائنس کی ایجادوں پر مبنی کہانیاں سنی تھیں۔ سب کو حیرت ہوئی کہ کہانی کا ایسا دلچسپ روپ بھی ہو سکتا ہے۔ شہر کے ایک بزرگ سے نوجوان کو معلوم ہوا تھا کہ صدی بھر پہلے تک اس ملک میں حب الوطنی اور کچھ رسم ورواج کے گیت تخلیق کیے جاتے رہے تھے، ہاں عشق وعاشقی کی داستان ان میں بھی مفقود تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا، نئے بادشاہ کے گدی نشین ہوتے ہی گیت اور لوک گیت کی روایت پر پابندی لگا دی گئی حالاں کہ گیتوں کے علاوہ ادب تخلیق کیے جانے پر پہلے ہی پابندی تھی۔ کسی بھی رسم و رواج میں گیت ممنوع قرار دیے گئے کیوں کہ گیت ملک کی ترقی میں معاون نہیں تھے۔ کئی کمزور سی وجوہات بتا کر گیتوں کے مخطوطوں اور نقلوں کو جلایا جانے لگا۔ گیت لکھنے، کہنے والوں پر عدالتوں میں مقدمے چلے اور انہیں عمر قید کی سزائیں ہوئیں۔ پھر اس کے بعد سائنس کو فروغ دیا گیا۔ کیمیائی مادے، ہتھیار، کپڑے، کاشت کے آلات، عمارتیں بنانے میں استعمال ہونے والے مادے اور آلات کی ایجادوں کے کام زوروں پر ہونے لگے۔

کچھ ہی دنوں میں نوجوان کی عشقیہ کہانی کی نقلیں شہر کے تمام نوجوانوں تک پہنچ گئیں۔ یہ بات صرف شہر تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ دوسرے شہروں میں بھی محبت کی کہانی کی نقلیں جا پہنچیں۔ ہوا یوں کہ کچھ منچلوں نے شہر سے باہر جانے والے سامان میں چوری چھپے کچھ نقلیں رکھ دیں۔ اشتہار والے کپڑے پر جب پابندی عائد کر دی گئی تو پتوں پر لکھا جانے لگا۔ یہ اس ملک کی پہلی عشقیہ کہانی تھی جو عوام تک تحریری شکل میں پہنچی تھی اور نوجوان تو اس کی طرف مائل ہی ہوتے جا رہے تھے۔ بادشاہ نے ایک خفیہ وفد کو اس مسئلے کی تفتیش کے لیے تشکیل کر دیا تھا جو ہمہ وقت اس کہانی کے مصنف کو ڈھونڈنے میں سرگرم تھا۔ شہر کے نوجوان اب نہ صرف اس عشقیہ کہانی کے حصار میں تھے بلکہ وہ بھی اب عشق کرنا چاہتے تھے۔ عشقیہ جذبے کے بیدار ہوتے ہی انہوں نے بھی اپنے جسم میں تبدیلیاں محسوس کیں۔

آخر کار عشق ومحبت کی کہانی لکھنے والا پکڑا گیا اور اس کی سزا موت سے زیادہ اور کیا ہی ہو سکتی تھی۔ ہاں اس موت کو نشانِ عبرت بنانے اور زیادہ لوگوں تک خبر کی رسائی کے لیے سالانہ میلے میں ہی نوجوان کو پھانسی دیے جانے کا حکم صادر ہوا۔ نوجوان کے چاہنے والوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی لیکن ان خیر خواہوں میں جاں نثاروں کی تعداد ابھی بھی اتنی نہیں ہوئی تھی کہ وہ بادشاہ کی فوج کا مقابلہ کر کے اپنے عشق کے ہیرو اور محبت کی کہانی کے بنیادگزار کو آزاد کرا لیتے۔

سالانہ میلے کا انعقاد بہت ہی شان وشوکت سے ہوا۔ اس میلے میں نوجوانوں کی تعداد پچھلے کئی برسوں سے زیادہ تھی بلکہ نوجوانوں کو امسال بالخصوص مدعو کیا گیا تھا۔ ملک کے دوسرے شہروں سے بہت سے لوگ آ کر سائنس دانوں

کے قبرستان کے باہر میدان میں جمع ہو گئے تھے اور وہ قبرستان میں مدفون اپنے بزرگوں کے لیے کم، عشق کے اس نوجوان قائد کے لیے زیادہ دعائیں مانگ رہے تھے۔ ابھی اس کی عمر ہی کتنی تھی۔ صرف محبت کی کہانی لکھنے پر سزائے موت! زیادہ تر لوگوں کو احساس ہو رہا تھا کہ یہ کیا ہونے والا ہے اور کیوں ہونے والا ہے؟ لیکن سب کی آوازیں حلقوم میں ہی دب کر رہ گئی تھیں۔ میدان کے درمیان میں تختۂ دار پر نوجوان مسکرا رہا تھا۔ مرنے سے پہلے آخری خواہش پوچھے جانے کا رواج تھا سو اس سے بھی پوچھا گیا ابھی وہ کچھ بتاتا کہ اس سے پہلے ہی میدان میں نوجوان کی ماں دہاڑیں مار کر بے ہوش ہو گئی۔

''میرے عزیز.....!'' ایک غمناک آواز بلند ہوئی۔ میلے کے شرکاء اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے اور خاموشی سے اس طرف دیکھنے لگے۔

''آپ آ گئیں محترمہ.....! بروقت آئی ہیں آپ۔ میں سب کے سامنے آپ کو اپنی شریک حیات قبول کرتا ہوں۔''

''ہاں ہم سب اس مقدس عمل کے گواہ ہیں۔'' عوام کی آواز گونجی۔

''ماں کا خیال رکھیے گا۔'' کہہ کر نوجوان خاموش ہو گیا۔

باغی ہو چکے نوجوانوں اور عوام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بادشاہ نے فوری طور پر اعلان کیا:

''بلاشبہ یہ نوجوان سلطنت کا باغی تھا۔ مگر اس کی لکھی ہوئی محبت کی کہانی میں ایسی مقناطیسیت ہے کہ بہت سے نوجوانوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سنا ہے اس کی کہانی میں اثر ہے جو انسانی جسموں میں تبدیلیاں پیدا کرتی ہے۔ میں یعنی ولی عہد سلطنت اور میرے مشیروں کا یہ ماننا ہے کہ یہ بھی ایک سائنسی عمل ہے۔ ایسی تحریر کا ایجاد کیا جانا جو دلوں پر قبضہ کرے۔ یقیناً سائنسی ایجاد ہے لہٰذا دستور کے مطابق اس کم عمر عاشق کو پھانسی کے بعد سائنس دانوں کے قبرستان میں دفن کیے جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔

افسوس.....صد افسوس کہ یہ ایجاد ملک کی سلامیت کے لیے خطرہ ہے اور ملک کی فلاح و بہبود کے لیے یہ فیصلہ لیا جاتا ہے۔''

بادشاہ وقت جا چکا تھا اور بہت سے نوجوان تختۂ دار کی طرف امڑ پڑے لیکن بادشاہ کے سپاہی مستعد تھے اور کسی کو تختۂ دار تک بڑھنے نہیں دے رہے تھے۔

جو شرارہ نوجوان نے چھوڑا تھا وہ اب شعلے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ بادشاہ کو علم تھا کہ یہ نوجوان خاموش نہیں رہیں گے اس لیے جس بھی نوجوان کے پاس سے عشقیہ کہانی برآمد ہوتی اسے قید خانوں کے دبیز اندھیروں میں پہنچا دیا جاتا۔ انہیں دنوں بادشاہ کے ایک مشیر نے اسے یہ خبر دی کہ اب شہر میں کچھ نئی عشق کی کہانیاں گردش کر رہی ہیں۔

ایک صبح بادشاہ کو ناشتے کی رکابی میں اشتہار والے کپڑے کا ایک ٹکڑا رکھا ملتا ہے۔ پہلے تو اسے لگا کہ کوئی خط ہو گا لیکن اسے کھولنے پر معلوم ہوا کہ اس میں عشق کی کہانی لکھی ہوئی ہے.....۔

اصل عمر سے کہیں زیادہ بوڑھی دکھنے والی عورت نے کلہاڑی کو بلند کیا ہی تھا کہ اس کے ہاتھوں کو نازک سی دکھنے والی دوشیزہ نے تھام لیا اور کہا:

''اماں آپ رہنے دیجیے۔ اب یہ سارے کام میرے ذمے ہیں۔''

بوڑھی عورت لڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ دور خلاؤں سے آنے والی لال روشنی پہاڑوں پر پھیلنے لگی اور سورج اب نکلنے ہی والا تھا۔

مارننگ شو

ایک مارننگ شو میں بیگم بلقیس ایدھی سے سوال کیا گیا کہ اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ سنائیں۔

بلقیس ایدھی نے ہنستے ہوئے بتایا کہ ایک دفعہ وہ اور ایدھی صاحب ایک پرائیویٹ کار پر سکھر جا رہے تھے ایک شادی پہ۔ رات کا وقت تھا، ایک مقام پر کچھ ڈاکو راستے میں آ گئے اور ہماری گاڑی روڈ سے اتار کر کچے میں لے گئے وہاں پہلے سے کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں اور ڈاکو لوٹ مار میں مصروف تھے۔

تھوڑی دیر میں ایک ڈاکو ہماری طرف آیا اور ڈرائیور اور ایدھی صاحب کو باہر نکلنے کا کہا۔ ان دونوں کی تلاشی لی اور جیب خالی کرا لی۔ اچانک اس ڈاکو کی نظر ایدھی صاحب پر پڑی اور غور سے ان کو دیکھنے کے بعد ایک ڈاکو جلدی سے ایک جانب کھڑی جیپ کی طرف گیا اور ایک شخص کے ساتھ فوراً واپس آ گیا۔

اس شخص نے ٹارچ کی روشنی ایدھی صاحب کے چہرے پر ڈالی اور پوچھا آپ عبدالستار ایدھی ہیں؟ جواب ہاں میں ملا تو وہ ڈاکو کا سردار ایک دم پریشان ہو گیا۔

فوری حکم ہوا کہ تمام گاڑیاں جن سے لوٹ مار کی گئی ہے ان کو مال واپس کیا جائے اور وہ شخص ایدھی صاحب کے ہاتھ چوم کر معافی مانگنے لگا۔

مزید حیرت کی بات یہ ہوئی کہ جب وہ ڈاکو ہمیں رخصت کرنے لگا تو 20 لاکھ روپے بطور چندہ ایدھی صاحب کے حوالے کیا۔ ایدھی صاحب کے انکار پر بولا سر جب میرے جیسے گنہگار پولیس مقابلے میں مارے جاتے ہیں تو ہمارا کوئی رشتے دار ہماری لاش تک نہیں وصول کرتا، ایدھی ہی ہماری لاش کو کفناتا ہے اور دفناتا ہے۔

ٹابلیٹ

جبیں نازاں
(دہلی)

شالنی بیٹے ہمانشو کی شرٹ پریس کرتی ہوئی سوچ رہی تھی۔

لاک ڈاؤن کی میعاد ختم ہوئے ایک سال گزر چکا۔۔۔ ہائے کورونا۔۔۔کورونا کا خیال آتے ہی دل دہل جاتا ہے۔ قیامت نہیں تو قیامت سے کم نہیں تھا وہ وقت۔۔۔کیسا نفسا نفسی کا عالم تھا۔۔۔کورونا نے کیا کیا غضب نہ ڈھایا۔۔۔پوری دنیا میں اپنی تباہ کاریوں کے نقوش چھوڑ گیا۔۔۔کوئی ایسا گھر نہیں جو اس وبا کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔

پہلے میرے شوہر سے نوکری چھینی، اور پھر مجھ سے شوہر۔۔۔سب کچھ تباہ کر کے رکھ دیا۔

ہمانشو آج پھر نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔۔۔ٹابلیٹ مما۔۔۔انو راگ، سوراج، سب نے خرید لیا۔۔۔ ایک میں۔۔۔وہ سسکنے لگا تھا۔۔۔میں نے کروٹ بدلی۔۔۔اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔وہ بلک رہا تھا۔۔۔میں نے ہمانشو کو جگایا۔۔۔اس نے ذرا سی آنکھ کھولی اپنے ہاتھ سے مجھے جھٹکا دیا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

شالنی کو یاد آیا ہمانشو نے ایک سال سے ٹابلیٹ کی فرمائش نہیں کی۔کیوں کہ اس کی امیدیں دم توڑ چکی ہیں۔جس کی رٹ وہ پچھلے تین سال تک مسلسل لگائے رکھا تھا۔

پہلے پہل میں اسے ادھر ادھر کی باتیں کر کے بہلا دیا کرتی تھی۔لیکن جب اسے سمجھ آئی کہ ٹابلیٹ خریدنا میرے دائرے اختیار میں نہیں۔تب اس نے اداس ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''بھگوان کسی کو امیر کسی کو غریب کیوں بناتا ہے؟''

تب ماں شالنی کا جگر چھلنی ہو گیا تھا۔۔

وہ اٹھی اور تیزی سے کمرے میں گئی۔۔۔اور ''گل لک اٹھالائی آٹھ سالہ بیٹا'' ہمانشو کو دکھاتی ہوئی بولی۔

دیکھ! تیرے لیے پیسہ جمع کر رہی ہوں اس بار ''دھن تیرس'' میں ٹابلیٹ خرید دوں گی۔

کرسی کی پشت پر سر جھکائے بیٹھا ہمانشو نے سر اوپر اٹھایا۔آنکھ پونچھتا ہوا ہنس کر ماں کے گلے لگ گیا۔

ویری گڈ مما! کتنی اچھی کتنی سندر ہے میری مما۔

ماں کا دونوں ہاتھ پکڑ کر جھومر کھیلنے لگا لیکن اب ہمانشو گیارہ سال کا ہو چکا ہے۔۔۔حالات نے اسے شاید سمجھدار بنا دیا ہے۔۔۔اس لیے ''ٹابلیٹ'' کی خواہش بھی ترک کر دی۔

''مما! اب پڑھائی آن لائن ہوا کرے گی۔۔۔اسکول کی پوشاک کیوں پریس کر رہی ہیں؟''

بیٹا ہمانشو بیڈمنٹن کے ریکٹ تھامے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔۔۔ماں کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

بیٹا! تیرا نام ''لٹل روز'' اسکول سے کٹ گیا۔۔۔''

''کیوں مما؟''

''کیوں کہ چھ ماہ کی فیس نہیں ادا کر سکی۔۔۔''

ماں سر جھکائے ہوئی بے بسی سے بولی۔۔۔

''ماں میں اسی اسکول میں پڑھوں گا۔۔۔''

''لیکن اتنے پیسے کہاں سے لاؤں گی میں۔۔۔! دس ہزار روپے میں گھر کا خرچ کیسے چلاؤں؟ چھ ہزار گھر کا کرایہ، ڈھائی ہزار تیرے اسکول کی فیس۔ پانچ سو بجلی اور پانی بل ایک ہزار میں ایک وقت کی دال روٹی بھی میسر نہیں ہو سکتی۔''

ماں شالنی نے جیسے آپا کھو دیا ہو۔۔۔گیارہ سالہ ننھے بیٹے کو ماہانہ بجٹ کی فہرست سنانے لگی۔بیٹے نے کہا۔

''میں بھوکے رہ کر پڑھوں گا''

''کتنے دن۔۔۔؟'' ماں نے زچ ہو کر پوچھا۔

''پیٹ کی آگ نہایت خطرناک ہوتی ہے سارے سپنے جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔۔سمجھے!''

شالنی نے کپڑے پرے رکھے، استری کے پلگ کی سوئچ آف کر کے اٹھی۔۔ہمانشو کے دونوں کاندھے پکڑ کر غصے میں ابل پڑی۔

اگر تو چاہتا ہے کہ میں تیرے لیے اوور ٹائم ''مال'' میں کام کروں! میں ہرگز نہیں کر سکتی۔مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی اب۔

''مما تو فکر مت کر! میں اپنا انتظام کر لوں گا۔''

ہمانشو نے اپنے کاندھے سے ماں کا ہاتھ ہٹایا۔۔۔کمرے سے نکل گیا۔

شالنی سوچنے لگی۔۔۔یہ آج کے بچے یا تو سفاک ہو گئے ہیں یا پھر حد سے زیادہ ذمے دار۔۔۔یہ اپنا انتظام کرے گا۔۔۔کہنا آسان ہوتا ہے بچے۔۔۔کچھ بھی کہہ دو!

شالنی ہمانشو کو گھر سے جاتا ہوا دیکھتی رہی اور اس کی بات سن کر سوچنے لگی پتہ نہیں کس نے اسے یہ بتا رکھا ہے۔غربت کو مجبوری مت بناؤ! آپدا میں اوسر (مشکل وقت/مصیبت میں مواقع) تلاش کرو!۔۔ا

کسی خیراتی سنگھٹن سے مدد حاصل کرے گا؟

گوگل میں دیکھ دیکھ کر الٹی سیدھی خبریں سناتا رہتا ہے۔۔

''چہارسُو''

ایک ہفتہ قبل بتا رہا تھا' اکھشر اکھشر دیپ جلے' نامی تنظیم 'بی ایل او' فیملی کے ایک بچے کو تعلیم کے لیے ایک ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ دیتی ہے۔

شالنی اٹھی موبائل پہ وقت دیکھا۔3:33 بج رہا تھا، ہمانشو کرکٹ کھیلنے گراؤنڈ جا چکا ہوگا۔۔۔ڈیڑھ گھنٹے بعد لوٹے گا۔مجھے مال سے نکلنے میں ابھی تین گھنٹے کی دیر ہے۔

شالنی کا موبائل بج اٹھا۔۔۔موبائل اسکرین پر نیا نمبر لکھا آ رہا تھا۔۔۔شالنی نے نہ چاہتے ہوئے کال ریسیو کی۔

''ہیلو میڈم!''

''ہیلو نمسکار! آپ ہمانشو کی مدر بول رہی ہیں؟''

''ہاں میڈم! لیکن میں نے آپ کو پہچانا نہیں''

میں نرس بول رہی ہوں۔آپ کا بیٹا ہمانشو میدانتا اسپتال میں ایڈمٹ ہے' تین گھنٹے سے بیہوش پڑا ہے۔۔!

کیا ہوا میرے بچے کو شالنی روتی ہوئی چیخ پڑی۔۔۔مال کے دیگر اسٹاف دوڑ پڑے۔۔۔شالنی کے ہاتھ سے موبائل گر گیا۔۔۔شالنی بھی فرش پہ ڈھیر ہوگئی۔مال میں کام کرنے والے ساتھی روپا، وجے، وویک۔آرتی، انجلی آپس میں ایک دوسرے سے شالنی کے گرنے کی وجہ پوچھنے لگے۔پھر سب نے مل کر اسے اٹھایا۔

شالنی میرا بچہ میرا بچہ کہہ کر روتی رہی۔۔مجھے ''میدانتا'' لے چلو۔۔میرا بچہ وہاں بیہوش پڑا ہے۔۔پتہ نہیں اسے کیا ہوا، کھیلنے میں گیند سے چوٹ لگی، یا کسی سے جھگڑا ہوا۔۔کہ میرا بچہ بیہوش ہوگیا۔۔۔"

شبھم دوڑا ہوا باس کے پاس گیا۔۔سب احوال سنایا۔

باس نے کہا فوراً اسے لے کر تم میدانتا جاؤ! ہاں آٹو کر لینا۔

انکت، اجالا، انجلی ساتھ چلے، شبھم آرتی وویک نے پکڑ کر شالنی کو آٹو میں بٹھایا۔۔۔ڈرائیور کو میدانتا اسپتال کا پتا بتایا۔۔۔شالنی آرتی کے کاندھے پر سر رکھے رو رہی تھی۔

ڈیڑھ گھنٹے کا سفر ڈھائی دن کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔بار بار ڈرائیور سے کہہ رہی تھی

''تیز چلاؤ ڈرائیور! رفتار تیز کرو!

میدانتا اسپتال کے باہر پارکنگ میں آٹو رکی شالنی کو ایک طرف آرتی اور دوسری طرف شبھم پکڑے ہوئے آٹو سے اترے میدانتا اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ روم نمبر 13 میں داخل ہوئے۔

نرس ان لوگوں کے آگے سر جھکائے کھڑے ہوئی تھی۔

شالنی نرس کا چہرہ دیکھ کر سناٹے میں آ گئی۔نرس کا کاندھا جھنجھوڑتے ہوئے دہاڑی:

''نرس میرا بچہ؟''

نرس شالنی کو گلے لگاتے ہوئے۔۔۔گلوگیر آواز میں بولی!

''آپ کا بچہ بہت بہادر تھا میم!'' آہ اس بچے کے ساتھ گھورانیائے ہوا! بھگوان کبھی کسی کو غریب نہ کرے۔۔۔!

شالنی نے بڑھ کر بیٹے کی لاش کو گود میں بھینچ لیا۔اور ماہی بے آب کی مانند زمین پر تڑپنے لگی۔آرتی شبھم بھی اس کی حالت زار زار پر بلک پڑے۔۔۔

نرس نے شبھم کو الگ لے جا کر بتایا۔

''میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ کسی طرح شبھم کے والدین کا رابطہ نمبر حاصل ہو جائے۔تا کہ وقت رہتے انھیں باخبر کر دوں۔۔۔لیکن میں ناکام رہی۔۔۔جب وہ آپریشن تھیٹر میں لایا گیا وہ پوری طرح بے ہوش نہیں تھا۔۔۔میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''یوں سمجھ لو تمھارے سامنے مما کھڑی ہیں۔۔تم کیا کہنا چاہو گے۔۔؟''

اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔۔۔یعنی کہ کچھ نہیں۔

آپریشن کے دو گھنٹے بعد جب ہمانشو کو ہوش نہیں آیا ڈاکٹر نے یہ کہتے ہوئے اپنی ڈیوٹی ختم کی۔

''کہ اسے ایمرجنسی وارڈ میں ریفر کر دو!''

میں نے ڈاکٹر کی غیر موجودگی میں ایمرجنسی ورڈ میں ریفر کرنے سے قبل ہمانشو کے ڈیکومنٹس، ایگری منٹ پیپر دیکھا۔

میرے پیر تلے سے زمین کھسک گئی۔اس بچے نے صرف دو لاکھ کے عوض اپنا ایک گردہ فروخت کیا تھا۔۔کیوں کہ اسے اسکول کی فیس ادا کرنی تھی۔ اور ایک ٹابلیٹ خریدنا تھا۔

افسوس! ڈاکٹر حسب معاہدہ ایک ہی گردہ نکالتا۔

رقص

افلاطون کے مطابق رقص سارے جسم کی حرکات و سکنات کے ذریعے الفاظ کی وضاحت کرنے کی جبلی خواہش کا نام تھا۔

ول۔ڈیورانٹ

دادی

میری دادی ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ موت کا کوئی وجود نہیں، لیکن ہم تب مرجاتے ہیں جب دوسرے ہمیں یاد کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

ایزابیل

قوت پرواز

(قطر کے پرعزم نوجوان کی سچی کہانی)

رئیس صدیقی

(بھوپال)

الخیر دوحہ میں قطر کے ایک خوش نصیب شہری، میرے مشفق والد، محمد المفتاح میری پیاری اور ممتا سے لبریز ماں، ایمان احمد سے یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ میں بہت جلد اللہ کی تخلیق کردہ بہترین مخلوقات کی دنیا میں آنے والا ہوں۔ خوشخبری پر دونوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ ان کے دن خوشی اور سنہری امیدوں کے ساتھ گزر رہے تھے کہ ان کے گھر میں ایک صحت مند بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ تبھی طبی چیک اپ کے دوران ڈاکٹر کو پتہ چلا کہ میری ماں کے بطن میں جڑواں بچے پل رہے ہیں۔ ایک بچے کی بجائے جڑواں بچوں کی یہ مسرّت آمیز خبر سن کر میری ماں اور والد، دونوں خوشی سے جھوم اٹھے۔ انہوں نے اللہ کی اس بہترین نعمت کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ کیا۔

لیکن، بہت جلد، یہ خوشی غم کے اندھیروں میں ڈھل گئی جب ڈاکٹر نے میرے والدین کو اسقاط حمل کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر نے اسکی وجہ یہ بتائی کہ آپ کا ایک بچہ Caudul Regression Syndrome (CRS) کا شکار ہے، جو ایک ایسی جسمانی تکلیف ہے جو ہر ساٹھ ہزار زندہ بچوں کی پیدائش میں سے صرف کسی ایک کو ہوتی ہے۔ یہ ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے کی نشوونما کو متاثر کرتی ہے، جس سے بچنے کے امکانات نہیں کے برابر ہوتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں، یہ ایک پیدائشی جسمانی تکلف ہے جس میں ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے کا کاڈل ڈویژن ساری زندگی ٹانگوں کے بغیر، جسم کے نچلے حصے کے بغیر، گزارنی پڑتی ہے۔

یہ بچہ میں ہوں۔ مجھے صرف ہاتھ کی مدد سے چلنا پھرنا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے، دوسرا جڑواں بچہ، میرا جڑواں بھائی، مکمل طور پر صحت مند ہے۔

اس افسوسناک خبر کو سن کر کچھ رشتہ داروں اور دوستوں نے میری والدہ کو میرا اسقاط حمل کرنے کا مشورہ بھی دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے مجھے اور میری والدہ کو مستقبل میں ہونے والی تکلیفوں سے نجات ملے گی۔

لیکن میرے والد اور والدہ، دونوں نے میرا اسقاط حمل نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور انہوں نے اسے اللہ کی مرضی سمجھا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ اسلامی اخلاقیات کے خلاف ہے۔

ماں اور باپ دونوں ہر وقت میری مدد کے لیے تیار رہنے پر راضی ہو گئے اور انہوں نے ایک آواز میں عزم کے ساتھ کہا ''میں اس کی بائیں ٹانگ بنوں گی اور تم آخری سانس تک اس کی دائیں ٹانگ رہو گے''۔

اس طرح، میں، ایک معذور لڑکا ہوں، اور میرا جڑواں بھائی، ایک عام صحت مند لڑکا۔ ہم دونوں 5 مئی 2002 کو پیدا ہوئے۔

میں، کاوڈل ریگریشن سنڈروم کا شکار لڑکا ہوں۔ میرا نام غانم ہے۔ یہ ایک عربی لفظ ہے، جس کا مطلب ہے خزانہ۔ اب میں ہوں غانم المفتاح اور میرا جڑواں بھائی، ایک عام صحت مند لڑکا، احمد المفتاح کہلاتا ہے۔

بہت سے اسکول مجھے داخلہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مجھے اپنے ہم جماعتوں کی طرف سے بھی میرا مذاق اڑانے اور ستانے کی وجہ سے بھی میرا اسکول جانا بہت مشکل تھا۔ تاہم، میری والدہ اور بھائی نے ہمیشہ مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کی۔ انہوں نے مجھے اپنے ہم جماعتوں سے بات کرنے، انہیں اپنی مختلف صلاحیتوں کی مالک (Differently able cummunity) برادری کے بارے میں بیداری پھیلانے کا مشورہ دیا۔

میں ایک کرشماتی مسکراہٹ، بے مثال خود اعتمادی اور دلچسپ شخصیت کے ساتھ اپنی معزوری کو قبول کرتے ہوئے اب مزید آگے بڑھ گیا ہوں۔ میں سوشل میڈیا اسٹار بن گیا ہوں اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر چالیس لاکھ سے زیادہ فالوورز کے ساتھ ایک موٹیویشنل اسپیکر بھی بن گیا ہوں۔

اگرچہ میں معذوری کی ایک غیر معمولی حالت و کیفیت کے ساتھ پیدا ہوا ہوں لیکن مجھے مثبت اور عملی قیادت کے ساتھ رکاوٹوں پر قابو پانا سیکھنا ہے، یہی چیز مجھے ایک غیر معمولی اور متاثر کن کردار بناتی ہے۔ اور اب میں سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات میں یونیورسٹی کی ڈگری کے لئے کوشاں ہوں اور ایک سفارت کار بننے کا خواہش مند ہوں۔

فطری طور پر، لوگ مجھ سے وہیل چیئر استعمال کرنے کی توقع کریں گے، لیکن میں اپنے ہاتھوں کے سہارے چلنے پھرنے پر یقین کرتا ہوں کیونکہ میرا یقین ہے کہ مجھے ہر اس چیز کا استعمال کرنا چاہیے جو اللہ نے مجھے عطا کی ہے، بجائے اس کے کہ جو میرے پاس نہیں ہے، اس پر میں ماتم کروں۔ مجھے اپنی زندگی میں اللہ نے بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے اور میں اپنی حقیقت کے ساتھ جینا پسند کرتا ہوں۔ اس میں مجھے خوبصورتی نظر آتی ہے۔

اپنی 15 سال کی عمر میں، میں قطر کا سب سے کم عمر تاجر بن گیا جب میں نے اپنی والدہ کے ایک خاص فارمولے کا استعمال کرتے ہوئے، فائیو اسٹار آئس کریم، غریبا آئس کریم، لانچ کی۔ میں پودوں پر مبنی طرز زندگی کو فروغ دے کر معاشرے پر مثبت اثرات مرتب کرنے کا پرجوش طرفدار ہوں۔ میں نے 2016 میں قطر میں اپنے کاروبار Evergreen Organics, Vegan Cafe کی بنیاد رکھی۔

اپنی عجیب و غریب اور تکلیف دہ معذوری کے باوجود، میں جاں بازی والے کھیلوں میں حصہ لینے میں لطف اندوزی محسوس کرتا ہوں، جیسے اسکوبا ڈائیونگ، اسکیٹ بورڈنگ اور راک کلائمبنگ۔

میں ایک دن پیرالمپکس ورلڈ چیمپئن بننے کے خواب کے ساتھ، بہت

باقی صفحہ ۸۸ پر ملاحظہ کیجیے

نئی فیکٹری

ذاکر فیضی
(دہلی)

رات کے تین بج رہے تھے۔'اسرار منزل' کی لائبریری میں خاموشی تھی۔چھت کا پنکھا سُست رفتاری سے ''گھر رررررر گھر رررررر'' کی آواز کے ساتھ گھوم رہا تھا۔پنکھے کی آواز بھی سنّاٹے کو توڑنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی۔رات کے اس پہر یہ سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ اسرار منزل کے عقب میں واقع قبرستان میں زیادہ سنّاٹا ہے یا انسانی آبادی میں خاموشی۔خاموشی لائبریری کے کونے کونے میں پڑی ستا رہی تھی،سنّاٹا گہری نیند سو رہا تھا۔

ایسے میں معراج مطالعے میں غرق تھا۔

جس عمارت میں یہ لائبریری قائم تھی،اس کا نام'اسرار منزل' تھا۔

'اسرار منزل' کو معراج کے دادا اسرار اللہ نے تعمیر کرایا تھا۔وہ یوں تو کاروباری آدمی تھے،مگر ان کا زیادہ وقت خدمتِ خلق اور یادِ خدا میں گزرتا تھا۔وہ اکثر'اسرار منزل' کے عین بیچ و بیچ تعمیر شدہ بڑے سے ہال نُما کمرے کے بالکل درمیان میں بیٹھ کر۔۔۔۔''اللہ ہو۔۔۔اللہ ہو''۔۔۔کا ورد کرتے رہتے تھے۔اسرار اللہ کائنات کے اسرار کو جاننے اور سمجھنے کے لیے بے قرار رہتے تھے۔

اتنی مصروفیت کے باوجود انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے سراج اللہ کی بہت اچھی پرورش کی تھی۔ان کو اخلاقیات و تہذیب کا درس دینے کے ساتھ ہی اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ بھی کرایا تھا۔سراج اللہ ملک کی ایک مشہور یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔انھوں نے ہی اپنے والد اسرار اللہ کے انتقال کے بعد اس کمرے کو لائبریری میں منتقل کر دیا تھا۔جہاں پہلے بھی کافی کتابیں موجود تھیں۔پروفیسر سراج چونکہ تاریخ کے پروفیسر تھے لہذا ان کو بھی کُتب بینی کا شوق تھا مگر ایسا نہیں،جیسا ان کے اکلوتے بیٹے معراج کو تھا۔

مطالعے کی میز پر معراج کے دائیں بائیں تاریخ،سائنس اور مذہبی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔اس کے ہاتھ میں تاریخ کی ایک اہم کتاب تھی۔معراج زمانہ قدیم کو نئے زاویے سے تلاش کر رہا تھا۔وہ ہزاروں سال پہلے کی انسانی زندگی پر غور و فکر کر رہا تھا۔اس زمانے کی انسانی زندگی پر جس زمانے میں جینے کا دارومدار شکار پر منحصر تھا۔انسان زراعت کا غلام نہیں بنا تھا۔وہ ہوموسیپئنس اور نیئن ڈیتھول (Homo Sapience and Neanderthal) کی آپسی جنگ اور جدوجہد کے بارے میں پڑھ رہا تھا۔اس کی بغل میں مذاہب اور سائنس کی کُتب موجود تھیں۔وہ حیاتِ انسانی کے رازِ سربستہ سمجھنے کے لیے نئے سرے سے تاریخ،سائنس اور مذاہب کے مطالعے میں مگن تھا۔کائنات کے مطالعے میں ڈوبا ہوا تھا۔آسمانوں کی،ستاروں کی سیر کر رہا تھا۔معراج دور کہیں تصوّرات و تخیلات کی معراج کی سرحد کو چھو رہا تھا۔لائبریری کے صدر دروازے کے اوپر لگی دیوار گھڑی کی سوئیوں کی رفتار ماحول میں پُراسراریت گھول رہی تھی۔محسوس ہوتا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو۔

لائبریری میں موجود الماریوں کی کتابیں اپنے لفظوں کے معنوں کو اپنی آغوش میں لیے گہری نیند سو رہی تھیں۔مگر مطالعے کی میز پر جو دو درجن کتابیں معراج کے دائیں بائیں اور سامنے رکھی ہوئی تھیں،وہ آپس میں محوِ گفتگو تھیں۔وہ پھسپھسانے والے انداز میں باتیں کر رہی تھیں تاکہ معراج کے مراقبے میں خلل نہ پڑے۔پھر بھی بے خیالی میں کسی کسی کتاب کی آواز بلند ہو ہی جاتی تھی۔ایک کتاب جس کا صفحہ نمبر 36 کھلا تھا اور وہ اُلٹی رکھی تھی۔اس کتاب کا دائیں طرف کا حصّہ دوسری کتاب سے لگا ہوا تھا،جس کے صفحہ نمبر 69 پر بک مارک لگا تھا۔تب ہی پہلی کتاب دوسری کتاب سے بولی:

''اے انسانی تاریخ! معراج سب سے زیادہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔۔۔آپ سے نہیں۔۔۔''

''زیادہ نہ اِتراؤ محترمہ۔۔۔۔''ڈارون کی تھیوری بیان کرنے والی تیسری کتاب نے سائنس کی کتاب پر اعتراض ظاہر کیا:

''معراج مُجھ سے زیادہ پیار کرتا ہے۔۔۔دو بار پڑھ چکا ہے۔۔۔کیا سمجھیں۔۔۔''

ان کی بات سُن کر نئی نویلی کتاب سپینس بولی:

''معراج کو سب سے زیادہ تاریخ کی کتابوں سے ہی پیار ہے۔۔۔۔بس۔۔۔بحث ختم کرو''

اسی طرح مذاہب،سائنس،فلسفے اور تاریخ کی کُتب بحث و تکرار میں لگی تھیں،اپنی بات کو ثابت کرنے کے جوش میں ان کی آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔

معراج نے جھنجھلا کر میز پر رکھی کتابوں کو ڈانٹا:

''یہ کیا بحث لگا رکھی ہے۔ہر وقت بکری کی طرح میں میں۔۔۔ذرا دیر خاموش نہیں رہ سکتیں۔۔۔یہ بھی خیال نہیں کہ میں کچھ سوچ رہا ہوں۔کسی بات پر غور کر رہا ہوں۔کسی فکر میں ڈوبا ہوا ہوں۔۔۔اب آپ لوگوں کی بالکل بھی آواز نہیں آنی چاہیئے۔''

معراج کی ڈانٹ سُن کر میز پر رکھی کتابیں خاموش ہو گئیں،مگر الماریوں میں رکھی فلسفہ،مذہب اور سیاست کی کتابوں کی نیند ٹوٹ گئی۔ان کو شرارت سوجھی اور سب مل کر میز پر موجود شرمندہ کتابوں پر ہنسنے لگیں۔معراج نے پلٹ کر ان کتابوں کی طرف بھی گھور کر دیکھا جو میز کی کتابوں پر ہنس رہی تھیں۔معراج کا مزاج دیکھ کر وہ بھی ندامت سے نیند میں اونگھنے کا ناٹک کرنے لگیں۔

کتابوں کی پھُس پھساہٹ اور ہنسنے بولنے سے لائبریری کے سنّاٹے کے سمندر میں جو لہریں اٹھیں تھیں،ارتعاش پیدا ہوا تھا۔وہ ایک بار پھر ساکت ہو گیا۔

دیواریں چُپ تھیں۔کتابوں کی الماریاں خاموش تھیں۔کتابیں

خاموش تھیں۔کتابوں کے الفاظ غنودگی میں تھے۔صرف چھت کا پنکھا''گھر رررر گھر رررر'' کی آواز کے ساتھ سناٹے کے خلاف احتجاج بلند کر رہا تھا۔

مطالعے کی میز پر لٹک رہا بلب روشن تھا، جبکہ کھڑکی کے اوپر لگی ٹیوب لائٹ نے لائبریری کو ملگجی اندھیرے اُجالے کی دُھند بنا رکھا تھا۔کُرسی پر تنِ تنہا بیٹھا معراج ڈوبا ہوا تھا، کھویا ہوا تھا۔دور کہیں شونئے میں تاک رہا تھا۔

گھر کے باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔قبرستان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے بند شیشے کے پٹ ہلکے ہلکے آواز کر رہے تھے۔پیڑوں میں سے ہو کر نکلنے والی ہوا پیڑ کی کمزور شاخوں اور پتوں کے ساتھ شرارتیں کر رہی تھی۔ٹیوب لائٹ کی چمک سے کھڑکی اور کھڑکی کے باہر کا ماحول بے حد پُراسرار لگ رہا تھا۔جھینگروں کی آوازیں فضا میں سنسناہٹ پیدا کر رہی تھیں، جس میں انجانی پھس پھساہٹیں تھیں۔جیسے کئی دن سے کوئی نیا ممبر نہ آنے کی وجہ سے قبرستان کے مُردے سر جوڑ کر میٹنگ کر رہے ہوں اور کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچتے ہوں۔

معراج مطالعے کی میز پر نگاہیں جھکائے ہوئے تھا۔بیچ بیچ میں کسی کتاب پر کوئی نشان بھی لگاتا جاتا تھا۔کاغذ کے پُرزوں پر کچھ لکھ کر مناسب مقام پر کتاب میں رکھتا جاتا تھا۔تبھی اس نے نظر اُٹھائی سامنے دیوار کو دیکھا۔دیکھتا رہا۔دیکھتا رہا۔جیسے دیوار میں ہی کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔چند منٹ کے بعد اس کے اندر عجیب سا غیر معمولی جوش و جذبہ پیدا ہونے لگا۔رگوں میں دوڑتا لہو تیزی سے رگوں میں گردش کرنے لگا۔وہ ایک دم ہی بے چین ہو گیا۔دماغ میں مختلف قسم کے خیالات گڈ مڈ ہونے لگے۔وہ دیوار کو ایسے دیکھ رہا تھا، جیسے کسی کا منتظر ہو اور وہ آ کے نہ دیتا ہو۔اس نے اچانک سامنے دیوار سے نظریں ہٹا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

وہاں کوئی کھڑا تھا۔معراج اس کو دیکھنے لگا۔کھڑکی میں کھڑا شخص بھی اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔چند منٹ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہو رہی ہوں۔شکوہ اور شکایت کی ناراضگی ظاہر کی جا رہی ہو۔چند منٹ بعد کھڑکی میں کھڑے انسان کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

معراج بھی اس کی مسکراہٹ کو جیسے سمجھ گیا۔وہ بھی جواب میں مسکرایا۔

معراج کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔چند منٹ کھڑکی کے شیشے کے دوسری طرف کھڑے انسان کو غور سے دیکھتا رہا۔یہ رابو تھا۔پھر اس نے کھڑکی کے پٹ بہت ہی احتیاط سے کھولے۔ایسے، جیسے رابو کوئی پرندہ ہو یا کوئی سایہ ہو۔کھڑکی کی آہٹ پاتے ہی اُڑ جائے گا۔غائب ہو جائے گا۔کھڑکی کھلی۔باہر کھڑا رابو تو غائب نہیں ہوا البتہ کھڑکی کے راستے تیز تازہ ہوا کا جھونکا اندر آیا۔جھونکا معراج کے جسم میں گدگدی پیدا کرتا ہوا کمرے میں پھیل گیا۔اس ہوا کے جھونکے کے ساتھ لائبریری میں پیڑ پودوں کی مخصوص بو، پھولوں کی خوشبو، گیلی مٹی کا سوندھا پن اور ساتھ ہی انوکھی سی مہک بھی کمرے میں داخل ہوئی۔ایسی مہک جس سے معراج ابھی تک انجان تھا، ناواقف تھا۔اسے اس خاص مہک کا پہلی بار تجربہ ہوا تھا۔یہ انجان سی، غیر معمولی، دلچسپ اور مزے دار مہک معراج کے دل و دماغ میں بس گئی۔اس نے مدہوشی کے سے عالم میں رابو کو دیکھا۔اس کا سب سے پیارا دوست، جگری یار رابو۔

معراج چند لمحے رابو کو یوں ہی دیکھتا رہا۔مسکرایا۔

رابو نے زبان کھولی:

''چل مرجے! سردار بلاتا ہے۔شکار کو چلنا ہے۔۔۔چل۔۔۔جلدی کر۔۔۔سردار ناراض نہ ہو جائے۔۔۔''

معراج نے رابو کی آنکھوں میں دیکھا اور شرارت سے کہا:''سردار یا۔۔۔شبری۔'' یہ کہہ کر اس نے چشمِ زدن میں کھڑکی کے پٹ پوری طرح کھولے اور باہر کود گیا۔

دونوں دوست کسی تیز رفتار چیتے کی مانند ایک جانب دوڑتے چلے گئے۔ہوائیں تیز ہو گئی تھیں۔اونچے اونچے پیڑ ہواؤں کے نشے میں جھوم رہے تھے۔چھوٹے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ تھی۔آسمان ہلکا ہلکا سُرخ ہونے لگا تھا۔۔ماحول طلسم زدہ ہوتا جا رہا تھا۔

جس وقت رابو اور مرجے قبیلے میں پہنچے شکار پر چلنے کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔سردار ایک چھوٹی پہاڑی پر کھڑا ہو کر سب کو ہدایت دے رہا تھا۔قبیلہ نواسی سر جھکائے نہایت احترام کے ساتھ سردار کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔بھور ہو رہی تھی۔آسمان میں سفیدی چمکنے لگی تھی۔سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہی ان کو شکار کے لیے روانہ ہونا تھا۔

سردار قبیلہ نواسیو سے مُخاطب تھا۔

''ہم سب شکار کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔بوڑھے اور بہت چھوٹے بچے شکار پر نہیں جائیں گے۔بوڑھا مہار تھا اور منجیرہ بھی یہیں رکے گی۔منجیرہ چند دنوں میں ہی نیا شکاری دینے والی ہے قبیلے کو۔'' سردار دھیرے سے مسکرایا اور آگے بولا۔

''اور ہاں سنو! اس بار شکار میں کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔یاد رہے۔دُشمن قبیلہ ہمارا شکار چھیننے میں کامیاب نہ ہو، اگر ایسا ہوتا ہے تو ہم سب کو مل کر مقابلہ کرنا ہوگا۔بے خوف ہو کر لڑنا ہے۔کوئی سستی اور غفلت سے کام نہیں کرے گا۔اگر کوئی شکار ادھورا چھوڑ کر قبیلے میں واپس آتا ہے تو اس کو سزا ملے گی۔تیں سورج بھر اس کو جڑواں کھانے کو ملے گا۔''

پورے تیں سورج تک جڑواں کھانے کے نام سے سارے قبیلہ نواسی گھبرا گئے اور مستعدی سے شکار کرنے کے لیے من بنا لیا۔وہ سب جانتے تھے کہ 'جڑواں' جنگلی پھلوں کو کہا جاتا ہے، وہ بھی ایسے جنگلی پھل جن میں بالکل بھی ذائقہ نہیں ہوتا۔کڑوا اور کسیلا ہوتا ہے یہ پھل سزا کے طور پر سردار کے حکم سے مجرم کو کھانا ہوتا ہے یا وہ بھوکا رہتا ہے۔

مرجے نے رابو کی طرف دیکھا۔آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ ہوا۔ایسا اشارہ جو صرف وہ دونوں ہی سمجھ سکتے تھے۔

''چہارسُو''

مرجے کے دوست رابو کو دشمن قبیلے کی شبری سے محبت تھی۔ بے پناہ محبت۔ رابو اور مرجے نے من بنالیا تھا کہ جب سب شکار کی تلاش میں اور شکار کو گھیرنے میں لگے ہوں گے تو وہ چپکے سے وہاں سے فرار ہو جائیں گے اور شبری سے ملنے نکل پڑیں گے۔

قبیلے کا سردار راکا آگے آگے چل رہا تھا۔ سردار کے ماتھے پر ایک لمبا سا مور کا پنکھ بندھا ہوا تھا۔ وہ آٹھ فٹ سے بھی اونچا چوڑی ہڈی کا انسان تھا۔ اس کے جسم کی مانس پیشیاں صبح کی سنہری روشنی میں دمک رہی تھیں۔ وہ مُنہ سے کوئی نعرہ بلند کرتا۔ جس کو سارے قبیلہ نواسی دہراتے، تمام لوگوں میں زبردست جوش و جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ سردار اپنے جسم پر شیر کی کھال کا لنگوٹ باندھے ہوئے تھا۔ اس کے ساتھ سردار کا بیٹا تھا، جس کے کاندھے پر جال تھا اور ہاتھوں میں لکڑی سے بنا لمبا سا بھالا، جس کے سرے پر پتھر لگا ہوا تھا جو بے حد نوکیلا تھا۔ باقی قبیلہ نواسیوں کے ہاتھ میں بھی تیر کمان، جال اور نیزے تھے۔ اور پتھر سے بنائے گئے ہتھیار تھے۔ وہ سب کوئی قبائلی گیت گا رہے تھے۔

بیچ میں رُک رُک ہانک بھی لگاتے جاتے تھے۔ وہ کھلے میدان سے نکل کر جنگل میں داخل ہو گئے۔ گھنا جنگل۔ جہاں دن کے اُجالے میں اندھیرا رہتا تھا۔

سردار کے حکم پر شکار کو پھانسنے کی حکمتِ عملی بنائی جا رہی تھی۔ سردار، سردار کا بیٹا اور سارے قبیلے کے لوگ کام میں لگے ہوئے تھے۔ مگر۔۔۔ مرجے اور رابو ایک پیپل کے نیچے کھڑے بہ ظاہر تو اپنے جال کو درست کر رہے تھے۔ مگر دونوں موقع کی تلاش میں تھے کہ سب کی آنکھ بچے اور جنگل کے پار پہاڑی کے پیچھے والے قبیلے جا پہنچیں جہاں رابو کی محبوبہ شبری اس کی منتظر تھی۔ انھیں اس بات کا خوف تو تھا کہ جب راز کھلے گا تو ان کے اپنے قبیلے کا سردار سزا دے گا مگر رابو، شبری کے پیار میں قربان ہونے کو تیار تھا تو مرجے اپنے دوست رابو کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کا جذبہ رکھتا تھا۔ اسی لیے دونوں دوستوں کو اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں تھی۔

وہی ہوا جو دونوں چاہتے تھے۔ موقع پا کر دونوں دوست شکار چھوڑ کر جنگل سے فرار ہو گئے اور پہاڑی کی طرف دوڑے۔۔۔ وہ دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ رابو اپنی محبوبہ کی چاہت میں اور مرجے اپنے دوست کے خاطر۔

رابو اور مرجے اپنے قبیلے سے کافی دور آ کر ایک چھوٹی پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ اس پہاڑی کے پیچھے ہی شبری کا قبیلہ تھا۔

رابو کا ارادہ تھا کہ وہ شبری کے قبیلے سے تھوڑی دور رُک کر اپنی مخصوص آواز کے اشارے سے شبری کو اپنے پاس بلائے گا۔ دونوں پیار بھرا وقت ساتھ بتائیں گے۔ اور مرجے رکھوالی کرے گا۔ مگر وہ دونوں یہ نہیں جانتے تھے۔ شبری کا قبیلہ بھی شکار کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔

انھوں نے دیکھا پہاڑی پر سے دشمن قبیلے کا سردار شاکا اپنے قبیلے کے باشندوں کے ساتھ نیچے اُتر رہا تھا۔ سردار کے ساتھ چل رہا تھا قبیلے کا سب سے طاقت ور نوجوان نرسا۔ نرسا نر بھکشی تھا۔ وہ اپنے قبیلے کے سردار کے حکم پر دُشمن قبیلے کے انسانوں کو مار کر آگ میں بھون کر کھا جاتا تھا۔

نرسا بھی شبری کو چاہتا تھا۔ سردار نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد ہی شبری کی شادی نرسا سے کر دے گا۔

رابو نے دیکھا، شبری بھی اپنے سردار باپ کے ساتھ پہاڑی سے اُتر رہی تھی۔ رابو پریشان ہو گیا۔ وہ بہت امید کے ساتھ شبری سے ملنے آیا تھا۔ اپنے قبیلے کے سردار کی ناراضگی کی بھی اس نے پرواہ نہیں کی تھی۔ رابو نے واپسی کا سوچا۔ وہ مرجے سے بولا۔۔۔ ''چل واپس اپنے قبیلے کی طرف چلتے ہیں۔۔۔ آج شبری سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔'' مرجے نے اپنے مایوس دوست کا چہرہ دیکھا۔ وہ دونوں واپسی کے لیے سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک دشمن قبیلے کے لوگوں کی نظر مرجے اور رابو پر پڑی۔ انھوں نے سردار کو بتایا۔ سردار نے فوراً ہی حکم دیا۔ ''ان لوگوں کو پکڑو۔۔۔ اس سال دیوا کے تہوار پر ان دونوں کی ہی بلی چڑھائی جائے گی۔''

دشمنوں نے مرجے اور رابو کو گھیر لیا۔۔۔ اب رابو اور مرجے کے پاس دو ہی راستے تھے کہ یا تو ان سے مقابلہ کریں یا پھر ہتھیار ڈال کر دیوا کی کرپا کے لیے اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیں۔ مگر رابو ہتھیار ڈال کر شبری کے سامنے بُزدل ثابت نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے عزیز دوست مرجے کو مقابلہ کرنے کے لیے اشارہ کیا۔

دونوں دوستوں نے اپنے نیزے ہوا میں لہرائے اور چیخ کر دشمنوں کو للکارا۔ مرجے پورے جنون کے ساتھ دشمن کے حملے کو روک رہا تھا جبکہ رابو نرسا کو ہلاک کرنے کے لیے بھیڑیے کو چیرتا ہوا نرسا پر حملہ آور ہوا۔

دونوں دوست چیخ چیخ کر دشمن پر حملہ آور تھے۔

مقابلہ جاری تھا۔

☆

معراج کے والد پروفیسر سراج اپنے خاندانی مکان ''اسرار منزل'' میں داخل ہوئے۔ فکر و تردد کی لکیریں ان کے ماتھے پر بہ آسانی دیکھی جا سکتی تھیں۔ وہ پریشان لگ رہے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی انھوں نے گھر کے ملازم کو آواز دی۔ ''رحمان!!!! ارے رحمان۔۔۔''

رحمان تیزی سے دوڑتا ہوا آیا۔ اُس نے کاندھے پر پڑے کپڑے سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور بولا:

''جی سر۔۔۔'' رحمان سمجھ چکا تھا کہ وہ معراج کے بارے میں معلوم کریں گے۔ وہ سراج منزل کا پُرانا ملازم تھا۔

''معراج کہاں ہے؟۔۔۔ میرا آنا نہیں ہوا تو بھی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ نہ ہی فون کیا۔۔۔ اور اوپر سے فون بھی اس کا بند ہے۔۔۔ کہاں ہے وہ۔۔۔'' پروفیسر سراج نے بے قراری سے پوچھا:

''سر میں کیا بتاؤں۔۔۔'' رحمان نے گھبراتے ہوئے کہا۔ ''آج تیسرا دِن ہے۔۔۔ وہ لائبریری سے باہر ہی نہیں نکلے۔۔۔''

''کیا کہتا ہے۔۔۔''

اس سے پہلے کہ پروفیسر سراج اپنی بات پوری کریں۔ رحمان جلدی

سے بولا۔۔۔''سر میں ہر ایک دو گھنٹے بعد دروازہ پیٹ رہا ہوں۔۔۔آواز دے رہا ہوں۔۔۔مگر۔۔۔''

''۔۔۔تین دن؟۔۔۔فون کیا تھا تو نے۔۔۔''انھوں نے پوچھا۔

''سر فون وہ چھوڑ کر گئے تھے لائبریری کے باہر ہی۔۔۔اور مجھ سے بہت ہی سختی سے کہا تھا کہ مجھے بالکل بھی ڈسٹرب نہیں کرنا۔۔۔'' رحمان نے گھبراتے ہوئے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔

''تُجھ سے کتنی بار کہا ہے، پانچ چھ گھنٹے سے زیادہ لائبریری میں رہا کرے تو فوراً مجھے فون کر دیا کر۔۔۔''اُن کا دایاں ہاتھ کولہے پر تھا اور بائیں ہاتھ سے ماتھے کو بے چینی سے رگڑ رہے تھے۔

سر، میں بھی کیا کروں؟ ڈاکٹر صاحب نے سختی سے منع کیا تھا۔۔۔''

''تو اور تیرا ڈاکٹر۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے پروفیسر سراج تیزی سے لائبریری کی طرف دوڑے۔ پیچھے پیچھے رحمان بھی چل پڑا۔

پروفیسر سراج نے اپنے بوڑھے ہاتھوں سے لائبریری کے دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے بیٹے کو آواز لگا رہے تھے۔۔۔'معراج۔۔۔او معراج۔۔۔باہر آ بھئی۔۔۔''

پروفیسر صاحب کا بی پی ہائی نہ ہو جائے، یہ دیکھ کر رحمان پریشان ہو گیا اور پوری طاقت سے دروازے پر دھکّے مارنے لگا۔ اسرار منزل میں استعمال کی گئی لکڑی آج بھی بہت مضبوط تھی۔ چند دھکوں سے اس کا کیا بگڑتا۔ البتّہ رحمان کا سانس پھول گیا۔ پروفیسر سراج پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ چند منٹ دونوں خاموش کھڑے رہے۔ اچانک اندر کچھ آواز ہوئی۔

مالک نوکر دونوں اپنا رُتبہ بھول کر ایک ساتھ کان لگا کر اندر کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگے۔

اندر سے آوازیں آ رہی تھیں جیسے معراج کسی سے غصّے میں زور زور سے بول رہا ہو۔

پروفیسر سراج سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کیا کریں۔ تب ہی رحمان بولا:

''سر، میں باہر سے کچھ لوگوں کو بلا لاؤں۔۔۔دروازہ توڑ دیتے ہیں''

رحمان کی اس بات پر انھوں نے بے خیالی میں کہا۔۔۔''ہاں ہاں کچھ بھی کر۔۔۔دروازہ توڑ۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے پروفیسر سراج جیب سے فون نکالنے لگے۔ انھوں نے اس وقت ڈاکٹر سوشیل کو فون کرنا ضروری سمجھا۔ جس کے زیرِ نگرانی معراج کا علاج چل رہا تھا۔

ڈاکٹر سوشیل نے تمام حال سننے کے بعد کہا:

''پروفیسر سراج! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کی اُلجھن کو سمجھ سکتا ہوں۔ مگر مجھے آپ کے گھر پہنچنے میں کم سے کم دو گھنٹے لگیں گے۔۔۔ تب تک آپ سنبھالیے۔۔۔پریشان نہ ہوں۔''

پروفیسر سراج گیلری میں پڑی آرام کُرسی پر بے آرامی سے بیٹھ گئے۔

کُچھ دیر بعد پروفیسر سراج کے دو شاگرد آ گئے اور رحمٰن بھی دو پڑوس کے لڑکوں کو بلا لایا۔ سب نے مل کر لائبریری کا دروازہ توڑنا شروع کر دیا۔ جس وقت لائبریری کے دونوں پٹ کھلے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر سوشیل اور پروفیسر سراج لائبریری میں داخل ہوئے۔ اُن کے چہرے پر تفکرات کے نشان نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر سوشیل کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ان کے لیے اس طرح کی باتیں معمول کا حصّہ تھیں۔

سب نے دیکھا۔ لائبریری میں نیم تاریکی تھی۔ چھت کے کونوں میں مکڑی کے جالے تھے۔ چھت کی چھپکلی بادامی رنگ کے ایک کیڑے کو گھات جمائے دیکھ رہی تھی۔ وہ شکار کو جھپٹنے کو تیار تھی۔

معراج کے جسم پر صرف انڈرویئر تھا۔ اس کے ماتھے پر میز صاف کرنے کے کپڑے کی ایک پٹّی بندھی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں جالے صاف کرنے والا لمبا ڈنڈا تھا، جس کے اوپری سرے پر بریڈ پر بٹر لگانے والا چاقو بڑے ہی بے ڈھنگے پن سے باندھا گیا تھا۔

معراج نے سب لوگوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ ڈاکٹر سوشیل کی طرف بڑھا۔

''اے مانجھری قبیلے کے سردار، میرا دوست جسے تو نے قتل کر دیا، آخر اس کا قصور کیا تھا۔ یہ کہ وہ تیرے قبیلے کی ایک لڑکی سے پیار کرتا تھا۔ میں معراج ہوں۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ تیرے اس نرسا سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں تجھے اور تیرے نرسا کو نہیں چھوڑوں گا۔۔۔نرسا۔۔۔'' کہتا ہوا معراج میز پر سے ایسے کودا جیسے وہ میز نہیں کوئی چھوٹی سی پہاڑی یا کوئی اونچا پیڑ ہے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کا چاقو والا سرا ڈاکٹر سوشیل کی طرف کر لیا اور تیزی سے ان کی طرف لپکا۔

پروفیسر سراج چیخے: ''معراج ہوش میں آؤ۔۔۔یہ کیا حماقت ہے۔ کیا کر رہے ہو۔۔۔'' کئی لڑکوں نے معراج کو پیچھے سے داب لیا۔ مگر معراج لمبا چوڑا اور تندرست و مضبوط جسم کا تیس سالہ جوان تھا۔ اس لیے کسی کے بس میں آسانی سے نہیں آ رہا تھا۔ وہ عجیب و غریب آوازیں اپنے حلق سے نکال رہا تھا۔ جب تک پانچ نوجوان لڑکوں نے اسے اپنے قابو میں کیا، تب تک ڈاکٹر سوشیل نے معراج کے لیے انجکشن تیار کر لیا۔

انجکشن لگنے کے چند منٹ بعد تک اس پر جنون سوار رہا۔ وہ چھپکلی کے منھ میں آئے کیڑے کی طرح چند منٹ جھٹپٹاتا رہا اور کچھ نہ کچھ بڑبڑاتا رہا۔

☆

اسپتال میں ڈاکٹر کے کیبن میں ڈاکٹر سوشیل کے سامنے پروفیسر سراج اور معراج کا دوست ابھے کمار اُداس و پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھے اور معراج کی دوستی کالج کے زمانے سے تھی۔

ڈاکٹر سوشیل نے پروفیسر سراج کی پریشانی اور ابھے کی اداسی کو دیکھتے ہوئے کہا:

''پروفیسر صاحب میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ معراج ایک بے حد ذہین شخص ہے۔ ایسے لوگ یا تو سماج کے لیے بہت ہی زیادہ خطرناک

ہوتے ہیں یا بہت ہی زیادہ مفید۔ یہ ڈیپنڈ کرتا ہے کہ اس کی پرورش کن حالات میں ہوئی اور اس کا ذہن و دل کس طرف جا رہا ہے یا کام کر رہا ہے۔ کبھی کبھی یہ سماج کے لیے جہاں فائدے مند ثابت ہوتے ہیں وہیں کچھ معاملوں میں چند لوگوں کے لیے ہی سہی ایک بڑا مسئلہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ معراج انسان سے محبت کرنے والا آدمی ہے۔ اسے انسانیت سے محبت ہے۔ دنیا میں موجود تمام لوگوں کے لیے دل میں رحم ہے۔ محبت اور دوسروں کی مدد کرنے کا جذبہ رکھتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اسے کتابیں پڑھنے کے شوق نے ذہنی بیمار بنا دیا۔ کتابوں کی دنیا کو وہ حقیقی سمجھ کر اُس میں ڈوب جاتا ہے۔ تصوّر کی دنیا اس کی حقیقی دنیا بن جاتی ہے۔ یہ بات کسی حد تک بہت خطرناک ہے۔ اسے دنیاوی کاموں سے جوڑنا ہوگا۔ لوگوں سے رغبت پیدا کرنی ہوگی۔ دماغی طور پر صحت مند رہنے کے لیے جلد سے جلد اس کی زندگی میں کسی عورت کا آنا ضروری ہے، ورنہ اس کی یہ بیماری بڑھ سکتی ہے۔ مسائل خطرناک روپ اختیار کر سکتے ہیں ایسی صورت میں اس کا علاج تو مشکل ہوگا ہی اس کو سنبھالنا بھی مشکل ہو جائے گا اور پھر سوائے مینٹل ہاسپٹل کے ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں رہے گا۔''

پروفیسر سراج سر جھکائے ڈاکٹر کی باتیں سن رہے تھے جیسے وہ ان تمام باتوں سے پہلے سے ہی آگاہ ہوں۔ وہ تو سوچ رہے تھے، کاش وہ اس کو اکیلا چھوڑ کر نہ جاتے۔ معراج کتابوں کی دنیا کا واسی نہ بنتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اُن سے نادانی تو ہو چکی تھی۔

ابھے ڈاکٹر کی باتیں بہت ہی غور سے سن رہا تھا۔ معراج کی بیماری کو جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے عزیز دوست کی ذہنی گتھیوں کو سمجھنا چاہتا تھا۔

تب ہی ڈاکٹر سوشیل نے ابھے سے پوچھا: ''ابھے یہ تو میں آپ سے پہلے بھی معلوم کر چکا ہوں کہ اس کی زندگی میں اب تک کوئی عورت یا لڑکی آئی یا نہیں، آپ نے بتایا کہ نہیں آئی۔۔۔ مگر میں اب یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ تیس سال کا تندرست آدمی ہے۔ اس کی کوئی سیکس لائف ہے یا نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ کیا کبھی آپ نے اسے پورن موویز وغیرہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھا یا نہیں۔۔۔ یا کوئی اسی طرح کی حرکت دیکھی یا اس نے شیئر کی ہو۔''

ڈاکٹر سوشیل کی اس بات پر پروفیسر سراج نے لمحہ بھر کو ڈاکٹر سوشیل کی طرف دیکھا اور نظریں دوسری طرف کر لیں۔

ابھے کمار معراج کا عزیز دوست تھا۔ کچھ دیر ڈاکٹر کو ایسے دیکھتا رہا، جیسے ذہن پر زور دے کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر بولا:

''ڈاکٹر صاحب حقیقت تو یہ ہے کہ کالج کے زمانے سے لے کر یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کمپلیٹ ہونے تک ہم اکثر ملتے تھے۔ یونیورسٹی میں تو کوئی ایسی بات میرے اوبزرویشن میں نہیں آئی۔ پچھلے دو سال سے ہم لوگ ایک دوسرے سے بہت کم مل پاتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ میں اس سے ملنا چاہتا تھا مگر وہ نہ جانے کس دنیا میں کھو چکا ہے۔ اس لیے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کی سیکس لائف کیا ہے۔ ہے بھی یا نہیں۔۔۔''

ڈاکٹر سوشیل نے ''اُہنہ ں ں ں'' کرتے ہوئے لمبی سانس لی اور اپنی کہنیوں کو میز پر ٹکاتے ہوئے پروفیسر سراج کی طرف رُخ کیا:

''پروفیسر صاحب! آپ کیا کہنا چاہیں گے اس بارے میں؟''

پروفیسر سراج کے چہرے پر اُلجھن اور بے بسی کے تاثرات تھے۔ وہ عجیب سی کشمکش میں تھے۔ بولے:

''ڈاکٹر صاحب یہ تو میں کئی سال سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ لائبریری میں آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے اپنے آپ کو بند رکھتا تھا۔ پڑھتا رہتا تھا۔ اور جب وہ خود ہی باہر نکلتا۔ تو اس کا رویہ تھوڑا عجیب سا رہتا تھا۔۔۔ مگر اس طرح کا دورہ؟؟؟۔۔۔ تین دن سے لائبریری میں تھا۔۔۔ پتہ نہیں اس نے کچھ کھایا بھی یا نہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ لائبریری میں کھانے پینے کا انتظام رہتا ہے؟'' ڈاکٹر سوشیل نے استفسار کیا۔

''جی ہاں ڈاکٹر صاحب، میں نے ملازم سے کہہ کر لائبریری میں بسکٹ، بریڈ، اسنیکس، ایک فریج بھی رکھوا دیا ہے جس میں دودھ، پھل وغیرہ بھی رہتے ہیں۔ لائبریری میں واش روم بھی ہے۔''

پروفیسر سراج کی اس بات پر ڈاکٹر سوشیل طنزیہ انداز میں مسکرائے:

''پروفیسر صاحب، آپ نے بھی سارے ہی انتظامات۔۔۔''

وہ اپنی بات کو درمیان میں چھوڑ کر مسکرائے اور آگے بولے۔۔۔'' خیر چھوڑیے۔''

''ڈاکٹر سوشیل، آپ مجھے یہ بتائیں کہ اب کیا کرنا ہے۔۔۔ وہ ٹھیک تو ہو جائے گا نا۔۔۔'' پروفیسر سراج نے پوچھا۔

''پروفیسر صاحب ایسے مریض کے ساتھ سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ انھیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی مرض کا شکار ہیں۔ انی وے (anyway)۔۔۔ یہ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ وہ سائی کوٹک ڈس آرڈر کا شکار ہے۔ اس کے دماغ میں Dopamine اور serotonin نام کے کیمیکل کی مقدار کافی بڑھ گئی ہے۔ جس کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ دراصل اس مرض کا نام Schizophrenia ہے۔ وہ اس کا شکار ہو چکا ہے۔''

ڈاکٹر سوشیل کی جیسے ہی بات مکمل ہوئی ابھے نے پوچھا:

''ڈاکٹر صاحب، یہ مرض کیسے اور کیوں ہوتا ہے؟'' ابھے کے اس سوال پر ڈاکٹر سوشیل نے ایک لمبی سانس لی اور پروفیسر سراج کی کی طرف دیکھا۔۔۔ اور بولے:

''اس کی کئی وجہیں ہوتی ہیں۔ یہ مرض جینیٹک بھی ہوتا ہے اور کئی بار ماحول کی وجہ سے بھی ہو جاتا ہے مگر اس کے سمٹمس، فیملی میں کہیں نہ کہیں پہلے سے پائے جاتے ہیں۔ چالیس پرسنٹ یہ بیماری فیملی سے ہی آتی ہے۔ ماں کی طرف سے بھی اور فادر کی طرف سے بھی۔ بس پرسنٹیج الگ الگ ہوتی ہے۔ اگر اکیلے باپ یا ماں کی طرف کی فیملی سے ہو تو بارہ فیصد اس کی امید ہوتی ہے کہ مرض ٹھیک

ہوجائے گا۔۔۔ یہ مرض اٹھارہ سے تیس سال کی عمر کے درمیان ہوتا ہے تو مشکل ہوتا ہے مریض کا علاج کرنا۔ مگر تیس کے بعد اگر یہ مرض آگے بڑھتا ہے تو علاج میں کم مشکلیں آتی ہیں۔ ہم لوگوں کو صبر سے کام لینا ہوگا۔ پروفیسر صاحب اس مرض میں مریض خود کوئی صحیح فیصلہ نہیں لے پاتا ہے۔ ہمیں اس کے لیے صحیح فیصلہ لینا ہوگا۔ اس کا حوصلہ بڑھانا ہوگا۔ ایسے لوگ بہت زیادہ جذباتی ہوتے ہیں۔ ہمیں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، اسی حساب سے ہم اس کے علاج کی اسٹریٹجی بنائیں گے۔'' ''ڈاکٹر سوشیل۔۔۔ اس دن میں نے دیکھا۔ اس میں غیر معمولی طاقت آگئی تھی۔ وہ پانچ پانچ نوجوان لڑکوں کے قبضے میں نہیں آرہا تھا۔ ایسا کیوں؟'' پروفیسر سراج نے دریافت کیا۔

ڈاکٹر سوشیل نے چشمہ اپنی آنکھوں سے اُتارا اور چشمے کے کیس سے کپڑا نکال کر اس کو صاف کیا۔ میز پر رکھی فائل کو اپنے آگے کھینچا اور بائیں ہاتھ سے میز پر رکھے گلوب کو دھیرے سے گھماتے ہوئے کہا۔

''اس مرض میں یوں تو مریض اپنی صحت اور عمر کے حساب سے ہی طاقت رکھتا ہے۔ مگر جب اس پر اٹیک ہوتا ہے تو اس کے اندر اپنی فطری قوت سے کئی گنا طاقت بڑھ جاتی ہے۔ یا کہہ سکتے ہیں کہ جسم کی ساری انرجی سمٹ کر ایک نقطے پر آجاتی ہے۔۔''

ابھے نے پوچھا: ''علاج کب تک چلے گا؟''

ڈاکٹر سوشیل نے اپنی کُرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا:

''چند مہینے، ایک دو سال اور پانچ سال بھی لگ سکتے ہیں۔۔۔ خیر پریشان نہ ہوں۔ ابھی مریض ہماری نگرانی میں ہے۔۔۔''

ڈاکٹر سوشیل نے اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ ان کے کیبن میں علی داخل ہوا۔ علی، ابھے اور معراج یہ تینوں کالج کے زمانے کے دوست تھے۔ علی نے ایم اے کے بعد تعلیم کو جاری نہیں رکھا۔ مگر ابھے اور معراج نے اعلیٰ تعلیم کی طرف اپنا قدم بڑھا دیا تھا۔

علی جب کیبن میں آیا تو اس کا چہرہ اداس و پریشان تھا۔ اس نے آتے ہی ابھے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ سب کی طرف اس طرح سے دیکھا، جیسے وہ سب کو ہائے، ہیلو بھی کہنا چاہتا ہے اور معراج کہاں ہے، کس حال میں یہ بھی جاننا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر سوشیل نے سوالیہ نگاہوں سے علی کو دیکھا۔ ابھے نے علی کا تعارف کرایا:

''ڈاکٹر صاحب، یہ علی ہیں میرے اور معراج کے کالج کے زمانے سے دوست ہیں۔ میں نے ان کو معراج کے بارے میں فون پر بتایا تھا۔ یہ سیدھا آفس سے چلے آرہے ہیں شاید۔۔۔''

پروفیسر سراج بھی علی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے علی کو نگاہیں اُٹھا کر اس انداز سے دیکھا جیسے علی کے سلام کا جواب دے رہے ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہنا چاہتے تھے کہ دیکھو معراج کی حالت کیا ہوگئی۔ اس سے مل لو۔ اس کو آپ جیسے دوستوں کی ضرورت ہے۔

اچھا پروفیسر صاحب میں اجازت چاہتا ہوں۔ مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔'' ڈاکٹر سوشیل نے اپنا ہاتھ پروفیسر سراج کی طرف بڑھایا۔

پروفیسر سراج اور ابھے بھی اپنی اپنی نشستوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''میں شام کو راؤنڈ پر آؤں گا۔ میرا جونیئر اور نرسیں موجود ہیں۔ کوئی بات ہو تو ان سے مل سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر سوشیل نے پروفیسر سراج کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا۔ ''آپ لوگ فکر نہ کیجئے گا۔'' ڈاکٹر نے اُچٹتی سی نگاہ تینوں پر ڈالی اور چلے گئے۔ پروفیسر سراج کے ساتھ ابھے اور علی بھی ڈاکٹر سوشیل کے کیبن سے باہر نکل آئے اور معراج کے وارڈ کی طرف چل پڑے۔

معراج اپنے بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ پروفیسر سراج کے کئی شاگرد بیٹھے تھے۔ انھوں نے نے کہا: ''آپ لوگ گھر چلے جائیں۔ میں یہاں ہوں۔'' یہ سن اکر ایک لڑکے نے کہا:

''کوئی بات نہیں سر ہم لوگ باہر بیٹھتے ہیں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتایئے گا۔''

یہ کہہ کر لڑکے باہر چلے گئے۔

علی بہت ہی پیار سے معراج کو دیکھنے لگا۔ خوب تندرست لمبا چوڑا ساڑھے چھ فٹ کا یہ شخص علی کو کوئی معصوم بچہ لگا۔ جو گہری نیند سو رہا تھا۔ پروفیسر سراج ابھے سے بولے:

''آپ اب گھر چلے جاؤ۔۔۔ فریش ہو کر آجانا۔۔۔ تھک گئے ہوگے۔''

ابھے نے کہا: ''کوئی بات نہیں سر۔۔۔ مجھے ایک آرٹیکل لکھنا ہے۔''

ابھے فری لانس جرنلسٹ تھا۔ ''ایڈیٹر کا فون آیا تھا۔ میرے پاس لیپ ٹاپ ہے، میں یہاں بھی لکھ سکتا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ہاں آپ گھر چلے جائیں۔''

'گھر' کے نام سے عابدہ کا چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ انھوں نے ندامت و شرمندگی سے سوتے ہوئے معراج کو دیکھا اور سوچا، بیس سال پہلے مُجھ سے جو حماقت ہوئی تھی اس کی سزا میرا بیٹا بھگت رہا ہے۔ انھوں نے نے دل ہی دل میں اپنے بیٹے سے معافی مانگی۔ وہ اس کے قدموں کے پاس رکھے پلاسٹک کے اسٹول پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے لمبی سرد آہ بھری اور خود سے من ہی من کہا: 'تیری ایک غلطی نے تیرے بیٹے کی زندگی تباہ کر دی سراج۔۔۔'

وہ بیس سال پہلے اُس بے وقوفی کے بارے میں سوچنے لگے۔ جب معراج دس سال کا تھا۔ اس کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ اس وقت چالیس برس کے تھے۔ اپنی ایک شاگردہ کے عشق میں گرفتار ہوگئے۔ عابدہ بھی پروفیسر سراج سے محبت کرتی تھی۔ شادی کی بات آئی تو عابدہ کے والد نے شرط رکھی کہ میری بیٹی بیاہ کر 'سراج منزل' نہیں جائے گی، انھیں گھر داماد بننا ہوگا۔ پروفیسر سراج دو سال تک عابدہ کے والد کو ٹالتے رہے اور عابدہ کو منانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر وہ کسی بات میں بھی کامیاب نہ ہوسکے۔ آخر کار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے بارہ سال کے بیٹے کو ملازم رحمان کے سہارے چھوڑ کر عابدہ کے گھر وداع ہوگئے۔ پروفیسر سراج نے شہر میں کئی مکانات بنا رکھے تھے۔ جس سے کرائے کی اچھی

خاصی رقم آتی تھی۔اس رقم کو انھوں نے معراج کے نام وقف کر رکھا تھا۔جس سے معراج کے اخراجات پورے ہوتے۔عابدہ سے شادی کے بعد ایک سال تک تو وہ ایک دو گھنٹے کے لیے گھر آتے رہے۔معراج کی تعلیم کی باتیں پوچھتے تھے، مُلازم رحمان کو طرح طرح کی ہدایتیں دیتے اور چلے جاتے تھے۔کبھی کبھی معراج بھی اپنی سوتیلی ماں کے پاس چلا آتا تھا، پر نہ جانے کیا سوچ کر عابدہ کے والد کو اس کا آنا پسند نہیں تھا۔معراج اس بات کو سمجھنے لگا تھا۔وہ بہت حساس بچّہ تھا۔اس نے اپنی سوتیلی ماں کے پاس جانا بھی چھوڑ دیا۔

پروفیسر سراج زندگی کی الجھنوں میں الجھتے چلے گئے۔بیوی کے ناز اُٹھانے کے ساتھ ساتھ سیمیناروں میں شرکت اور کتابیں پڑھنے اور لکھنے میں ایسے مصروف ہوئے کہ وہ چاہ کر بھی معراج کے لیے وقت نہیں نکال پاتے تھے۔ان کا 'سراج منزل' آنا کم ہوتا گیا۔کبھی کبھی ایک دو گھنٹے کے لیے آجاتے تھے۔معراج نے بہت خاموشی سے اپنی الگ دنیا بنالی تھی۔وہ اسکول اور کالج کے علاوہ اپنا سارا وقت سراج منزل کی لائبریری میں گزارنے لگا۔اسے کتابوں سے عشق تھا۔ہر وقت مطالعے میں مشغول رہتا۔اس کا معمول بن گیا تھا۔صبح اُٹھ کر تیار ہوتا۔ اسکول چلا جاتا۔گھر کے دیگر کام اور ذمہ داریاں رحمٰن نے سنبھال رکھی تھیں۔ معراج کے کپڑے وغیرہ بھی وہی دھوتا تھا۔اسی طرح معراج بڑا ہوتا رہا۔آگے بڑھتا رہا، پڑھتا رہا اور اسکول سے یونیورسٹی کا سفر طے کیا۔

پروفیسر سراج اس وقت بیٹھے اپنے اس فیصلے پر نادم تھے۔انھوں نے کیوں عابدہ سے شادی کی۔وہ معراج کے بارے میں سوچ رہے تھے۔اپنے ماضی سے شرمندہ تھے تو معراج کے مستقبل کے لیے فکرمند۔وہ معراج کو یک ٹک دیکھے جارہے تھے۔

ابھے اور علی معراج کی بیماری اور اس کے علاج کے تعلق سے باتیں کررہے تھے۔معراج سو رہا تھا۔

(زیرِاشاعت ناول کا پہلا باب)

- بقیہ -

قوتِ پرواز

سے کھیلوں میں تربیت حاصل کر رہا ہوں۔مجھے یقین ہے کہ کھیلوں میں تمام ملکوں کو متحد کرنے اور ان کے بین الاقوامی تعلقات میں مدد کرنے کی منفرد صلاحیتیں موجود ہیں۔یہ ایک اہم سماجی بندھن کے طور پر بھی کام کرتے ہیں۔

اللہ کے فضل سے میں نے لبنان میں فلسطینی پناہ گزینوں اور دیگر فلاحی تنظیموں کے لیے بھی دس لاکھ ریال جمع کیے۔مجھے فلاحی سرگرمیوں کے لیے قطر اتھارٹی کی طرف سے نیکی اور انسانیت کے سفیر، امیر کویت کی طرف سے امن کے سفیر اور نوجوانوں کے لیے عرب سوشل نیٹ ورکنگ کے علمبردار کے طور پر اعزاز حاصل ہے۔

اللہ مجھ پر کافی مہربان ہے۔قطر کے بادشاہ نے مجھے فیفا ورلڈ کپ 2022 قطر کا باضابطہ سفیر بنایا۔اس نے مجھے دنیا بھر میں مشہور ہالی ووڈ اداکار مورگن فری مین کے ساتھ اسٹیج شیئر کرنے کا شاندار موقع فراہم کیا۔یہ سچ بتانے کا صحیح موقع تھا کہ اللہ کی بارگاہ میں ہر کوئی، خواہ وہ کسی بھی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو، اللہ کے نزدیک صرف انسان کا نیک عمل ہی اہم ہے، آدم زاد کا رنگ یا رتبہ نہیں۔مزید یہ کہ قطر کے بادشاہ اور عوام کی طرف سے دنیا کے لیے یہ ایک دل کو چھو لینے والا پیغام ہے کہ مجھ جیسے معذور کے ساتھ بھی تمام انسانی جذبات و احساسات کے ساتھ، ایک عام انسان کی طرح برتاؤ کیا جائے۔

اپنی زندگی میں، میں نے ہر طرح کے فکر انگیز چیلنجوں پر قابو پالیا ہے۔پھر بھی، ایک مسئلہ باقی ہے، باقاعدگی سے طبی علاج اور سرجری سے نمٹنا۔ لیکن، میں جانتا ہوں کہ اللہ پر اپنے ایمان، یقین اور لگن کے ساتھ، میں اپنے عزائم کو پورا کرنے کے لیے کامیاب رہوں گا۔

اللہ کا شکر ہے کہ جوں۔۔۔میں یو این یوتھ فورم نے مجھے امریکہ کے نیویارک میں واقع اقوام متحدہ میں معزوروں کے احساس و جذبات عالمی معاشرہ کے ساتھ ساجھا کرنے کا موقع دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انسانی زندگی کی تاریخ کی ایک بہترین مثال ہے کہ میں نے قطر اور پوری دنیا کے لاکھوں لوگوں کی محبت، عزت اور تعریف و ستائش حاصل کی ہے اور میں بہت سے لوگوں کے سر اس کا سہرا باندھنا چاہوں گا۔خاص طور پر، میرا خاندان اور میرا وطن، قطر۔

پھر بھی، میں اپنے ہی موجودہ ریکارڈز کو توڑنے اور اپنے خیر سگالی جذبات کو دل و جان سے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ کامیابی کے راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پرعزم ہوں۔

میری کہانی سننے کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ جو درحقیقت، عاجزی اور فخر، غم اور خوشی، مایوسی اور امید، جدوجہد اور عزم، کوشش اور لگن، اعتماد اور بھروسہ، کامیابی و کامرانی، ہمت و قناعت اور اللہ پر یقین کامل کی عکاسی کرنے والے مختلف رنگوں سے بھری ہوئی ہے

"دوستی کے سراب"

نوید سروش

(میرپورخاص)

کوئی تو راہ نما میرا ہم سفر کر دے
مجھے بھی منزلِ مقصود کی خبر کر دے
لکھوں جو شعر دلوں میں اتر اتر جائیں
میرے کلام کو دنیا میں معتبر کر دے
بھٹکتا پھرتا ہوں، قریہ بہ قریہ کو بہ کو
خوش نصیب عطا مجھ کو ایک گھر کر دے
بہت طویل میری داستان ہے اس کو
کسی مریض کے جیون سے مختصر کر دے
اسے بھلانے کی مانگی تو ہے دعا میں نے
میری دعا کے اثر کو بے اثر کر دے
جو گھر اُجاڑتے پھرتے ہیں بسانے والوں کے
کوئی انہیں کو زمانے میں در بہ در کر دے
لدی ہوئی ہے سمندر میں جو سفر کے لیے
تو ایسی ناؤ کو طوفان کی خبر کر دے
مجھے نوید جو دیتا ہے محبت کی
قدم قدم پہ اسے تیرا راہ بر کر دے

○

نذیر فتح پوری

(بھارت)

نیندوں کے بے پناہ حصاروں کو توڑ کے
پچھتا رہا ہوں "خواب پرندوں" کو چھوڑ کے
خود ساختہ اناؤں کی دیوار توڑ کے
دشمن کو بھی گلے سے لگا لیجیے دوڑ کے
پھر گر پڑی ہے وقت کی دیوار توڑ کے
تصویر جو بنائی تھی ٹکڑوں کو جوڑ کے
دنیا اسی کے سامنے ہو جائے سرنگوں
کر لے جو بس میں وقت، کلائی مروڑ کے
اب اور کوئی نشہ مرے کام کا نہیں
میں پی رہا ہوں وقت کی نبضیں نچوڑ کے
ظاہر میں جیسے، ویسے ہی باطن میں ہیں نذیر
دیکھا ہے اپنے آپ کو اکثر جھنجھوڑ کے

○

سہیل ضرار خلش

(لندن)

دل کی آنکھوں نے خواب دیکھے ہیں
روح پہ گرتے شہاب دیکھے ہیں
ربط باقی نہیں رہا خود سے
دوستی کے سراب دیکھے ہیں
کس تعلق کی بات کرتے ہو
چہرہ چہرہ نقاب دیکھے ہیں
اب تو شکوہ ہجر بھی نہ رہا
وصل کے یوں عذاب دیکھے ہیں
کوئی پوچھے خلش وضع داری
کہنا مفتی وہاب دیکھے ہیں

○

ڈاکٹر قطب سرشار
(مہاراشٹر)

سونے کے الفاظ پروکر نور کے سیمیں دھاگوں میں
چاند سحر کی گود میں سوئے سورج شب کی بانہوں میں

بیتے موسم کے بوسوں کے لمس گلابی ہوتے تھے
رچی بسی بارود کی بو ہے آج ہوا کی سانسوں میں

گیت غزل کے رنگ میں گائیں اور غزل کو گیت کریں
شام غزل یا شعر کی محفل سب یکساں ہے راتوں میں

کس سے ملیں کیا بات کریں ہر شخص کا اپنا لہجہ ہے
ملنا جلنا کھیل ہے کھیلو کیا رکھا ہے باتوں میں

سورج چاند ستارے سارے کرنوں کے بیوپاری ہیں
بیچ رہے ہیں اپنے اجالے جو کالے بازاروں میں

تخلیقی اظہار کی فنی باریکی بس اتنی ہے
تعبیر رنج و راحت ہے پھول پرونا کانٹوں میں

صدیوں نے ماتھا ٹیکا تھا اب ہر لمحہ سرکش ہے
ہم منزل ہم راہ نما تھے آج کھڑے ہیں راہوں میں

چہروں کی اس بھیڑ میں سارے چہرے ملتے جلتے ہیں
پر ان کی پہچان الگ ہے گونا گوں کرداروں میں

ناداں ہو احمق ہو کیا ہو جانے کیا سرشار میاں
حرف وفا کا سکہ لے کر پھرتے ہو بازاروں میں

○

تصور اقبال
(اٹک)

یہ تو سچ ہے قطار میں ہے وہ
کب مرے انتظار میں ہے وہ

یوں تو رہتا ہے اک حویلی میں
ایسے لگتا ہے غار میں ہے وہ

کُونج ہے اصل میں اکیلی اب
ہاں بظاہر تو ڈار میں ہے وہ

اُس کی باتوں پہ کان دھرتا کون
دو میں ہے اب نہ چار میں ہے وہ

کل جو سیکل پہ جا رہا تھا گھر
اب جو دیکھا تو کار میں ہے وہ

شب سے آتا ہے خوف اس کارن
دن کے اب انتظار میں ہے وہ

جو تصور نہیں ترے بس میں
ہاں میرے اختیار میں ہے وہ

○

اکمل شاکر
(کوئٹہ)

برے حالات سے رونے لگا ہوں
بہت کمزور اب ہونے لگا ہوں

ملے گا کچھ نہیں اب ڈھونڈنے سے
میں اپنی ذات میں کھونے لگا ہوں

میری آنکھوں کا دریا بولتا ہے
کہ آنکھیں خون سے دھونے لگا ہوں

کڑی ہے دھوپ سر پر بے بسی کی
اسی میں دھوپ میں سونے لگا ہوں

یہی ہے کھیت کا دستور شاکر
جو کاٹا ہے وہی بونے لگا ہوں

○

فرح کامران
(نیویارک)

ہم نے خیالِ یار کا روشن دیا لیا
بے نور طاقِ ہجر پہ اُس کو سجا لیا
ظلمت کدے میں ہم نے دیا کیا جلا لیا
سرکش ہوا نے آسمان سر پر اٹھا لیا
یہ بارِ ہجر لاد کے چلنا محال تھا
سو کوہِ غم کو اپنے ہی اندر گرا لیا
منزل غبارِ غم میں جو دھندلا گئی کبھی
کاغذ ، قلم دوات سے رستہ بنا لیا
کچھ سرخ پھول تیری لحد پہ چڑھا کے آج
ہم نے بھی جشنِ عشق و محبت منا لیا
لے ڈوبا ہم کو عشق میں ناموس کا بھرم
خود داغ داغ ہو گئے دامن بچا لیا
جامِ غزل کو توڑ کے سوئے حیات چل
یادوں کی انجمن میں بہت ڈگمگا لیا
اک یاد کا چراغ تھا جلتا تمام رات
گولی نے نیند کی وہ خزانہ چرا لیا

○

اصغر شمیم
(کولکتہ)

اس کی آنکھوں کا خواب ہونا تھا
دشت میں اب سراب ہونا تھا
میں اندھیرے میں آ گیا کیسے
مجھکو تو آفتاب ہونا تھا
اس کی تعبیر بھی نہیں ممکن
خواب کو میرے خواب ہونا تھا
جو بھی دیکھے وہ دیکھتا ہی رہے
مجھکو ایسا گلاب ہونا تھا
اس کے حصے میں آ گیا کوئی
جب مرا انتخاب ہونا تھا
دل ہے اصغؔر کتاب کی مانند
دل کو شامل نصاب ہونا تھا

○

طارق قمر
(یو کے)

وار خاموش گرفتار پہ ہے
زخم زنجیر کی جھنکار پہ ہے
عشق مصروفِ عمل دار پہ ہے
روشنی منبر و مینار پہ ہے
آج جتنا بھی ہے دیوار کا بوجھ
سب کا سب سایۂ دیوار پہ ہے
جشنِ خورشید منانے والو
شب کا سایہ دور دیوار پہ ہے
ہار جانے کا سبب ہے کچھ اور
بحث ٹوٹی ہوئی تلوار پہ ہے
کتنی قیمت میں بِکے گا ایمان
منحصر جبہ و دستار پہ ہے
آئے گی چاک گریبان سحر
رات بھاری کسی بیمار پہ ہے

○

ارشد سعید
(آسٹریلیا)

یہ کلفتِ جاں اک دن سب زیرِ زمیں ہوگی
اے چشمِ حسیں میری کب تک تو خریں ہوگی

سب رنج والم ہم نے دنیا میں اٹھائے ہیں
یہ خاک اڑے گی تو پھر عرش نشیں ہو گی

اس شہر میں آئی تھی اک حسن کی جو دیوی
تم ڈھونڈنے نکلو تو وہ دل میں کہیں ہو گی

اک دیپ محبت کا بجھتا سا کہیں ہوگا
اک زلفِ پریشاں بھی بکھری سی یہیں ہوگی

تعریف غزل کی ہے سب حسن و جمال اُس کا
وہ خوب رُو لڑکی بھی اک پردہ نشیں ہو گی

آزادی کے رستے بھی جاتے تو ہیں مقتل سے
اِغلانِ بغاوت ہے خوں رَنگ زمیں ہو گی

ارشدؔ وہ حسیں تتلی گلشن کی محبت ہے
کھیلے گی جو بھنوروں سے تو اور حسیں ہو گی

○

مادھو کوشک
(چندی گڑھ)

گر سچ کہوں تو جھوٹ سے نفرت نہیں رہی
سچ بولنے کی آج کل ہمّت نہیں رہی

ایسا نہیں کہ راہ میں رہمت نہیں رہی
پیروں کو تیز چلنے کی عادت نہیں رہی

اب تو کبھی کبھار ہی ہوتا ہے دل اداس
پہلے سی انتظار میں شدّت نہیں رہی

لگتا ہے تیز دھوپ میں جلنا ہے عمر بھر
سر پر کسی کے پیار کی اب چھت نہیں رہی

اب سر کہاں جھکائیں گے پتّھر کے آدمی
شیشے کی پورے شہر میں مورت نہیں رہی

○

مہناز انجم
(اسلام آباد)

میں ہُوں کہیں کہ نہیں ہوُں مجھے دکھائے تو
وہ آئینہ!!!! مجھے میرا پتا بتائے تو

میں چاہتی ہُوں کہ پل بھر میں بھک سے اُڑ جاؤں
مگر مجھے مرا سایہ گلے لگائے تو

میں خس نُما ہی سہی پر اسے بچا لُوں گی
مگر وہ ڈُوبتا پل مجھ کو آزمائے تو

سمے کے چاک پہ یُوں رقص کون کرتا ہے
مری طرح کوئی دو ایک پیچ کھائے تو

یہ میرے ہاتھ کی ریکھائیں جُھوٹی پڑ جائیں
وہ!!! جاتے جاتے مری اور لوٹ آئے تو

میں ناچتی پھرُوں اس گُنبدِ زمانی میں
بنانے والا مرا بخت بھی بنائے تو

میں جانتی ہوں کہ خانہ بجاں نہیں پھرُوں گی
ہوا سمجھ کہ وہ پاگل مجھے اُڑائے تو

کوئی گلاب جُھکے شاخ سے مری جانب
کوئی مہک مری سانسوں میں لہلہائے تو

میں رات اوڑھ لُوں دن کو پہن پہن کے پھروں
کبھی وہ نجم کبھی پھُول بن کے آئے تو

○

غلام حسین ساجد

(لاہور)

زمیں کا اور ہی کچھ رنگ تھا فضا کا اور
میں اک نگاہ میں قائل ہُوا خُدا کا اور

سُلگ رہا تھا تو اُس نے مجھے ہوا دی تھی
میں جل اُٹھا تو ارادہ ہُوا ہوا کا اور

سحر سے شام تلک کارواں اُترتے رہے
تو رنگ ہونے لگا دشتِ نینوا کا اور

چراغِ وصل کہیں اور بھی بھڑکتا تھا
دُعا کا اور نشانہ تھا مُدعا کا اور

ابھی میں پُوری طرح ڈوب بھی نہیں ں پایا
ہُوا ہے نیند کے دریا میں اک چھنا کا اور

○

سبھاش گپتا شفیق

(ہوشیار پور)

کچھ بنایا ہی نہیں سر کو چھپانے لائق
یہ زمیں ہی نہ لگی گھر کے بنانے لائق

عہد حاضر نے دیا سب کو کھلونا ایسا
جس نے چھوڑا ہی نہیں پڑھنے پڑھانے لائق

میری خاموشی کے مطلب نہ نکالے جایں
اس لئے چپ ہوں نہیں بات بتانے لائق

ایک پہناوا مرا گھر میں بھی اور باہر بھی
اور چولا نہیں دنیا کو دکھانے لائق

جس کو دیوانے ہی کر سکتے ہیں اس کی خاطر
ڈھونڈتے ہی رہے ہم لوگ سیانے لائق

ایسے لوگوں کی یہاں قدر نہیں ہے کوئی
جو حقیقت میں ہیں مسند پہ بٹھانے لائق

اپنے لائق یہ زمانہ تو کبھی تھا ہی نہیں
اور کچھ ہم بھی نہیں ایسے زمانے لائق

ہم نے اس شخص کو سینے سے لگایا ہے شفیق
جو حقیقت میں نہیں ہاتھ ملانے لائق

○

شازیہ اکبر

(اسلام آباد)

خوش چارہ گر ہے مجھ سے، نہ ہوں چارہ گر سے میں
دیکھو اتارتی ہوں کہاں اُس کو سر سے میں

چاندی کے تار پاؤں میں الجھے تھے بار بار
بارش تھمی تو رات کو نکلی تھی گھر سے میں

جرات کمال کر کے جھجکنا بھی تھا غضب
مجھ سے ڈرا ہوا تھا مرا ڈر کہ ڈر سے میں

دل سے اٹھا غبار تھا آنکھوں میں جم گیا
اب تک مٹا رہی ہوں اسے چشم تر سے میں

ہر وقت ایک شور یہاں، توڑ پھوڑ بھی
باہر نکل ہی جاوں نہ کیوں، شہرِ شر سے میں

دھڑ دھڑ بجی تھیں دھڑکنیں، کنگن کھنن کھنن
اظہارِ نفی کر رہی تھی گرچہ سر سے میں

چکھا تھا ہم نے چٹکی میں بھر کے نمک ذرا
درگاہِ عشق سے تھی جڑی، چٹکی بھر سے میں

اُس نے تو آتے ساتھ ہی گھر دل میں کر لیا
لے جاؤں اب انا کو کہاں اپنے گھر سے میں

کل کہہ رہی تھی شازیہ، لگتا ہے یوں مجھے
اٹھ کے نہ جا سکوں گی کہیں اس کے در سے میں

○

ـ ناول ـ

خاکِ شفا

پیرزادہ آلِ انوار

(میامی)

قسط ۱۵

"اے بچے--- مجھے تو اب تک یہ سمجھ نہیں آیا--- کہ--- تُو---کلکتہ لینے کیا گیا تھا---؟"

"میرے پیاری پھپھو---!(گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے) کلکتہ تھوڑی---میں تو بمبئی گیا تھا---بمبئی---!"

"اے لو---! یک نہ شد---دو شد---بمبئی کیا کرنے گیا تھا بھئی تُو---؟"

"بمبئی---وہ---میں---بات یہ ہے---(شرماتے ہوئے منہ میں انگلی ڈال کر) ایکٹر بننے گیا تھا---ایکٹر---!"

"ایکٹر---اور---تُو---؟"(ہنسی ضبط کرتے ہوئے)

"کیوں---کیا کمی ہے مجھ میں---؟"(غصّہ سے منہ پُھلا کر)

"ارے نہیں---میرے کہنے کا مطلب یہ ہے---ابھی تو تُو--- بچہ ہے---بچہ---کھیلنے کودنے کے دن ہیں تیرے---!"

"پھپھو--- کہے دے رہا ہوں--- سب کچھ کہنا--- بچہ نہ کہنا---بڑی خنّس چڑھتی ہے مجھے---جب کوئی بچہ کہتا ہے---اور--- تو---اور---وہ---فلانے کی جنی---کیا نام تھا اُس کا---(سوچتے ہوئے) ہاں---مس بملا نے مجھے دیکھتے ہی بچہ کہا---تو---میرا خون کھولنے لگا---میں نے کہا---میڈم جی---شکل پہ مت جانا---جب جی چاہے آزما کر دیکھ لینا---!"

"یہ مسز بملا کون ہے---؟"

"ڈرامے کی ہیروئن ہے---!"

"بڑا بدمعاش ہے تُو---"(کان کھینچتے ہوئے)

"اجی چھوڑو---چھوڑو بھی(ہاتھ جوڑتے ہوئے) اچھا ایک بات بتاؤ---کوئی سیر سپاٹے کی جگہ ہے---تمہارے لاہور میں کہ نہیں---؟"

"لے---یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے---لاہور تو ہے ہی--- پھولوں--- پھلوں--- اور--- باغوں کا شہر--- لاہور کے بارے میں---بڑے بوڑھے کہہ گئے ہیں---کیا کہہ گئے ہیں(سر پر ہاتھ مارتے ہوئے)---ایک تو یہ اللہ مارا حافظہ---وقت پر کبھی ساتھ نہیں دیتا--- زیبو---او---زیبو---اری بہری ہو گئی ہے کیا---؟"

"جی--- جی---"(دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی--- زیب النساء سوالیہ نشان بن کر کھڑی ہو گئی)

"وہ --- میں--- یہ پوچھ رہی تھی--- کہ--- بڑے بوڑھے---لاہور کی تعریف میں---کونسا جملہ استعمال کرتے ہیں---؟"

"جنّے لاہور نئی ویکھیا---او جمیا نئی---!"

"ہیں جی---اس کا---کیا مطلب ہوا---(عمران کے مخاطب کرنے پر زیب النساء کا رنگ سرخ ہو گیا، کوشش کے باوجود اُس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی)

"بچے---اس کا مطلب ہے---جس نے لاہور نہیں دیکھا--- وہ---پیدا ہی نہیں ہوا---!"

"لو پھپھو---اگر یہ بات ہے---تو---مابدولت---آج پیدا ہو کر دکھائیں گے---!"

"ارے بچے--- بھائی میاں کی طرح--- تیرے اندر بھی صبر نام کی---کوئی چیز نہیں---"

"پوری بات تو سن لے---پھر---جو جی چاہے کر لیجو---!"

"سناؤ---سناؤ---دل کھول کر سناؤ---میری اچھی پھپھو---!" (گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے)

"دلّی کی طرح لاہور بھی تاریخی حیثیت کا حامل شہر ہے---اٹھارہ سو ستاون کے بعد---انگریز حکومت نے ترقیاتی کام کرنے کا منصوبہ بنایا---تو ---سب سے پہلے---شہروں کی درجہ بندی کی---مثلاً ساحلی شہر بمبئی--- کلکتہ--- کراچی--- مدراس--- تاریخی شہر--- لاہور--- دہلی--- لکھنؤ---میرٹھ---دفاعی نقطۂ نظر سے---انبالہ---راولپنڈی---وغیرہ کو---اوّل---دوئم---سوئم---درجہ بندی کے تحت کرنے کا مقصد--- و---مطلب یہ تھا---کہ---درجہ بندی ایک کے شہروں میں---ایک سے ترقیاتی کام--- یعنی--- ہسپتال--- سکول--- سٹیشن--- پولیس تھانہ---ڈاکخانہ---کوٹ کچہری---عوام کی ضرورت کے مطابق تعمیر کیے جائیں---تو---دوسری---و---تیسری درجہ بندی کے شہروں کی--- تعمیر یکساں طرز کی---اسی طرز پر---چوتھے---پانچویں---چھٹے--- اور ساتویں نمبر کے شہروں کی یکساں درجہ کے تحت ترقیاتی کام کیے گئے---!

"لاہور کے بارے میں بتاؤ---لاہور کے بارے میں---؟"

"لاہور شہر کی تاریخ---کم و بیش دو ہزار سال پرانی ہے---مگر اس کی شہرت---دسویں صدی عیسوی میں نمایاں ہونا شروع ہوئی---قرونِ وسطیٰ کے زمانے میں لاہور پر--- ہندو شاہی---غزنویوں---اور--- دہلی سلطنت کی حکومتیں رہیں---سولہویں صدی کے اواخر---اور---اٹھارویں

صدی کے اوائل کے درمیان۔۔۔مغلیہ سلطنت کے تحت۔۔۔لاہور شہر کی۔۔۔ پوری دنیا میں شان وشوکت۔۔۔اور۔۔۔جاہ وجلال کے چرچے تھے۔۔۔!

سترہ سو انتالیس میں ۔۔۔ نادر شاہی افواج نے لاہور پر قبضہ جما لیا۔۔۔مگر۔۔۔وہ اس قبضہ کو زیادہ عرصہ برقرار نہ رکھ سکا۔۔۔مغلوں نے پے در پے حملے کر کے۔۔۔نادر شاہی افواج کو پسپا کر کے دوبارہ لاہور کی عنانِ اقتدار سنبھال لی۔۔۔سترہ سو اڑتالیس سے سترہ سو اٹھانوے کے درمیان۔۔۔ سکھوں۔۔۔اور افغانوں کے درمیان۔۔۔جنگوں کے باعث۔۔۔لاہور کی تعمیر وترقی۔۔۔اور۔۔۔شان وشوکت روبہ زوال ہوگئی۔۔۔انیسویں صدی کے آتے آتے۔۔۔لاہور شہر نے۔۔۔بطور سکھ سلطنت۔۔۔اپنی شان وشوکت دوبارہ حاصل کر لی۔۔۔مگر۔۔۔اٹھارہ سو اُنچاس میں انگریزوں نے۔۔۔سکھ حکومت کا خاتمہ کر کے اُسے برٹش راج میں ضم کر لیا۔۔۔اور۔۔۔لاہور شہر۔۔۔ برطانوی پنجاب کا دارالحکومت بن گیا۔۔۔!

لاہور شہر۔۔۔زندہ دلان لوگوں کا شہر کہا جاتا ہے۔۔۔جو ہر ظلم۔۔۔ اور۔۔۔ نا انصافی کے خلاف۔۔۔ آواز بلند کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔۔۔متحدہ ہندوستان میں جتنی بھی آزادی کی تحریکیں چلیں۔۔۔لاہور شہر۔۔۔اور۔۔۔اُس کے شہریوں نے۔۔۔اُن تحریکوں میں ہمیشہ ہراوّل دستہ کا کام کیا۔۔۔قیام پاکستان کی قرارداد بھی۔۔۔لاہور شہر کے مشہور زمانہ منٹو پارک میں منظور کی گئی۔۔۔!

لاہور شہر کے نام کی بابت قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔۔۔ابتدائی ایّام کے مسلم مورخین ۔۔۔لوہار۔۔۔ اور۔۔۔ رہور کے طور پر درج کرتے ہیں۔۔۔ ابو ریحان البیرونی نے۔۔۔ گیارھویں صدی عیسوی میں اپنی غیر مطبوعہ تصنیف۔۔۔قانون۔۔۔میں لاہور شہر کو لہاور تحریر کیا ہے۔۔۔امیر خسرو اس شہر کا نام لہنور تحریر کرتے ہیں۔۔۔ لگ بھگ اُنہیں ایّام میں۔۔۔ یاقوت الحمادی نے لاہور درج کیا ہے۔۔۔فارسی مورخ فرشتہ نے۔۔۔اپنی تحقیق میں اس شہر کو الہور۔۔۔الاحور کے نام سے موسوم کیا ہے۔۔۔!

ایک دوسرا نظریہ بتلاتا ہے۔۔۔ویدوں میں۔۔۔لاہور کے آس پاس اروتیور۔۔۔دریا کا ذکر کیا گیا ہے۔۔۔جس کا آسان تلفظ۔۔۔راوی۔۔۔تسلیم کیا گیا ہے۔۔۔حتمی طور پر۔۔۔لاہور شہر کے نام کو۔۔۔اوّلین نام۔۔۔لوہار ہی درست تسلیم کیا جاتا ہے۔۔۔ جو۔۔۔گذرتے زمانوں کے ساتھ تلفظ اور لفظیات تبدیل کر کے آخر کار لاہور پہ آ کے ٹھہر گیا۔۔۔!

''پھپھو ایک بات بتاؤں۔۔۔!''

''بتا۔۔۔بتا۔۔۔جلدی بتا۔۔۔''(کان نزدیک کرتے ہوئے)

''آپ بات بہت لمبی کرتی ہو۔۔۔!''

''سچ میں۔۔۔!''(کھلکھلا کر ہنستے ہوئے)

''قسم خدا کی۔۔۔مجال ہے۔۔۔جو ایک لفظ بھی پلے پڑا ہو۔۔۔!''

''بوڑم جو ٹھہرا۔۔۔!''(پیار سے چپت لگاتے ہوئے)

''ارے بچّے۔۔۔ تجھے کیا بتلاؤں۔۔۔ لاہور کی مثال تو یہ ہے کہ۔۔۔ہفتہ میں دن سات۔۔۔اور۔۔۔میلے آٹھ ہوتے ہیں۔۔۔!''

''لو۔۔۔کر لو بات۔۔۔!''

''جھوٹ تھوڑی کہہ رہی ہوں۔۔۔لاہور کا بچہ بچہ جانتا ہے۔۔۔!''

''اجی پھپھو۔۔۔میری پیاری پھپھو۔۔۔ایک بات مانو گی۔۔۔؟''

''کیا۔۔۔؟''

''آپ بھی چلو نا میرے ساتھ۔۔۔راستے بھی بتلا دینا۔۔۔اور۔۔۔ سیر بھی کرا دینا۔۔۔!''

''ایک شرط پہ چلوں گی۔۔۔؟''

''آپ بھی شرطوں پہ کام کرتی ہو۔۔۔!''

''ارے نہیں بھئی۔۔۔ میری تو۔۔۔ فرمائش ہے۔۔۔ فرمائش۔۔۔!''

''اب بتا بھی دو۔۔۔!''

''میں نور جہاں کے مزار پر ضرور جاؤں گی۔۔۔خدا معلوم ایسی کیا بات ہے۔۔۔کہ۔۔۔وہاں جا کر دل کو سکون ملتا ہے۔۔۔فارسی کی شد بد نہ ہونے کے باوجود۔۔۔مزار پہ لکھا یہ شعر میرا دل کھینچ لیتا ہے۔۔۔!''

بر مزارے ما غریباں، نے چراغ نے گلے
نے پیرے پروانہ سوزد، نے صدائے بلبلے

☆

''اے بھیّا۔۔۔اے بھیّا تانگے والے۔۔۔سُنو تو۔۔۔رُکو تو۔۔۔!''

''بہن جی۔۔۔نظر نہیں آتا کیا۔۔۔ٹانگہ خالی نہیں ہے۔۔۔!''

''ایک منٹ۔۔۔ایک منٹ(ٹانگہ میں بیٹھی تنہا سواری نے دریافت کیا) کہاں جانا ہے بہن۔۔۔؟''

''جانا تو۔۔۔نور جہاں کے مزار پہ تھا۔۔۔مگر۔۔۔!''

''اگر۔۔۔مگر۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ آ جاؤ۔۔۔ لونڈے کو بھی لے آؤ۔۔۔بیٹھو۔۔۔شاباش۔۔۔آرام سے بیٹھو۔۔۔!''

''پر۔۔۔تم نے۔۔۔تو۔۔۔لوہاری جانا تھا۔۔۔؟''

''چلے جائیں گے۔۔۔ لوہاری بھی چلے جائیں گے۔۔۔ پہلے انہیں۔۔۔نور جہاں کے مقبرے پہ۔۔۔تو چھوڑ آئیں۔۔۔مگر۔۔۔ایک شرط ہے۔۔۔کرایہ ان کا میں دوں گا۔۔۔!''

''اماں سارا دن کرائے پہ ہی چلتے ہیں۔۔۔محبت۔۔۔مروّت۔۔۔ اور۔۔۔دوستی میں چلنے کا۔۔۔موقع ہی کب ملتا ہے۔۔۔؟''

''ارے۔۔۔ارے۔۔۔کیا بات کرتے ہو چاچا۔۔۔گذشتہ تین سال سے۔۔۔مفت بٹھا رہے ہو مجھے۔۔۔کبھی ایک دھیلا۔۔۔کرائے کی مد میں

نہیں لیا۔۔۔کبھی کبھی۔۔۔تو۔۔۔چائے بھی۔۔۔پلّے سے پلاتے ہو۔۔۔خدا جھوٹ نہ بلوائے ۔۔۔تو۔۔۔ میں نے اپنی ٹانگوں پر چل کر اتنا لاہور نہیں دیکھا۔۔۔جتنا۔۔۔تمہارے ٹانگے پر بیٹھ کر دیکھ لیا ہے۔۔۔!''

''مفت۔۔۔مفت کیوں بٹھاتے ہیں یہ آپ کو بھائی۔۔۔؟''

''آہ۔۔۔ ہا۔۔۔ اُس دن بادل غضب ۔۔۔ اور ۔۔۔ جلال میں تھے۔۔۔میں ادب لطیف کے مالک شیخ برکت علی سے مل کر۔۔۔گھر لوٹ رہا تھا۔۔۔ ہاتھ دینے۔۔۔ منت سماجت کرنے کے باوجود۔۔۔ کوئی ٹانگے والا۔۔۔ چلنے پر تیار نہ تھا۔۔۔ کچھ دور چھپ چھپ کرتا چلا تو ٹانگہ سٹینڈ آ گیا۔۔۔ سائیں سائیں کرتے ٹانگہ سٹینڈ میں۔۔۔ فقط ایک ٹانگہ کھڑا تھا۔۔۔چاچا لطیف چادر کی بُکل مارے۔۔۔ بیڑی پینے میں مگن تھے۔۔۔میں نے کہا: کرشن نگر چلو گے۔۔۔چاچا نے۔۔۔ ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''دیکھ نہیں رہے۔۔۔ پانی کس زوروں سے برس رہا ہے۔۔۔سڑک بھی گھٹنوں گھٹنوں۔۔۔پانی میں ڈوب چکی ہے۔۔۔!''

''چاچا کی خفگی کو نظر انداز کرتے ہوئے۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔مہربانی کرو۔۔۔ میں ایک شاعر ہوں۔۔۔ بچہ بھی بیمار ہے۔۔۔اور۔۔۔ میرے گھر والے پریشان بھی ہوں گے۔۔۔!''

''ابے لونڈے۔۔۔تُو۔۔۔شاعر ہے۔۔۔؟''

میں نے کہا۔۔۔''جی۔۔۔میں شاعر ہوں۔۔۔''

''سنا پھر کوئی تازہ شعر۔۔۔!''

''شعر سنتے ہی چاچا پھڑک گئے۔۔۔اور۔۔۔ٹانگہ باہر نکالتے ہوئے بولے۔۔۔لے بھئی لونڈے کیا نام ہے تیرا۔۔۔؟''

''ناصر کاظمی۔۔۔!''

''اب تو جی ناصر کاظمی ہو۔۔۔یا۔۔۔کوئی اور کاظمی۔۔۔تُو نے تو مجھے غلام کر لیا۔۔۔قسم ہے پیدا کرنے والے کی۔۔۔ساری عمر تجھے مفت بٹھاؤں گا۔۔۔مفت۔۔۔!''

''چاچا ۔۔۔ یاد پڑتا ہے۔۔۔ کون سا شعر سنایا تھا۔۔ ۔ اُس روز۔۔؟''

''اُس روز۔۔۔اُس روز (چاچا نے حافظہ پر زور دیتے ہوئے) ہاں یاد آیا:

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے بعد
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

☆

''اجی پھپھو۔۔۔ایک بات بتاؤ گی۔۔۔؟''

''کیا۔۔۔؟''

''نور جہاں کے مزار پہ۔۔۔آپ رو کیوں رہی تھی۔۔۔قسم اللہ پاک کی۔۔۔آپ کی ہچکیاں سن کر۔۔۔میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔۔۔!''

''ہائے بچے۔۔۔ وہ۔۔۔کون سی فلم ہے اللہ ماری۔۔۔ ہاں ۔۔۔ انارکلی۔۔۔!''

''بینا رائے والی۔۔۔؟''

''ارے نہیں۔۔۔ ہمارے پاکستان کی نور جہاں والی۔۔۔ انارکلی۔۔۔!''

''پاکستان میں بھی بنی ہے انارکلی۔۔۔؟''

''ارے ۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ پاکستان میں بھی بنی ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ہندوستان والی۔۔۔!''

''ہندوستان والی۔۔۔؟''

''کے۔آصف جب مغلِ اعظم بنا رہے تھے۔۔۔تو۔۔۔اُن کے معاونین کی ایک ٹیم۔۔۔جس کی سربراہی ۔۔۔سید طیب زیدی بطور چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر کر رہے تھے۔۔۔زیدی صاحب کا خیال تھا۔۔۔کہ۔۔۔مغل اعظم ہٹ ہوتے ہی۔۔۔ وہ بھی مشہور ہو جائیں گے۔۔۔اور۔۔۔اُن کے دروازے کے باہر بھی۔۔۔پروڈیوسر کی لائنیں لگ جائیں گی۔۔۔!''

''پھر۔۔۔؟''

''پھر کیا۔۔۔ پروڈیوسر۔۔۔تو۔۔۔دور کی بات ۔۔۔ بلی کے بچہ کا بھی گذر نہ ہوا۔۔۔اُن کے دروازے کے سامنے سے۔۔۔!''

''آگے بتاؤ۔۔۔آگے۔۔۔؟''

''آگے وہی ہوا۔۔۔ جو ۔۔۔ انڈین فلم انڈسٹری کے بیشتر مسلمان۔۔۔فنکاروں۔۔۔اور۔۔۔ہدایتکاروں کے ساتھ ہوا۔۔۔!''

''مطلب۔۔۔؟''

''مطلب یہ۔۔۔کہ۔۔۔زیدی صاحب بھی پاکستان آ گئے۔۔۔!''

''اچھا۔۔۔پھر۔۔۔پھر کیا ہوا۔۔۔؟''

زیدی صاحب کے پاکستانی دوستوں نے بھاگ دوڑ کر کے۔۔۔انور کمال پاشا سے ملوایا۔۔۔ زیدی صاحب نے۔۔۔ پاشا صاحب کو کہانی سنائی۔۔۔تو۔۔۔آخیر میں۔۔۔ پاشا صاحب نے۔۔۔ جماہی لیتے ہوئے کہا۔۔۔!''

''اتنے سارے۔۔۔ ہاتھی۔۔۔گھوڑے۔۔۔سپاہی۔۔۔اور۔۔۔ سامانِ حرب۔۔۔کہاں سے آئے گا۔۔۔؟''

''سب کچھ میری جیب میں ہے۔۔۔!'' (زیدی صاحب نے معنی خیز مسکراہٹ کے دوران جیب کی جانب اشارہ کیا)

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔؟''

''ارے بیوقوف۔۔۔ سید طیب زیدی۔۔۔ انڈیا سے آتے وقت۔۔۔مغل اعظم کا نیگیٹو۔۔۔اُڑا لائے تھے۔۔۔!''

''مطلب۔۔۔ چرالائے تھے۔۔۔؟''

''اورنہیں تو کیا۔۔۔!''

''اچھا چھوڑو۔۔۔ فلم ولم کو۔۔۔ انارکلی والی بات تو درمیان میں رہ گئی۔۔۔''

''ہاں بچے۔۔۔ کہہ۔۔۔ تو۔۔۔ تُو۔۔۔ ٹھیک رہا ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ اب ہمت نہیں رہی۔۔۔ جی بھاری ہو رہا ہے۔۔۔ چائے پی کر سوؤں گی۔۔۔ تو۔۔۔ ٹھیک ہو جاؤں گی۔۔۔!''

''سنانی ضرور ہے۔۔۔!''

''ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔!''

''پکّا وعدہ کرو۔۔۔!''

''پکّا۔۔۔ میرے باپ۔۔۔ ایک دم پکّا۔۔۔!''

☆

چھبیس جون۔۔۔ پندرہ سو اُنتالیس میں۔۔۔ بھارتی بہار کی ریاست چاؤسا میں۔۔۔ دو بڑی فوجوں کا ٹکراؤ ہوا۔۔۔ اور۔۔۔ ہندوستان کی نئی تاریخ رقم کی گئی۔۔۔ ایک پٹھان۔۔۔ شیر شاہ سوری نے۔۔۔ مغل بادشاہ ہمایوں کو شکست سے دوچار کیا۔۔۔ تو۔۔۔ ہمایوں بھاگ کر افغانستان کے صوبہ مہران چلا گیا۔۔۔ جو اُس وقت۔۔۔ ایران کے صوبہ خراسان کا حصہ تھا۔۔۔ خراسان کے ایرانی حاکم کے وزیر۔۔۔ خواجہ محمد شریف نے۔۔۔ ہندوستان کے مفرور بادشاہ۔۔۔ ہمایوں کی خوب آؤ بھگت کی۔۔۔ برسوں بعد۔۔۔ ہمایوں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔۔۔ مگر۔۔۔ ہمایوں کے ایرانی میزبانوں پر عتاب نازل ہو گیا۔۔۔ اس وقت۔۔۔ خواجہ محمد شریف۔۔۔ انتقال کر چکے تھے۔۔۔ ایرانی بادشاہ نے۔۔۔ خواجہ محمد شریف کے بیٹے مرزا غیاث بیگ کی ساری جائیداد ضبط کر کے۔۔۔ بے سروسامانی کے عالم میں۔۔۔ مرزا غیاث بیگ۔۔۔ اور۔۔۔ اُن کے اہلِ خانہ کو۔۔۔ جلا وطنی پر مجبور کر دیا۔۔۔ مرزا غیاث بیگ کے دو بیٹے۔۔۔ اور۔۔۔ ایک بیٹی اُس کے ہمراہ تھی۔۔۔ اس بے سروسامانی میں مرزا غیاث بیگ کو۔۔۔ ہندوستان۔۔۔ شدت سے یاد آیا۔۔۔ اپنے والد کی۔۔۔ ہمایوں پر نوازشات اور عنایات کو یاد کر کے دل میں ایک آس۔۔۔ ایک اُمید۔۔۔ اور۔۔۔ روشنی کا دیا ایک نمایاں ہو گیا۔۔۔ اگرچہ اُس وقت۔۔۔ ہندوستان میں ہمایوں کے بیٹے اکبر کی حکومت تھی۔۔۔!

راستے میں قندھار کے صحرا کے قریب۔۔۔ مرزا غیاث بیگ کی بیگم عصمت النساء کو دردِزہ کی شکایت ہوئی۔۔۔ اور۔۔۔ اس لق ودق صحرا میں۔۔۔ اُس نے ایک بچی کو جنم دیا۔۔۔ مرزا غیاث بیگ۔۔۔ اور۔۔۔ اُس کے اہل خانہ۔۔۔ اس قدر کسمپرسی کے عالم میں تھے۔۔۔ کہ۔۔۔ نومولود کی کفالت انہیں بوجھ نظر آنے لگی۔۔۔ کچھ تردد۔۔۔ اور۔۔۔ تذبذب کے بعد۔۔۔ مرزا غیاث بیگ اور اُن کی بیگم نے۔۔۔ ایک متبرک انگوٹھی میں دھاگہ پرو کر۔۔۔ بچی کے گلے میں ڈالا۔۔۔ اور۔۔۔ قریب کی جھاڑیوں کے پاس پڑے پتھر پر نومولود بچی کو یک وتنہا چھوڑ کر جانب منزل روانہ ہو گئے۔۔۔!

مرزا غیاث بیگ کے قافلے کے جانے کے بعد۔۔۔ ایک دوسرا قافلہ وہاں سے گزرا۔۔۔ تو۔۔۔ قافلے میں شامل ایک شخص کی نظر۔۔۔ بچی پر پڑی۔۔۔ جو مزے سے اپنا انگوٹھا چوسنے میں مگن تھی۔۔۔ شخص مذکور نے آگے بڑھ کر۔۔۔ بچی کو گود میں اٹھا لیا۔۔۔ اور۔۔۔ قافلے کے سردار۔۔۔ مرزا مسعود کو اس کی اطلاع دی۔۔۔ مرزا مسعود نے بچی کو ساتھ رکھنے کا حکم دیا۔۔۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد۔۔۔ ایک گاؤں نظر آیا۔۔۔ تو۔۔۔ سردار نے۔۔۔ بچی کو دودھ پلانے کے لیے۔۔۔ کسی خاتون کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔۔۔ اتفاق دیکھئے۔۔۔ تلاش۔۔۔ و۔۔۔ بسیار کے بعد۔۔۔ جو۔۔۔ خاتون دستیاب ہوئی۔۔۔ وہ۔۔۔ نور جہاں کی ماں عصمت النساء تھی۔۔۔ نور جہاں کو دیکھتے ہی۔۔۔ عصمت النساء نے۔۔۔ ہائے میری بچی کی صدا لگاتے ہوئے۔۔۔ نور جہاں کو سینے سے چمٹا لیا۔۔۔ قافلے کے سردار مرزا مسعود نے سارا ماجرا جاننے کے بعد۔۔۔ خوشی۔۔۔ خوشی۔۔۔ نور جہاں کو۔۔۔ اُس کی والدہ کے سپرد کر دیا۔۔۔!

آگے کی داستان طویل بھی ہے۔۔۔ اور۔۔۔ جانی پہچانی بھی۔۔۔ زیب النساء سے نور جہاں۔۔۔ بلکہ۔۔۔ ملکہ نور جہاں کا۔۔۔ سفر۔۔۔ علی قلی خان المعروف شیر افگن سے شادی۔۔۔ اور۔۔۔ افسانوی رنگ میں۔۔۔ جہانگیر سے ملاقات میں۔۔۔ کبوتر کا اُڑ جانا۔۔۔ جہانگیر کا واپسی پر دریافت کرنا۔۔۔ اور۔۔۔ نور جہاں کا۔۔۔ دوسرا کبوتر اُڑا کر بتلانا۔۔۔ اس طرح۔۔۔ جہانگیر کے حکم پر شیر افگن کا قتل۔۔۔ اور۔۔۔ نور جہاں کی شادی۔۔۔ بجائے خود طویل داستان ہے۔۔۔ کئی تاریخ نویس۔۔۔ شیر افگن کے قتل کی وجہ۔۔۔ نور جہاں کے بجائے۔۔۔ شیر افگن کی جہانگیر سے بغاوت بھی بتلاتے ہیں۔۔۔! البتہ اس امر کی تاریخ گواہ ہے۔۔۔ اور۔۔۔ ہر ذی شعور شخص بھی جانتا ہے۔۔۔ کہ۔۔۔ نور جہاں۔۔۔ اپنی لازوال خوبصورتی۔۔۔ بلا کی ذہانت۔۔۔ اور۔۔۔ بلند حوصلوں کی حامل۔۔۔ ایک دلیر خاتون تھی۔۔۔ جس نے قدم۔۔۔ قدم پر۔۔۔ نہ صرف۔۔۔ شہنشاہِ ہندوستان کے ساتھ محلاتی سازشوں کا مقابلہ کیا۔۔۔ بلکہ میدانِ جنگ میں بھی۔۔۔ کبھی شانہ بہ شانہ۔۔۔ کبھی۔۔۔ یک وتنہا۔۔۔ بڑے بڑے سُورماؤں کے دانت کھٹے کیے۔۔۔ اور۔۔۔ اسی ذہانت۔۔۔ و۔۔۔ فطانت کے آگے۔۔۔ سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے شہنشاہ ہندوستان نے عنانِ حکومت۔۔۔ ایک سیر شراب۔۔۔ اور۔۔۔ آدھا سیر گوشت کے عوض۔۔۔ غیر اعلانیہ طور پر۔۔۔ نور جہاں کو سونپ دی۔۔۔ وہ نور جہاں۔۔۔ جو۔۔۔ خاتون ہونے کے باوجود۔۔۔ نہ صرف اپنے نام کا سکّہ چلاتی تھی۔۔۔ بلکہ۔۔۔ خود کو بادشاہ بیگم بھی کہلاتی تھی۔۔۔ وہ تھی تو بادشاہ بیگم۔۔۔ مگر۔۔۔ عملاً۔۔۔ اُس کا جاہ وجلال کسی بادشاہ سے کم نہ تھا۔۔۔!

اٹک کے قلعے کے پار۔۔۔ جہانگیر کے نامور جنرل مہابت خان نے بغاوت کر کے بادشاہ کو قیدی بنالیا۔۔۔حتیٰ کہ بادشاہ سے نور جہاں کے قتل کا پروانہ بھی حاصل کرلیا۔۔۔مگر۔۔۔نور جہاں نے بلا کی ذہانت۔۔۔اور۔۔۔جرأت دکھلاتے ہوئے مہابت خان کو شکست سے دوچار کر دیا۔۔۔اس مہم جوئی کے بعد بادشاہ جہانگیر زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا۔۔۔اٹک سے واپسی کے سفر میں کشمیر کے مقام پر اُس کی موت واقع ہوگئی۔۔۔چونکہ نور جہاں۔۔۔اور۔۔۔جہانگیر کے دو بیٹے انتقال کر چکے تھے جس کے باعث اولاد نرینہ نہ ہونے کے سبب۔۔۔شاہی خاندان میں اقتدار کی کشمکش انتہا پر پہنچ گئی۔محلاتی سازشوں کے بل۔۔۔اور۔۔۔ آصف جاہ کے کلیدی کردار کے باعث شہزادہ خرم المعروف شاہجہاں۔۔۔تخت نشین ہوئے۔۔۔تو۔۔۔انہوں نے ایک معاہدہ کے تحت ملکہ نور جہاں کو۔۔۔کچھ زمین۔۔۔اور۔۔۔جاگیر کے ساتھ۔۔۔دولاکھ روپے سالانہ وظیفہ دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔۔۔اقتدار کے گلیاروں سے رخصت کر دیا۔۔۔!

اٹھارہ سال کی بیوگی۔۔۔ اور۔۔۔ اقتدار سے محرومی کے ایّام میں۔۔۔نور جہاں نے اپنے محبوب شوہر جہانگیر کا مقبرہ تعمیر کرایا۔۔۔اپنا کفن ایران سے بنوا کر مکہ معظّمہ بھیج کر آبِ زم زم سے دھلوایا۔۔۔ اور۔۔۔ یتیموں۔۔۔بیواؤں۔۔۔اور۔۔۔بے آسرا لوگوں کے لیے۔۔۔بے شمار فلاحی کام کرنے کے بعد۔۔۔ہندوستان کی یہ جرّی۔۔۔بے باک۔۔۔بہادر۔۔۔ باذوق۔۔۔اور۔۔۔باوفا خاتون۔۔۔اڑسٹھ سال کی عمر میں۔۔۔سترہ دسمبر سولہ سو اڑتالیس کو لاہور میں انتقال کر گئی۔۔۔نور جہاں کے جنازے میں۔۔۔کم وبیش ساٹھ ہزار لوگوں نے شرکت کی۔۔۔ یتیموں۔۔۔ اور۔۔۔ بیواؤں نے۔۔۔نور جہاں کے جنازے کو اپنی حفاظت میں لے کر جہانگیر کے مقبرے تک پہنچایا۔۔۔اور۔۔۔نور جہاں کی وصیت کے مطابق۔۔۔ جہانگیر کے پہلو میں۔۔۔اُس کی محبوب ملکہ کی تدفین کی گئی۔۔۔!

مغلوں کی تاریخ کا پاسبان اگر کوئی۔۔۔نسوانی کردار ہے۔۔۔تو۔۔۔ وہ صرف۔۔۔اور۔۔۔صرف۔۔۔نور جہاں ہے۔۔۔ وہ جیتے جی بھی ملکہ تھی۔۔۔اور۔۔۔ بعد از موت بھی ملکہ ہے۔۔۔اور۔۔۔ جب تک۔۔۔ یہ کائنات قائم و دائم ہے۔۔۔ اُس وقت تک ملکہ رہے گی۔۔۔نور جہاں کی مثال۔۔۔صندل کے درخت کی مانند ہے۔۔۔کہ۔۔۔جب صندل کا درخت زندہ ہوتا ہے۔۔۔تو۔۔۔گھنی چھاؤں کا باعث بنتا ہے۔۔۔اور۔۔۔جب مردہ ہوتا ہے۔۔۔تو۔۔۔اپنے اردگرد۔۔۔خوشبو پھیلائے رکھتا ہے۔۔۔ بقول پنڈت تلوک چند محروم:

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہہ نور جہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہ خاک نہاں ہے
اٹھتا مگر اب تک سر مرقد سے دھواں ہے

جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے ان کے شب دیجور کا عالم

اے حسن جہاں سوز کہاں ہیں وہ شرارے
کس باغ کے گل ہوگئے کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمک شب تاب وہ سارے
ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے

یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشق دلگیر کے دل کے!

تجھ سی ملکہ کے لیے بارہ دری ہے
غالیچہ سر فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالم بے چارگی اے تاجوری ہے
دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو مگر یوں سر صحرا نہیں ہوتی

تعویذ لحد ہے زبر و زیر یہ اندھیر
یہ دور زمانہ کے الٹ پھیر یہ اندھیر
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر یہ اندھیر
اے گردش ایام یہ اندھیر! یہ اندھیر

ماہ فلک حسن کو یہ برج ملا ہے
اے چرخ ترے حسن نوازش کا گلا ہے

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا
ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دل افگار سے کیا کیا
اٹھتے ہیں شرر آہ شرر بار سے کیا

یہ عالم تنہائی یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لیے ہُو کا نظارا
چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر
آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آ کر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپر
اڑ اڑ کے لگاتے ہیں در و بام کے چکر

معمور ہے یوں محفل جاناں نہ کسی کی
آباد رہے گور غریباں نہ کسی کی

آراستہ جن کے لیے گل زار و چمن تھے
جو نازکی میں داغ دہ برگ سمن تھے
جو گل رخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے
شاداب گل تر سے کہیں جن کے بدن تھے

پژمردہ وہ گل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار وخس و خاشاک کے نیچے

رہنے کے لیے دیدہ ودل جن کے مکاں تھے
جو پیکر ہستی کے لیے روح رواں تھے
محبوب دل خلق تھے جاں بخش جہاں تھے
تھے یوسف ثانی کہ مسیحائے زماں تھے

جو کچھ تھے کبھی تھے مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیر زمیں ہیں

دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دل ناداں
ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفن ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ نہ وہ قصر نہ ایواں
آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں

ٹوٹا ہوا اک ساحل راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

☆

''ہاں بھئی۔۔۔ پھپھو بھتیجے کا۔۔۔ سیر سپاٹا۔۔۔ کہاں تک پہنچا۔۔۔؟''

''نام نہ لینا سیر سپاٹے کا۔۔۔!''

''کیوں۔۔۔ ایسا کیا ہوگیا۔۔۔ جو نام لینے پر بھی پابندی لگ رہی ہے۔۔۔؟''

''ارے کیا بتاؤں۔۔۔ جوڑ۔۔۔ جوڑ۔۔۔ دُکھ رہا ہے۔۔۔!''

''اور میاں صاحبزادے۔۔۔ تم سناؤ۔۔۔ تمہارے کیا حال ہیں۔۔۔؟''

''پھپھو ٹھیک کہہ رہی ہیں۔۔۔ اب تو میں بھی۔۔۔ لاہور کے چپہ چپہ سے واقف ہوگیا ہوں۔۔۔!''

''مثلاً۔۔۔ ہم بھی تو سنیں۔۔۔؟'' (پھپھا میاں نے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے بھڑاس نکالنے کی کوشش کی)

''میاں ایسا ہے۔۔۔ چودہ اگست ایک ہزار نو عیسوی۔۔۔ یعنی۔۔۔ انیس ذوالحج تین سو ننانوے میں۔۔۔ افغانستان کے علاقے ہجویر نزد غزنی میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ابوالحسن رکھا گیا۔۔۔ اس بچے کا شجرہ نصب۔۔۔ نو نسلوں سے حضرت امام حسین علیہ السلام سے ملتا ہے۔۔۔ اس بچے کے والدین۔۔۔ اور۔۔۔ بزرگ خاندان۔۔۔ سنی العقید مسلمان تھے۔۔۔ بچے کا رجحان بچپن سے کھیل کود۔۔۔ یا۔۔۔ دنیا کے دیگر مشاغل کے بجائے۔۔۔ اللہ۔۔۔ اولیا۔۔۔ صوفی۔۔۔ اور۔۔۔ دینِ حق سے جڑے بزرگوں کی جانب تھا۔۔۔ اسی شوق۔۔۔ اور۔۔۔ جستجو کی تکمیل کی غرض سے ابو الحسن ہجویری نے۔۔۔ پہلے غزنی کے دور دراز علاقوں کا دورہ کر کے۔۔۔ اپنی جستجو۔۔۔ اور۔۔۔ تڑپ کی تسکین کرنا چاہی۔۔۔ مگر۔۔۔ وقت کے ساتھ۔۔۔ ابو الحسن ہجویری کی۔۔۔ طلب۔۔۔ اور۔۔۔ تڑپ میں اضافہ ہوتا گیا۔۔۔ جس کے زیر اثر۔۔۔ وہ بغداد۔۔۔ نیشاپور۔۔۔ اور دمشق کے نامور صوفی۔۔۔ اور۔۔۔ ولی اللہ کی صحبت میں رہے۔۔۔ اور۔۔۔ کئی اساتذہ سے حنفی عقیدے کے مطابق دینی تعلیم حاصل کی۔۔۔ اپنے اُستاد الخطالی کے توسط سے علی ہجویری کی ملاقات اُس وقت کے بڑے صوفی بزرگ ابوبکر شبلی۔۔۔ اور۔۔۔ جنید بغدادی سے ہوئی۔۔۔ تحصیل علم کے بعد۔۔۔ علی ہجویری کی شادی عراق کی ایک خاتون سے ہوئی۔۔۔ مگر۔۔۔ ابوالحسن ہجویری کا مزاج۔۔۔ اور۔۔۔ میلان دنیاوی معاملات سے میل نہ کھاتا تھا۔۔۔ ابوالحسن ہجویری کا بیشتر وقت یادالٰہی میں بسر ہوتا۔۔۔ جس کے سبب یہ شادی کامیاب نہ ہوسکی۔۔۔ اور۔۔۔ ایک دن غیبی اشارہ پاتے ہی۔۔۔ ابوالحسن ہجویری نے رخت سفر باندھا۔۔۔!

آپ اپنے مرشد کے حکم پر۔۔۔ خدا کے دین کی تبلیغ واشاعت کے لیے۔۔۔ سلطان محمود غزنوی کے بیٹے۔۔۔ ناصر الدین کے زمانہ ۱۰۳۰ء تا ۱۰۴۰ء میں۔۔۔ لاہور تشریف لائے۔۔۔ آپ سے پہلے۔۔۔ آپ کے پیر بھائی حسین زنجانی۔۔۔ اس خدمت پر مامور تھے۔۔۔ اس لیے جب آپ کو۔۔۔ لاہور آنے کا حکم ہوا۔۔۔ تو۔۔۔ آپ فرماتے ہیں۔۔۔ کہ۔۔۔ میں نے شیخ سے عرض کیا۔۔۔ کہ۔۔۔ وہاں حسین زنجانی موجود ہیں۔۔۔ میری کیا ضرورت ہے۔۔۔؟ لیکن۔۔۔ حضرت نے فرمایا۔۔۔ نہیں تم جاؤ۔۔۔ فرماتے ہیں۔۔۔ کہ۔۔۔ میں رات کے وقت۔۔۔ لاہور پہنچا۔۔۔ اور۔۔۔ صبح کو حسین زنجانی کا جنازہ۔۔۔ شہر سے باہر۔۔۔ لایا جارہا تھا۔۔۔

تبلیغ واشاعت دین کے سلسلے میں۔۔۔ آپ نے برصغیر ہند کے۔۔۔ دوسرے حصوں کا بھی سفر کیا۔۔۔ چنانچہ۔۔۔ آپ کشف المحجوب میں۔۔۔ حضرت ابوحلیم حبیب بن اسلم راعیؒ کے حالات لکھتے ہیں۔۔۔ کہ۔۔۔ شیخؒ کی اور بھی بہت سی روایتیں ہیں۔۔۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے میں انہیں چھوڑتا ہوں۔۔۔ اور۔۔۔ مجھے سخت دقت پیش آرہی ہے۔۔۔ کہ۔۔۔ میری کتابیں عربی

میں ہیں۔۔۔اور۔۔۔میں ملک ہندوستان کے ایک گاؤں بھنور میں ہوں۔۔۔ جوکہ ملتان کے گردونواح میں واقع ہے۔۔۔والحمد اللہ علیا السراء والضراء۔ آپ کا مقام اور مرکز لاہور ہی رہا۔۔۔آخر کار لاہور ہی میں۔۔۔۴۶۵ھ میں نومحرم الحرام کو انتقال فرمایا۔۔۔اور۔۔۔یہیں مدفون ہیں۔۔۔!

ابوالحسن علی ہجویری المعروف داتا صاحبؒ کا شجرہ نصب کچھ اس ترتیب کے مطابق نونسلوں کے بعد۔۔۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جاملتا ہے۔۔۔!

۱۔ حضرت علی ہجویریؒ
۲۔ حضرت محمد عثمانؒ
۳۔ حضرت ابوالحسن علیؒ
۴۔ حضرت عبدالرحمٰنؒ
۵۔ حضرت شاہ شجاعؒ
۶۔ حضرت ابوالحسن علیؒ
۷۔ حضرت حسن اصغرؒ
۸۔ حضرت زیدؒ
۹۔ حضرت امام حسنؒ
۱۰۔ حضرت علیؓ

آپ کی درج ذیل تصانیف میں صرف ''کشف المحجوب'' دستیاب ہے:

۱۔ کشف المحجوب
۲۔ کتاب فناوبقا
۳۔ منہاج الدین
۴۔ الرعایۃ الحقوق اللہ
۵۔ شرح کلام منصور
۶۔ اسرارالحزق المؤنات
۷۔ نحوالقلوب
۸۔ کتاب البیان لاہل العیان

آپ کا روضہ۔۔۔ناصرالدین مسعود کے بیٹے۔۔۔ظہیرالدین الدولہ نے تعمیر کروایا۔۔۔اور۔۔۔خانقاہ کا فرش۔۔۔و۔۔۔ڈیوڑھی جلال الدین اکبر بادشاہ ۱۵۵۵ء تا ۱۶۰۵ء کی تعمیر ہیں۔۔۔خواجہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ ۱۶۳۹ء۔۔۔اور۔۔۔خواجہ فریدالدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ نے۔۔۔کسب فیض کے لیے۔۔۔آپ رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر۔۔۔چلہ کشی کی۔۔۔ اور۔۔۔خواجہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ نے۔۔۔چلہ کے بعد رخصت ہوتے وقت۔۔۔یہ شعر کہا:

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خُدا
ناقصاں راپیرِ کامل، کاملاں را رہنما

☆

''واہ میاں صاحبزادے۔۔۔واہ۔۔۔بہت چلتی چیز ہوتم۔۔۔آخر کو دلّی والے ہونا۔۔۔!''

''ابھی سے چیں بول گئے پھوپھا میاں۔۔۔ابھی تو۔۔۔بی بی پاکدامن۔۔۔میاں میر صاحب۔۔۔اور۔۔۔اور۔۔۔وہ پھپھو۔۔۔کیا نام بتایا تھا آپ نے۔۔۔؟''

''مجھے کیا معلوم۔۔۔کس نام کی بات کررہا ہے۔۔۔تُو۔۔۔؟''

''اجی۔۔۔وہی نا۔۔۔جن کے مزار پر گئے تھے۔۔۔!''

''مزار پہ گئے تھے۔۔۔؟''

''وہ۔۔۔جو۔۔۔شاعر بھی تھے۔۔۔!''

''اچھا۔۔۔اچھا۔۔۔شاہ حسین۔۔۔!''

''اللہ تمہارا بھلا کرے۔۔۔!''

''اور ہاں۔۔۔!شہزادی بامبا کو بھول گئیں۔۔۔؟''

''شہزادی بامبا۔۔۔یہ کون ذات شریف ہیں۔۔۔؟''

رنجیت سنگھ کی پوتی ، دلیپ سنگھ کی بیٹی شہزادی بامبا سدرلینڈ ۲۹۔دسمبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئی۔انگلینڈ میں بچپن گزارنے کے بعد وہ لاہور آ گئی۔ ہندوستان آنے کے لیے اُسے ایک ساتھی کی تلاش تھی جس کے لیے اُس نے اخبار میں اشتہار دیا۔ہنگری کی ایک خاتون میری اینٹونیٹ گوٹسمین شہزادی بامبا کے ہمراہ ہندوستان آنے پر آمادہ ہوگئی۔ ہندوستان آ کر شہزادی بامبا اور اُس کی ساتھی گوٹسمین نے ہندوستان کے کئی شہروں کی سیاحت کے بعد گرمیوں میں شملہ اور سردیوں میں لاہور کو مستقل مسکن بنایا۔گوٹسمین ۱۹۲۲ء میں ایک سکھ بزرگ امراؤ سنگھ شیر گل سے شادی کر کے ہنگری واپس چلی گئی۔شہزادی بامبا سدرلینڈ نے ۱۹۱۵ء میں لاہور کے کنگ میڈیکل کالج کے انگریز پرنسپل ڈاکٹر والٹر سدرلینڈ سے شادی کر لی۔شہزادی بامبا کے شوہر ڈاکٹر والٹر سدرلینڈ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے اور ۱۳۔ستمبر ۱۹۳۹ء کو انتقال کر گئے جس کے بعد شہزادی بامبا سدرلینڈ اپنے سیکرٹری میر کریم بخش اور ان کے اہلِ خانہ کے ساتھ تن تنہا گلزار محل المعروف گلابوں والے گھر میں رہنے لگیں جہاں ۱۰۔مارچ ۱۹۵۷ء کو اُن کا انتقال ہوگیا۔

شہزادی بامبا سدرلینڈ نے اپنے سیکرٹری میر کریم بخش سپرا کے نام تاریخی اشیا کا بڑا ذخیرہ چھوڑا جنہیں کریم بخش نے مبلغ آٹھ ہزار روپے کے عوض حکومت پاکستان کو فروخت کر دیا جنہیں حکومت پاکستان نے شاہی قلعہ لاہور میں عوام کی دسترس کے لیے عام کر دیا۔

''بس بس بس۔۔۔مزید تفصیل میں جانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔۔۔!''

''کیوں۔۔۔؟''

''اس لیے۔۔۔کہ۔۔۔میں۔۔۔تمہاری طرح۔۔۔ویہلا نہیں ہوں۔۔۔!''

''ویہلا۔۔۔؟''

''ویہلا۔۔۔مطلب۔۔۔فارغ۔۔۔اب سمجھ آئی۔۔۔!''

''آئی۔۔۔برابر آئی۔۔۔!''

''پھر کیا ارادے ہیں۔۔۔؟''

''کس بارے میں۔۔۔؟''

''کام کاج کے بارے میں۔۔۔اور کس بارے میں۔۔۔کب تک جوتیاں چٹخاتے رہو گے۔۔۔اکبر کی پیروی کا ارادہ تو نہیں۔۔۔''

نوکروں پر جو گذرتی ہے مجھے معلوم ہے
بس کرم کیجیے مجھے بے کار رہنے دیجیے

''پھوپھا میاں۔۔۔یہ بات تو آپ نے۔۔۔سولہ۔۔۔بلکہ۔۔۔سوا سولہ آنے ٹھیک کی ہے۔۔۔اس سے بڑھیا شعر تو ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔مابدولت کی شان میں۔۔۔!''

''سبحان اللہ۔۔۔ ماشاء اللہ ۔۔۔ یعنی۔۔۔ نوکری۔۔۔ ووکری کا۔۔۔ارادہ نہیں ہے جناب کا۔۔۔!''

''لو کر لو بات۔۔۔میاں۔۔۔ہم نوکری کے لیے نہیں۔۔۔نوکروں کے لیے بنے ہیں۔۔۔!''

''مگر۔۔۔برخوردار۔۔۔نوکر بھی۔۔۔پھوکٹ میں نہیں ملتے۔۔۔!''

''اس کی آپ فکر نہ کرو۔۔۔!''

''کیوں نہ کریں میاں۔۔۔ آخر کو۔۔۔ بڑے ہیں۔۔۔تمہارے اچھے برے کی بابت۔۔۔ ہم نہیں سوچیں گے۔۔۔ تو۔۔۔ کون سوچے گا۔۔۔؟''

''سوچنے پر۔۔۔کوئی پابندی نہیں۔۔۔دل کھول کر سوچو۔۔۔!''

''عجیب آدمی ہو میاں۔۔۔ بھائی صاحب کے سامنے۔۔۔ تم نہیں۔۔۔ہم جوابدہ ہیں۔۔۔ہم۔۔۔!''

''پہلی بات تو یہ۔۔۔کہ۔۔۔ابّا میاں نے۔۔۔بڑا ناواُڑسا ہوا ہے انٹی میں۔۔۔دوسری بات یہ۔۔۔کہ۔۔۔ یار ہوری۔۔۔ لاہور میں بھی وہی کریں گے۔۔۔جو۔۔۔کلکتے میں کرتے تھے۔۔۔!''

''مثلاً۔۔۔کیا کرتے تھے جناب۔۔۔وہ بھی۔۔۔کلکتے میں۔۔۔؟''

''پھپھو سے پوچھو۔۔۔پھپھو سے۔۔۔!''

''چلئے۔۔۔آپ ہی بتلا دیجیے۔۔۔برخوردار۔۔۔کلکتے میں۔۔۔کیا شغل فرماتے تھے۔۔۔؟''

''کلکتے میں۔۔۔کون ۔۔۔ اپنا منّا۔۔۔ ارے ۔۔۔ وہ کیا ہوتی ہے۔۔۔ٹوٹنکی۔۔۔ٹوٹنکی۔۔۔''(مصالحہ بھونتے ہوئے نظر اٹھائے بغیر)

''میں سنجیدہ بات کر رہا ہوں تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔۔۔ٹھیک۔۔۔ ٹھیک۔۔۔بتاؤ نا۔۔۔!''

''پھپھو۔۔۔ یہ۔۔۔ٹنکی۔۔۔ٹنکا۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ صاف۔۔۔ صاف۔۔۔بتاؤ نا۔۔۔ایکٹر تھا۔۔۔ایکٹر۔۔۔!''

''کیا تھا۔۔۔؟''

''لو بھلا بتلاؤ۔۔۔ میاں۔۔۔ ہیرو تھا۔۔۔ ہیرو۔۔۔ ڈرامے میں۔۔۔!''

''سچ کہہ رہے ہو۔۔۔!''(حیرانی سے ٹوپی اُتار کر سر کھجاتے ہوئے)

''قرآن اٹھالوں کیا۔۔۔!''

آخر گل اپنی صرف درمے کدہ ہوئی
پہنچے وہاں ہی خاک جہاں کا خمیر ہو

☆

''آہ۔۔۔ خاہ۔۔۔ زہے نصیب۔۔۔ زہے نصیب۔۔۔ آیئے۔۔۔تشریف لایئے۔۔۔!''

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

ان کا تعارف تو کرایئے (پشت کے نچلے حصے تک اشتیاق سے ہاتھ پھیرتے ہوئے) یہ خوبرو کون ہے۔۔۔؟

''کوئی ایرا غیرا نہیں۔۔۔بھتیجا ہے میرا۔۔۔بھتیجا۔۔۔!''

''بھتیجا۔۔۔(صوفی صاحب بدک کے پیچھے ہٹے جیسے بجلی کا کرنٹ لگا ہو) جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے۔۔۔آپ۔۔۔اپنے والدین کی۔۔۔اکلوتی اولادِ نرینہ ہیں۔۔۔!''

''درپے شک۔۔۔!''

''ایک وقت میں۔۔۔دو باتیں کیونکر درست ہو سکتی ہیں بھلا۔۔۔؟''

اماں صوفی صاحب۔۔۔آپ بھی نا۔۔۔ بیگم کا بھتیجا۔۔۔یا۔۔۔ ہمارا بھتیجا۔۔۔بات تو ایک ہی ہوئی نا۔۔۔!''

''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔۔۔آمد برسرِ مطلب۔۔۔یہ بتلایئے۔۔۔دِتّے کی چائے سے شوق فرمایئے گا۔۔۔ پہلوان کی لسّی سے جی بہلایئے گا۔۔۔یا۔۔۔دیوی پرساد کی۔۔۔ٹھنڈی ٹھار ربڑی سے۔۔۔لطف و کام دہن کیجیے گا۔۔۔؟''

''دیوی پرساد۔۔۔اور۔۔۔لاہور میں۔۔۔؟''

نہ معلوم کتنی نسلوں سے۔۔۔ دیوی پرساد کے پُرکھے۔۔۔ کرشن نگر لاہور میں۔۔۔دودھ۔۔۔دہی۔۔۔اور۔۔۔لسّی کے کام سے جڑے تھے۔۔۔ کوئی کہتا۔۔۔ دیوی پرساد کا باپ۔۔۔گری پرساد۔۔۔دودھ۔۔۔اور۔۔۔ کھوئے کی مٹھائی بنانے کا ماہر تھا۔۔۔کوئی۔۔۔ یہ ہنر۔۔۔ دیوی پرساد کے دادا۔۔۔وشنو پرساد۔۔۔ کے نام کرتا۔۔۔ہم تو ایک بات جانتے ہیں۔۔۔ کہ۔۔۔ پورے لاہور میں۔۔۔ دیوی پرساد کی ربڑی کی دھوم تھی۔۔۔ دیوی پرساد۔۔۔دکانداری کو۔۔۔عبادت جان کر کرتا۔۔۔ملاوٹ کا تصور۔۔۔اس

کے خاندان میں ناپید تھا ہی۔۔۔منافع کا تناسب بھی۔۔۔ایک آنہ فی روپیہ پر سختی سے کاربند رہتا۔۔۔!

تقسیم ہند کے بعد۔۔۔بے شمار ہندو تاجر۔۔۔اور۔۔۔دکاندار اپنا گھر۔۔۔اور۔۔۔کاروبار چھوڑ کر چلے گئے۔۔۔مگر۔۔۔دیوی پرساد۔۔۔کو جب بھی کوئی۔۔۔چاروں جانب منڈلانے والے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے۔۔۔لاہور چھوڑنے پر زور دیتا۔۔۔تو۔۔۔دیوی پرساد کا ایک ہی جواب ہوتا۔۔۔!

جو سُکھ چھجو دے چوبارے
او بلخ نہ بخارے

(اشارہ چوبارا چھجّو بھگت نزد میو ہسپتال لاہور)

اگر انڈیا کی جانب سے انسانی لاشوں سے اٹی ریل گاڑیاں نہ آتیں۔۔۔تو۔۔۔خدا معلوم۔۔۔کتنے دیوی پرساد۔۔۔بے گھر۔۔۔بے در۔۔۔ہونے سے بچ جاتے۔۔۔!

''بخدا صوفی صاحب۔۔۔دل رنج سے مہجور ہو رہا ہے۔۔۔آگے کی کہانی بھی بتلایئے۔۔۔!

جبری ہجرت کرنے والوں کا خیال تھا۔۔۔کہ۔۔۔یہ وقتی اُبال ہے۔۔۔جس کے بیٹھتے ہی۔۔۔لوگ باگ۔۔۔اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔۔۔گاندھی اور جناح نے۔۔۔مشترکہ اعلامیہ کے ذریعہ اس عزم کا اظہار بھی کیا۔۔۔مگر۔۔۔نادیدہ قوتوں کو یہ منظور نہ تھا۔۔۔تلے اوپر۔۔۔گاندھی۔۔۔اور۔۔۔جناح۔۔۔سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔۔۔یا۔۔۔کر دیئے گئے۔۔۔بقول مرزا غالب:

میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

''یقین مانیے صوفی صاحب۔۔۔آپ کا بیان سُن کر۔۔۔قرول باغ دہلی کے خونی مناظر آنکھوں میں گھوم گئے ہیں۔۔۔!''

''بے شک۔۔۔بے شک۔۔۔!''

''دیوی پرساد کا کیا بنا۔۔۔؟''

''دیوی پرساد بھی۔۔۔ان گنت۔۔۔اور۔۔۔ان شمار۔۔۔خواب آنکھوں میں سجائے۔۔۔اپنی دانست میں۔۔۔عارضی طور پر ہجرت کر گیا۔۔۔اور۔۔۔جاتے جاتے اپنے ملازم گلّو۔۔۔عرف غلام محمد کو۔۔۔اپنا سب کچھ سونپ گیا۔۔۔!

''سب کچھ۔۔۔؟''

''جی ہاں۔۔۔سب کچھ۔۔۔!''

''پھر۔۔۔؟''

''پھر۔۔۔پھُرّر۔۔۔!''

''مطلب۔۔۔؟''

''مطلب۔۔۔یہ۔۔۔کہ۔۔۔گلّو۔۔۔عرف غلام محمد۔۔۔کچھ عرصہ۔۔۔تو۔۔۔ڈرا سہما۔۔۔دیوی پرساد کی طرز پر۔۔۔دکان کا نظام چلاتا رہا۔۔۔مگر۔۔۔الاٹمنٹ۔۔۔اور۔۔۔کلیم کی ہڑبونگ میں۔۔۔وہ بھی۔۔۔پکّا مسلمان ہو گیا۔۔۔!''

کتنے دُکھ کی بات ہے۔۔۔!

یقیناً۔۔۔ارے بھئی طفیے کہاں رہ گئے ہو۔۔۔آ بھی جاؤ۔۔۔(ملازم کو آواز دیتے ہوئے)

''سرِ دست تو کسی چیز کی طلب نہیں۔۔۔ایک ضرورت کے تحت۔۔۔حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔۔۔!''

''ارشاد۔۔۔ارشاد۔۔۔ہمہ تن گوش ہوں'' (کان قریب لاتے ہوئے)

''برخوردار۔۔۔عمران میاں۔۔۔حال ہی میں۔۔۔دلّی سے مستقل لاہور آئے ہیں۔۔۔میراق انہیں ہے ایکٹر بننے کا۔۔۔!''

''کیا بننے کا۔۔۔؟''

''ایکٹر۔۔۔ایکٹر۔۔۔اداکار۔۔۔!''

''اوہ۔۔۔اچھا۔۔۔اداکار۔۔۔کوئی بھلا سا کام کیوں نہیں کرتے۔۔۔مثلاً۔۔۔!''

''اماں صوفی صاحب۔۔۔سب جتن کرنے کے بعد ہی۔۔۔آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔۔۔!''

''فرمایئے۔۔۔کیا خدمت کر سکتا ہوں۔۔۔اس باب میں۔۔۔؟''

''وہ آپ کے دوست ہیں نا۔۔۔شوکت حسین رضوی۔۔۔ڈائریکٹر۔۔۔پروڈیوسر۔۔۔سٹوڈیو اونر۔۔۔سب ہی کچھ تو ہیں۔۔۔آپ کے کہنے کی دیر ہے فقط۔۔۔!''

''یہ تو آپ بجا فرما رہے ہیں۔۔۔مگر۔۔۔سرِ دست اُن سے کچھ بھی کہنا۔۔۔قطعی طور پر مناسب نا ہے۔۔۔!''

''بھلا کیوں۔۔۔؟''

''وہ اس لیے برادرِ عزیز۔۔۔وہ ہے نا۔۔۔اُن کی کبوتری۔۔۔!''

(سانس کا لمبا وقفہ)

''نور جہاں۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔نور جہاں۔۔۔!''

''اللہ رحم کرے۔۔۔کیا ہوا نور جہاں کو۔۔۔؟''

''میاں۔۔۔وہ۔۔۔پھر سے اُڑان بھرنے کو پر تول رہی ہے۔۔۔!''

''یعنی۔۔۔وہی۔۔۔نذر محمد والا چکّر۔۔۔؟''

''اُوں۔۔۔ہُوں۔۔۔لوگوں کی طرح۔۔۔آپ کی معلومات

بھی۔۔۔بہت ناقص ہیں۔۔۔!''

''سمجھا نہیں۔۔۔!''

''میاں۔۔۔اتنی سادہ۔۔۔اور۔۔۔بدذوق نہیں ہے۔۔۔وہ۔۔۔ جو نذر محمد جیسے۔۔۔ کالے کوجے۔۔۔ اور۔۔۔ مندرے کو۔۔۔ دل دے بیٹھے۔۔۔!''

''مندرے۔۔۔؟''

''میرا مطلب ہے۔۔۔گٹھا۔۔۔ناٹا۔۔۔ناٹا۔۔۔!''

''پھر۔۔۔؟''

''نذر محمد تو بے چارا۔۔۔قاصد تھا۔۔۔فقط قاصد۔۔۔!''

''قاصد۔۔۔مگر۔۔۔کس کا۔۔۔؟''

''مقصود احمد۔۔۔المعروف۔۔۔میری میکس کا۔۔۔!''

''عجب معاملہ ہے۔۔۔سمجھنے کا۔۔۔نہ۔۔۔سمجھانے کا۔۔۔مگر۔۔۔ اس تمام قضیے سے۔۔۔میری بات کا۔۔۔کیا تعلق۔۔۔؟''

''بندے خدا۔۔۔یہ قضیہ تو برسبیل تذکرہ آ گیا۔۔۔!''

''پہیلیاں نہ بجھوایئے۔۔۔!''

''لو۔۔۔آپ پہیلیاں لیے بیٹھے ہیں۔۔۔وہاں نوبت۔۔۔طلاق تک جا پہنچی ہے۔۔۔!''

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں

''طلاق۔۔۔؟''

''سنا ہے۔۔۔اعجاز درّانی نام کا لڑکا ہے۔۔۔نیا۔۔۔نیا۔۔۔ہیرو وارد ہوا ہے۔۔۔دن رات ایک کیے ہوئے ہے۔۔۔اُسے کامیاب کرانے کے لیے۔۔۔گانے بھی۔۔۔بلا معاوضہ گا رہی ہے۔۔۔اور۔۔۔موسیقاروں۔۔۔ و۔۔۔تقسیم کاروں تک سے۔۔۔اُس کی فلم خریدنے۔۔۔یا۔۔۔بکوانے کی۔۔۔سازباز میں لگی ہے۔۔۔وہ کیا کہتے ہیں:

گوٹے میں ٹانکی کرن آفتاب کی
جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

''یہ تو اچھی خبر نہیں ہے۔۔۔میں تو۔۔۔بڑی اُمیدوں سے۔۔۔بچے کو لے کر آپ کے پاس آیا تھا۔۔۔!''

''ہوں۔۔۔کچھ۔۔۔اور۔۔۔سوچتے ہیں۔۔۔!''

''سوچنا بھی آپ نے ہے۔۔۔اور۔۔۔کرنا بھی۔۔۔آپ نے ہی ہے۔۔۔''

''اچھا۔۔۔تو۔۔۔تو۔۔۔یوں کرتے ہیں (چٹکی بجاتے ہوئے) آپ کل شام چار بجے تشریف لے آیئے۔۔۔!''

''پھر۔۔۔؟''

''پھر۔۔۔یہ۔۔۔کہ۔۔۔اپنے۔۔۔وہ۔۔۔ہیں۔۔۔نا۔۔۔ حکیم احمد شجاع پاشا۔۔۔!''

''جی۔۔۔جی۔۔۔انہیں کون نہیں جانتا۔۔۔مگر۔۔۔!''

''اگر۔۔۔مگر۔۔۔چھوڑیئے۔۔۔حکیم احمد شجاع پاشا کے اکلوتے صاحبزادے۔۔۔انور کمال پاشا کا۔۔۔طوطی بول رہا ہے۔۔۔طوطی۔۔۔ کوئی۔۔۔نا۔۔۔کوئی۔۔۔سبیل نکل ہی آئے گی۔۔۔!''

''واہ صاحب۔۔۔بہت خوب۔۔۔اس کو کہتے ہیں۔۔۔یک نہ شُد دو شد۔۔۔اللہ جانتا ہے۔۔۔مجھے آپ کی زبانی علم ہوا۔۔۔کہ۔۔۔انور کمال پاشا۔۔۔حکیم احمد شجاع پاشا کے فرزندِ ارجمند ہیں۔۔۔!''

''اسی پر بس نہیں جناب۔۔۔بڑے باپ کے۔۔۔بڑے بیٹوں والی۔۔۔ساری خوبیاں۔۔۔اور صفات کے حامل ہیں۔۔۔انور کمال پاشا۔۔۔ ایک طرح سے۔۔۔پاکستانی فلم جگت کے۔۔۔باوا آدم کہلانے لگے ہیں۔۔۔ اب تو۔۔۔اُن کے کئی شاگرد۔۔۔مثلاً۔۔۔حسن طارق۔۔۔آصف رضا میر۔۔۔خلیل قیصر وغیرہ بھی معروف فلمساز۔۔۔اور۔۔۔ہدایتکاروں میں۔۔۔ شمار ہوتے ہیں۔۔۔!''

''اشتیاق بڑھا رہے ہیں آپ۔۔۔!''

''اشتیاق۔۔۔اشتیاق تو اُس وقت بڑھے گا۔۔۔جب آپ کو معلوم ہوگا۔۔۔کہ۔۔۔نامور باپ کے۔۔۔لائق بیٹے نے۔۔۔کمشنر انکم ٹیکس کے عہدے کو لات مار کر۔۔۔فلم انڈسٹری میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔۔۔ اور۔۔۔پے در پے سرفروش، انارکلی، آنسو اور غلام جیسی سپرہٹ فلم دے کر۔۔۔ بڑے بڑوں کی سٹی گم کر دی ہے۔۔۔!''

''بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں جناب۔۔۔آپ ہی نے تو فرمایا ہے:

چشم را اشک بار تر گرداں
قلب را سوگوار تر گرداں

''ارے واہ واہ۔۔۔ماشاءاللہ۔۔۔بہت خوب (خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے) آپ کو ناچیز کا۔۔۔کلام یاد ہے۔۔۔وہ بھی فارسی کا۔۔۔ پڑھیے۔۔۔پڑھیے۔۔۔آپ کی زبانی اپنا کلام سن کر لطف آ رہا ہے۔۔۔!

چشم را اشک بار تر گرداں
قلب را سوگوارا تر گرداں
جذبۂ عشق را نہایت نیست
روح را بے قرار تر گرداں
چشم را نیست تابِ محرومی
حسن را آشکار تر گرداں
راحتے نیست زندگانی را

مرگ را خوشگوار تر گرداں
یا نگاہے بالِ زارم کن
یا دلم را فگار تر گرداں
درجہاں فرصتِ تبسم نیست
چشم را اشک بار تر گرداں

''بخدا۔۔۔آپ کی زبانی۔۔۔اپنا کلام۔۔۔وہ بھی فارسی سن کر۔۔۔ طبیعت چونچال ہوگئی۔۔۔اس وقت مجھے۔۔۔اپنے۔۔۔محروم صاحب۔۔۔ شدت سے یاد آرہے ہیں۔۔۔!''

''محروم صاحب۔۔۔؟''

''اماں۔۔۔تلوک چند محروم۔۔۔ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔۔۔اقبال کے روبرو۔۔۔اُن کے کسی ممدوح نے۔۔۔اقبال کے اشعار سنائے۔۔۔تو۔۔۔ اقبال نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے۔۔۔اُن صاحب کی پیٹھ تھپتھپائی۔۔۔ قریب بیٹھے دوسرے صاحب گویا ہوئے۔۔۔علامہ صاحب۔۔۔آپ چند اشعار سن کر تعجب کا اظہار کر رہے ہیں۔۔۔جبکہ۔۔۔اسی شہرِ لاہور میں۔۔۔ ایک نوجوان۔۔۔ایسا بھی پایا جاتا ہے۔۔۔جسے آپ کا۔۔۔تمام کلام زبانی ازبر ہے۔۔۔!''

''اچھا۔۔۔کون ہے وہ نوجوان۔۔۔کبھی موقع ملے۔۔۔تو۔۔۔ ملوایئے۔۔۔!''

''اماں۔۔۔وہ نوجوان کوئی اور نہیں۔۔۔آپ کے ہمدم دیرینہ۔۔۔ محروم صاحب کا بیٹا ہے۔۔۔!''

''محروم صاحب کا بیٹا۔۔۔؟''

''جی حضور۔۔۔محروم صاحب کا۔۔۔اکلوتا بیٹا۔۔۔!''

''خیر سے کیا نام ہے۔۔۔اُس ذہین نوجوان کا۔۔۔؟''

''نام تو جانا پہچانا ہے۔۔۔نام۔۔۔اللہ آپ کا بھلا کرے۔۔۔ جی۔۔۔نام ہے اُس نوجوان کا۔۔۔جگن ناتھ۔۔۔تخلص آزاد ہے۔۔۔اچھے شعر کہتا ہے۔۔۔اکثر۔۔۔یہاں دیکھا گیا ہے۔۔۔وہ۔۔۔دونوجوان۔۔۔ کبھی کبھی۔۔۔آتے ہیں نا۔۔۔موٹے موٹے پگڑ والے۔۔۔!''

''پگڑ والے۔۔۔پگڑ والے تو۔۔۔کئی احباب آتے ہیں۔۔۔آپ کا اشارہ کن کی طرف ہے۔۔۔؟''

''ارے بھئی علی بخش۔۔۔بتلاؤ نا۔۔۔تمہارے۔۔۔تو۔۔۔ہم نوالہ۔۔۔ہم پیالہ۔۔۔اور۔۔۔ہم مزاج ہیں۔۔۔وہ دونوں۔۔۔!''

''اچھا۔۔۔اچھا۔۔۔دبلی وضع قطع کے۔۔۔وہ۔۔۔ہنسوڑ نوجوان۔۔۔ضمیر جعفری۔۔۔اور۔۔۔ندیم قاسمی۔۔۔!''

''بالکل۔۔۔بالکل۔۔۔وہی۔۔۔کئی بار۔۔۔اُن کے ہمراہ بھی آیا ہے۔۔۔وہ نوجوان۔۔۔یعنی۔۔۔اپنے محروم صاحب کا بیٹا۔۔۔!''

''بس پھر دیر کاہے کی۔۔۔جلد بلوایئے۔۔۔!''

☆

''پاک سرزمین شاد باد
کشور حسین شاد باد
تو نشانِ عزم عالیشان
ارض پاکستان
مرکز یقین شاد باد''

(قریب تمام دوستوں نے، گرم گرم چائے، پیسٹری اور پیٹیز سے سرفِ نظر کرتے ہوئے ہم آواز ہوکر قومی ترانہ گا کر صوفی صاحب کا استقبال کیا تو ایک لمحے کے لیے، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے چہرے پر حیرت و استعجاب کی لکیریں نمایاں ہوئیں چند ثانیوں کے بعد، صوفی صاحب کی روایتی بذلہ سنجی عود کر آئی)

''خیر تے ہے۔۔۔اج۔۔۔کیہہ دی جنج چاڑ دے پیئے او۔۔۔؟''

(خیریت تو ہے آج کس کی بارات چڑھا رہے ہو)

''تہاڈی۔۔۔ہور۔۔۔کیہدی۔۔۔!''(آپ کی اور کس کی)

''چاڑو۔۔۔چاڑو۔۔۔رج کے چاڑو''(چڑھاؤ، چڑھاؤ، دل کھول کے چڑھاؤ)

''چاڑ دے تے پیئے آں۔۔۔ہور کیویں چاڑیئے۔۔۔؟''(چڑھا تو رہے ہیں اور کس طرح چڑھائیں)

''باندر ونگر۔۔۔بے سُری آوازاں کڈھ کے۔۔۔بندہ۔۔۔میراثی نی بن جاندا۔۔۔!''(بندروں کی طرح بے سُری آوازیں نکال کر بندہ میراثی نہیں بن جاتا)

''فیر کینویں بنڑدا اے حضور۔۔۔؟''(پھر کس طرح بنتا ہے حضور)

''اے اپنے کولوں پوچھ کے آئیں۔۔۔اوہی دس سکدا اے''(یہ ابّا سے معلوم کرنا وہی بتلا سکتے ہیں)

''چھڈو جی۔۔۔صوفی صاحب۔۔۔ہور سناؤ کیہہ حال اے۔۔۔؟''

(چھوڑیں جی، صوفی صاحب، اور سنائیں کیا حال ہے، ظہیر کاشمیری نے کُرسی پیش کرتے ہوئے صوفی صاحب کو بیٹھنے کی پیشکش کی)

''میرا تے ٹھیک اے۔۔۔پر۔۔۔تہاڈا ساریاں دا ٹھیک نی لگدا۔۔۔؟''(میرا تو ٹھیک ہے، آپ لوگوں کا ٹھیک نہیں لگتا)

''اے تسی کینویں اندازہ لایا۔۔۔؟''(یہ آپ نے کس طرح محسوس کیا، احمد مشتاق نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے صوفی صاحب سے دریافت کیا)

''پہلاں تے اے دسو۔۔۔تہاڈے وچو کسی ایک دی ماں موئی اے۔۔۔کہ۔۔۔ساریاں دی کٹھی موگئی اے۔۔۔؟''(پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم میں سے کسی ایک کی ماں کا انتقال ہوا ہے یا ساروں کی ماں فوت ہوگئی ہے)

''کیہو جی گلاں کر دے ہو صوفی صاحب۔۔۔شبھ شبھ بولو۔۔۔شبھ

شبھ۔۔۔!'' (کیسی باتیں کررہے ہیں صوفی صاحب، شبھ شبھ بولیے، شبھ شبھ)

''ٹین وی میرا تسی لاؤ۔۔۔ تے۔۔۔ شبھ شبھ وی میں بولا۔۔۔ تہاڈی۔۔۔ راں۔۔۔! (باجا بھی میرا بجاؤ اور شبھ شبھ بھی مجھ سے بلواؤ۔۔۔ تمہاری ایسی تیسی نہ کروں)

''اچھا اے دسو۔۔۔ چا پیئو گے۔۔۔ یا۔۔۔ بوتل۔۔۔؟'' (یہ بتایئے کہ چائے پیش کی جائے یا بوتل، احمد ندیم قاسمی کے دریافت کرنے پر صوفی صاحب نے ترکی بہ ترکی کہا)

''خون۔۔۔ دسو۔۔۔ کیہدا پی واں۔۔۔!'' (خون، بتاؤ کس کا پیئوں)

''گُسا کاہنوں کردے او سرکار۔۔۔ پیار محبت دی گلاں کرو۔۔۔ پیار محبت دی۔۔۔!'' (غصہ کیوں کرتے ہو سرکار، پیار محبت کی باتیں کرو، پیار محبت کی) صفدر میر نے، صوفی صاحب کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے رام کرنے کی کوشش کی۔

''سٹھاں سال دی عمر وچ۔۔۔ پیار نی ہوندا۔۔۔ دُلار ہوندا اے۔۔۔ دُلار۔۔۔ او۔۔۔ وی۔۔۔ موقع محل ویکھ کے۔۔۔!'' (ساٹھ سال کی عمر میں، پیار نہیں،، دلار ہوتا ہے، وہ بھی موقع محل دیکھ کر)

''اچھا جی۔۔۔؟''

''اچھا جی۔۔۔ بڑی دُوروں کڈھی ہے۔۔۔ خیر تے اے۔۔۔ قبض تے نی ہوئی۔۔۔؟'' (اچھا جی، بہت دور سے نکالی ہے، قبض تو نہیں ہوئی، نذیر ناجی کی کلاس لیتے ہوئے صوفی صاحب نے اپنی سی کوشش کی)

''آپ تو ناحق خفا ہو رہے ہیں صوفی صاحب۔۔۔ ہم تو فقط۔۔۔ خیریت دریافت کرنا چاہتے تھے۔۔۔؟''

''خیریت۔۔۔ کس کی خیریت؟'' (انتظار حسین کے استفسار پر صوفی صاحب نے مخصوص انداز میں ہاتھ نچا کر جاننا چاہا)

''اُن کی۔۔۔ اور۔۔۔ کن کی۔۔۔؟''

''جے گالاں کھاڑیاں نے۔۔۔ تے۔۔۔ صاف دسو۔۔۔؟''

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوا

''لب تُو علاوہ وی۔۔۔ بہت کچھ۔۔۔ عزیز وی اے۔۔۔ تے۔۔۔ لذیذ وی۔۔۔!''

''دیکھو جی۔۔۔ سالم ٹانگہ ہوے۔۔۔ بغل اچ جنّت دی حور ہوے۔۔۔ شکر دوپہر ہوے۔۔۔ تے صوفی جا پیر ہوے۔۔۔ تے۔۔۔ بندہ۔۔۔ رانجھا بنڑے۔۔۔ یا۔۔۔ مہیوال۔۔۔ پنجیں گھیئو وچ۔۔۔!''

(دیکھو جی، سالم ٹانگہ ہو، بغل میں جنّت کی حور ہو، تپتی دوپہر ہو اور صوفی جیسا پیر ہو تو انسان رانجھا بنے یا مہیوال، پانچوں گھی میں ہوتی ہیں)

''گھیئو اِچ نئیں۔۔۔ برقعے اِچ۔۔۔ آکھو۔۔۔ برقعہ اِچ۔۔۔!''

''تُو بڑا اُچھل اُچھل کے سواد لے ریا اے۔۔۔ اپنی وی تے دس۔۔۔ بھولُو پہلوان کولوں۔۔۔ دھوبی پٹڑا کھا کے۔۔۔ کیویں دوڑیا سی۔۔۔'' (تُو بڑا اُچھل اُچھل کے مزے لے رہا ہے، اپنی حالت بھی تو بتا، بھولُو پہلوان سے، دھوبی پٹڑا کھا کے کس طرح بھاگا تھا، صوفی صاحب نے ظہیر کاشمیری کو اپنی دانست میں لتاڑا تو وہ اور ترنگ میں آ گئے)

''بھولے بادشاہو۔۔۔ بھولُو پہلوان۔۔۔ تے۔۔۔ بڑے پیچے بندے نے۔۔۔ اُنہاں نوں۔۔۔ داپیچ لا نڑدی کیہہ لوڑ اے۔۔۔ اوہ تے۔۔۔ لسّی پیا پیا کے۔۔۔ بندہ مار چھڈ دے نیں۔۔۔!''

''بس کرو بھئی۔۔۔ بس کرو۔۔۔ بڈھے بندے نو۔۔۔ ایہنا وی نئی ستائی دا۔۔۔!'' (بس کرو بھئی، بس کرو، بوڑھے آدمی کو اتنا بھی نہیں ستانا چاہیے، یوسف کامران نے، صوفی صاحب کے مونڈھے دباتے ہوئے شیشے میں اتارنے کی کوشش کی)

''بڈھا ہوئے گا تُوں۔۔۔ تیرا پیئو۔۔۔ تیرا۔۔۔!'' (بوڑھا ہوگا تُو، تیرا باپ، تیرا)

''چلو جی۔۔۔ ڈاھڈے داستاں ویہاں دا سو۔۔۔ اسی بڈھے۔۔۔ ساڈا پیو، دادا۔۔۔ بلکہ۔۔۔ سارا خاندان بڈھا۔۔۔!''

(چلیں جی طاقتور کا سات بیسی کا سو، ہم بوڑھے، ہمارا باپ، دادا بلکہ سارا خاندان بوڑھا، امتیاز علی تاج نے صوفی صاب کے شانوں کو دباتے ہوئے گفتگو کا رخ موڑنے کی کوشش کے ساتھ، صوفی صاب اور اُن کے مہمان کی تواضع کا اہتمام کیا)

☆

''باتوں۔۔۔ باتوں میں۔۔۔ مہمان کا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔۔۔ یہ ہیں قاضی وحید الدین۔۔۔ آبائی تعلق۔۔۔ میوات سے ہے۔۔۔ البتہ دہلی کے قیام نے انہیں کُلی طور پر دہلوی بنا دیا ہے۔۔۔ اب دیکھئے۔۔۔ لاہوری کب بنتے ہیں۔۔۔؟'' (زور کا قہقہہ)

''میں احمد ندیم قاسمی ہوں۔۔۔!'' (ہاتھ بڑھاتے ہوئے)

''مجھے ظہیر کاشمیری کہتے ہیں۔۔۔!'' (کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے)

''مجھے تو آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہے'' (انتظار حسین نے ہاتھ ملاتے ہوئے)

''یہ ہیں سجاد باقر رضوی۔۔۔!''

''جی۔۔۔ جی۔۔۔ باقر رضوی صاحب سے۔۔۔ غائبانہ تعارف ہے میرا۔۔۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔۔۔!''

''دلچسپ۔۔۔ اور۔۔۔ سجاد باقر رضوی۔۔۔ (سید امتیاز علی تاج نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے جھٹ امیر مینائی کا شعر جڑ دیا)

ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم ان کی نہیں جاتی
نگہہ نیچی کیے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

''ہاں تو قبلہ۔۔۔؟''

''قاضی وحید الدین ۔۔۔!''(صوفی صاب نے لقمہ دے کر قاضی صاحب کا نام بتلایا)

''جی۔۔۔قاضی وحیدالدین صاحب۔۔۔آپ۔۔۔سجاد باقر رضوی صاحب کی نسبت کچھ بتلا رہے تھے۔۔۔؟''

''ارے صاحب بڑے نامی گرامی فلم ساز اور ہدایتکار ہیں باقر رضوی صاحب۔۔۔!''

''ہیں۔۔۔فلم ساز۔۔۔ہدایتکار۔۔۔؟''

''قصّے بتلایئے قصّے۔۔۔!''

''قصّے۔۔۔ہُوں۔۔۔ایک دلچسپ قصہ۔۔۔تو۔۔۔یہ ہے۔۔۔ کہ۔۔۔موصوف کو۔۔۔اداکارہ دیبا کی چھوٹی بہن فریدہ سے عشق ہوگیا۔۔۔!''

''سجاد باقر رضوی کو۔۔۔؟''(احمد مشتاق نے تعجب کا اظہار کیا)

''جی۔۔۔جی۔۔۔باقر رضوی صاحب کو۔۔۔!''

''پھر۔۔۔؟''(ایک آواز)

''آگ دونوں طرف تھی برابر لگی ہوئی۔۔۔مگر۔۔۔باقر صاحب کا شادی شدہ ہونا آڑے آرہا تھا۔۔۔!

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

والا معاملہ تھا۔۔۔!''

''آگے بتلایئے۔۔۔آگے۔۔۔!''

''باقر صاحب نے اپنی بیگم کو مصروفیت کا عذر تراش کر، میکے بھیج دیا۔۔۔اور۔۔۔گھر کو تالا لگا کر۔۔۔خود بھی کئی روز کے لیے روپوش ہو گئے۔۔۔!''

''باقر صاحب۔۔۔؟''

''جی۔۔۔جی۔۔۔باقر صاحب۔۔۔!''

چلتے رہیے۔۔۔!

اس گمشدگی کے دوران۔۔۔باقر صاحب نے۔۔۔عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، دانستہ شیو نہیں کی۔۔۔کئی روز کی گمشدگی کے بعد۔۔۔حسبِ معمول۔۔۔باقر صاحب۔۔۔اپنے گھر کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر دھوپ سینک رہے تھے۔۔۔دیگر اہل محلّہ سے علیک سلیک کے بعد۔۔۔دیبا بیگم کی بہن فریدہ بیگم بھی۔۔۔حسبِ معمول وہاں سے گزریں۔۔۔باقر صاحب کے بکھرے ہوئے بال۔۔۔اور۔۔۔بڑھی ہوئی شیو دیکھ کر پریشانی میں گویا ہوئیں:

''یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے باقر۔۔۔!''

''باقر صاحب نے تمام تر ہدایتکارانہ مہارت کو کام لاتے ہوئے۔۔۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے کہا۔۔۔بیگم فوت ہوگئی۔۔۔!''

دو۔۔۔چار۔۔۔چھ۔۔۔دن کا سوگ منا کر۔۔۔عشق کی پینگیں بڑھنے لگیں۔۔۔اور۔۔۔مہینہ بعد باقر صاحب نے۔۔۔فریدہ بیگم کو کچھ اس طرح شیشے میں اتارا۔۔۔کہ۔۔۔وہ خوشی خوشی باقر صاحب سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوگئی۔۔۔بقول ناطق لکھنوی:

جسے ڈھونڈا اُسے پایا اِسے تدبیر کہتے ہیں
مگر خود کھو گئے آخر اسے تقدیر کہتے ہیں

''ایک بات کی تو داد دینی ہی چاہیے۔۔۔کہ۔۔۔قاضی صاحب نے۔۔۔جس مشّاقی سے باقر صاحب کا کچّا چٹھا بیان فرمایا ہے۔۔۔اُسی سادگی۔۔۔بلکہ۔۔۔بیگانگی سے سجاد باقر رضوی۔۔۔انجان بنے بیٹھے ہیں۔۔۔!''

''حضور۔۔۔میں ہر الزام۔۔۔سر لینے کو تیار ہوں۔۔۔بس ایک بار۔۔۔عقدِ ثانی کرا دیجیے۔۔۔!''(سجاد باقر رضوی نے دلہوں کی طرح شرماتے ہوئے صلاح الدین محمود کی جانب روئے سخن کرتے ہوئے دلی خواہش کا اظہار کیا تو قاضی وحیدالدین بھونچکاں رہ گئے، دائیں بائیں بغلیں جھانکتے ہوئے گویا ہوئے)

''آپ کا مطلب کیا ہے۔۔۔یعنی۔۔۔یعنی۔۔۔آپ۔۔۔کہنا کیا چاہتے ہیں۔۔۔؟''

''وہی۔۔۔جو۔۔۔آپ کے لیے۔۔۔سننا۔۔۔بلکہ۔۔۔جاننا ضروری ہے۔۔۔!''

''مثلاً۔۔۔؟''

''مثلاً یہ کہ۔۔۔آپ جن کے قصّے۔۔۔نمک مرچ لگا کر۔۔۔سنا رہے ہیں۔۔۔وہ۔۔۔باقر رضوی۔۔۔اور۔۔۔ہوں گے۔۔۔آپ کے روبرو۔۔۔جو صاحب۔۔۔تشریف فرما ہیں۔۔۔یہ ماہر تعلیم۔۔۔ادیب۔۔۔ نقاد۔۔۔اور۔۔۔شاعر۔۔۔پروفیسر سجاد باقر رضوی ہیں۔۔۔ان کی تو پہلی شادی بھی۔۔۔ان کی نہیں۔۔۔بیگم کی مرضی سے ہوئی ہے۔۔۔آئندہ بھی ایسا اگر کوئی حادثہ ہوا۔۔۔تب بھی۔۔۔ان کی بیگم کی۔۔۔مرضی۔۔۔و۔۔۔منشا سے ہوگا۔۔۔بقول قابل اجمیری:

اُتر سکتے ہو پار لیکن مآل پر بھی نگاہ کر لو
خدا نہ کردہ سکونِ ساحل نہ راس آیا تو کیا کرو گے

کیا خیال ہے صوفی صاحب۔۔۔اجازت نہ لی جائے۔۔۔؟(قاضی وحیدالدین نے قریب قریب کھڑے ہوتے ہوئے صوفی صاحب سے چلنے کی فرمائش کی)

ابھی بیٹھے نہیں ہو تم کہ پھر دامن سنبھالا ہے
تمہاری جاؤں جاؤں نے تو میرا دم نکالا ہے

''جاؤں۔۔۔جاؤں۔۔۔دا۔۔۔قافیہ کیہہ ہے۔۔۔؟''

''آؤں۔۔۔آؤں۔۔۔!''(جاوید شاہین نے تُرت جواب دیا)

''تے فیر۔۔۔حکیم کول جا۔۔۔ایتھے بیہہ کے۔۔۔کُرسی کیوخراب کردا پیا اے۔۔۔!''(تو پھر حکیم کے پاس جاؤ، یہاں بیٹھ کر کرسی کیوں خراب کرتے ہو، زور کا قہقہہ)

''اچھا بھئی منڈیوں۔۔۔بالیوں۔۔۔اجازت دیو۔۔۔سانو۔۔۔ حکیم صاحب کول جانا ہے۔۔۔!''

''حکیم صاحب۔۔۔؟''(ایک ساتھ کئی تعجب آمیز آوازیں)

''اوہ والے نئیں۔۔۔اپنے حکیم احمد شجاع پاشا۔۔۔!''

''اے کینویں ہوسکدا اے۔۔۔؟''(امتیاز علی تاج نے حیرت اور تعجب کے ملے جلے جذبات میں کہا)

''جینویں روز ہوندا اے۔۔۔!''

''مثلاً۔۔۔روز کیہہ ہوندا اے۔۔۔؟

''ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے۔۔۔کہ۔۔۔آج۔۔۔!''(انتظار حسین کا جملہ مکمل ہونے سے قبل، بائیں ہاتھ سے چشمہ درست کرتے اور دائیں ہاتھ سے، آداب وتسلیم کرتے ہوئے ابن انشاء برآمد ہوئے تو محفل میں اُبال آ گیا)

حسن والے تیرا جواب نہیں
کوئی تجھ سا نہیں ہزاروں میں

(کئی دوست ہم آواز ہو کر)

''ہزاروں نہیں۔۔۔لاکھوں کہیے۔۔۔لاکھوں۔۔۔مگر۔۔۔یہ ضرور بتلا دیجیے۔۔۔کہ۔۔۔یہ حُسن۔۔۔صوری ہے۔۔۔یا۔۔۔معنوی۔۔۔؟''

''اُوں ۔۔۔ ہوں۔۔۔ اماں ۔۔۔ یہ ۔۔۔ حسنِ نظر والا حُسن ہے۔۔۔!''

''یہ کہاں پایا جاتا ہے۔۔۔؟''(امتیاز علی تاج نے ٹھوڑی کو ہاتھ کی مٹھی پر ٹکاتے ہوئے دریافت کیا)

''انشا کے گھر کے سامنے۔۔۔!''

''بہتر ہوگا۔۔۔پہیلیاں بجھانے کے بجائے۔۔۔صاف صاف بتلایا جائے۔۔۔!''(صلاح الدین محمود نے پہلو بدلتے ہوئے خواہش کا اظہار کیا)

''میاں پاپوش نگر میں۔۔۔انشا کے گھر کے سامنے۔۔۔ایک عرصے سے کچرا منڈی ہوا کرتی تھی۔۔۔جب صاحبزادے کو آدم جی ایوارڈ ملا تو کسی نے بلدیہ والوں کو شرم دلائی۔۔۔جس کے جواب میں۔۔۔اہل بلدیہ نے۔۔۔انشا کے گھر کے آگے سے کچرا منڈی اُٹھوا دی۔۔۔چند دن۔۔۔یا۔۔۔چند ہفتے گزرے ہوں گے۔۔۔کہ۔۔۔موصوف۔۔۔ایک لمبی چوڑی عرضی لے کر بلدیہ کراچی کے دفتر جا پہنچے۔۔۔!''

''کیا لکھا تھا اُس عرضی میں۔۔۔؟''(اس بار جاوید شاہین نے شوخی اور شرارت کے سارے جوہر استعمال کیے)

''عرضی میں اہل بلدیہ سے درخواست کی گئی تھی۔۔۔کہ۔۔۔اٹھوائی گئی کچرا منڈی کو۔۔۔فی الفور اپنی جگہ واپس لایا جائے۔۔۔کیونکہ۔۔۔ مہمانوں کو میرا گھر تلاش کرنے میں دقت کا سامنا ہے۔۔۔!''

''اماں فالتو باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے۔۔۔صوفی صاحب کو کُرسی صدارت پر براجمان کیجیے۔۔۔اور۔۔۔آج کی محفل کے دولہا سے تازہ غزل سنیے۔۔۔تازہ غزل۔۔۔''انشا جی نے، ایک بار پھر دونوں ہاتھوں کو اُسی طرز پر استعمال کرنے کے بعد، سامعین کے دائیں بائیں معصوم مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے۔۔۔بوشرٹ کی پیچ پاکٹ سے، کاغذ نکالا اور آہستہ آہستہ کاغذ کی تہیں کھولنے کے بعد، مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے مطلع سنانا شروع کیا:

کل چودھویں کی رات تھی، شب بھر رہا چرچا تیرا
کچھ نہ کہا یہ چاند ہے، کچھ نہ کہا چہرا تیرا
ہم بھی وہیں موجود تھے، ہم سے بھی سب پوچھا کیے
ہم ہنس دیئے، ہم چُپ رہے، منظور تھا پردا تیرا
اس شہر میں کِس سے مِلیں، ہم سے تو چُھوٹیں محفلیں
ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانہ تیرا
کُوچے کو تیرے چھوڑ کے جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل تیرے، پربت تیرے، بستی تیری، صحرا تیرا
تُو باوفا، تُو مہرباں، ہم اور تجھ سے بدگماں؟
ہم نے تو پوچھا تھا ذرا، یہ وصف کیوں ٹھہرا تیرا
بے شک اسی کا دوش ہے، کہتا نہیں خاموش ہے
تو آپ کر ایسی دوا، بیمار ہو اچھا تیرا
ہم اور رسمِ بندگی؟ آشفتگی؟ اُفتادگی؟
احسان ہے کیا کیا تیرا، اے حسنِ بے پروا تیرا
دو اشک جانے کِس لیے، پلکوں پہ آ کر ٹِک گئے
الطاف کی بارش تیری اکرام کا دریا تیرا
اے بے دریغ و بے اماں، ہم نے کبھی کی ہے فغاں؟
ہم کو تری وحشت سہی، ہم کو سہی سودا تیرا
ہم پر یہ سختی کی نظر، ہم ہیں فقیرِ رہگزر
رستہ کبھی روکا تیرا دامن کبھی تھاما تیرا
ہاں ہاں تیری صورت حسیں، لیکن تُو اتنا بھی نہیں
اس شخص کے اشعار سے شہر ہوا کیا کیا تیرا
بے درد، سُنی ہو تو چل، کہتا ہے کیا اچھی غزل
عاشق تیرا، رسوا تیرا، شاعر تیرا، اِنشا تیرا

"حقیقت کا شعور"

قلوپطرہ

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

(۱)

لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کے طریقے سیکھو
اپنا یہ حال کہ جینے کا بھی احساس نہیں
حادثے دل پہ وہ گزرے ہیں کہ دل سنگ ہوا

وقت کے سیلِ رواں کی زد میں
کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ لبِ ساحلِ شوق
چند لمحوں کے لئے ٹھیرنا درکار رہا
ہم نے چاہا کہ گزرتے ہوئے لمحے تھم جائیں

ریت پر شہر
بسائے گئے ارمانوں کے
سنگِ اسود کی جگہ دل کو سجا کر ہم نے
نئے کعبے کی، نئے دیر کی بنیاد رکھی

ثبت پھر دل پہ ہوئے پھول سے ہونٹوں کے نقوش
یوں کسی دستِ حنائی نے
چھوا بھی دل کو
سنگِ اسود ہی نہیں
دل ہوا سنگِ وعدہ!

وقت کے سیل سے
خوابوں کے جزیرے ابھرے

ہر جزیرے میں نئے شہر کی بنیاد پڑی
ہر نیا شہر بنا
مصر کا تازہ بہروپ
اپنی قسمت کہ ہمیں کوئی زلیخا نہ ملی
ورنہ بازار میں بکنے سے بھی کچھ عار نہ تھا

(۲)

لوگ کہتے ہیں پتھر سے ترا شوا صنام
ہم نے جو بت بھی ترا شا
قلوپطرہ میں ڈھلا!
ہم نے جب دل کو ٹٹولا
خلشِ دل کا سبب
پھول کی پتی کی صورت کوئی کانٹا نکلا
حسن کو ہم نے سدا شعلہ بداماں دیکھا
ایک اک جلوے کو مشتاقِ شہیداں پایا

کون پہچانے کہ ہے زلفِ سیاہ
مارِ سیاہ
کون جانے کہ ہیں ابرو کے اشاروں میں نہاں
جان سے، جی سے، گزر جانے کے
کتنے پیغام!
کہتی ہیں آنکھ کی جھیلیں کہ ڈبو دو سب کچھ
ہار اور جیت کا احساس
حقیقت کا شعور

پلکیں رقصاں ہیں
کہ جذبات بھی رقصاں ہی رہیں
لب یہ کہتے ہیں کہ خاموش رہو۔۔۔کچھ نہ کہو

○

کہانی ایک شہر کی

ڈاکٹر جواز جعفری
(لاہور)

سلام اس شہر پر
جو گیتوں کے وسط میں آباد ہوا
اور میری شعری اقلیم کا وارث ٹھہرا
سلام شہر پر
جو فاتحین کی گزرگاہ بنا
سلام گزرگاہ پر
جو زمین کا زیور ہے
سلام زمین پر
جس کے پہلو میں دریا بہتا ہے
سلام دریا پر
جس کے کناروں پہ اجنبی قافلوں نے قدم آرائی کی
سلام کناروں پر
جو شال سے آئے گھوڑوں کے سموں کا رزق ہوئے
میں نے اس وقت شہر سے وفاداری کی
شہر کے بیٹے
جب ہجرت ایجاد کرنے کا جتن کرتے تھے
خون کی بارش میں
میں نے امید اور مزاحمت کے گیت لکھے
ہر بار میں نے دھوپ سے انکار کیا
اور سایہ دار پیڑوں کی قطار میں جڑ پکڑ لی
سورج سوا نیزے پہ آیا
تو پیاسی زبانیں ناف سے آ لگیں
مگر میں نے دریا سے
پانی کی التجا نہ کی
میری جڑیں
میرے لیے زنجیر بن گئیں
میرے دل میں محبت کا بیج لہرانے لگا
بلبل کا نغمہ
میرے لیے سرخوشی بن گیا
میں نے شہر کے کونے میں پڑے
چمکتے ہوئے ذرے کو ہتھیلی پہ رکھا
اور دنیا کا تماشا کرنے لگا!

ماں

ثروت زہرا
(کینیڈا)

ماں تو لڑتی رہی
زنگ آلود کنستروں میں بجتے ہوئے
سماج کے اندھے اصولوں سے
جو ہمیں زیورات کہہ کر پہنائے گئے
بارہا الجھتی رہی
لمبے پلوؤں سے
جو اسکوٹر کے ٹائر میں آ کر اکثر
ہمارا گلا گھونٹا رہا
تو جھلستی رہی
روٹیاں تھاپتے ہوئے چولھے کی تپش سے
جسے نہایت آسانی سے
ہمارا ذائقہ کہہ دیا گیا
تو ہانپتی رہی
کوکھ سے بار بار
جننے والی بیٹیوں کے
آدھی سانس بھرے
پھیپھڑوں سے
آواز ملاتی رہی
میری بیٹی کی اونچی ہنسی میں
جسے بیہودگی کہہ کر
ہمارے ٹیٹوے میں
دفن کر دیا گیا تھا
ماں تو لڑتی رہی
بے انتہا تقسیم ہونے والے
سمجھوتوں کے کینسر جیسے زرخیز خلیوں سے
مگر جان دیتے ہوئے بھی
کتنا جی داری سے لڑتی رہی

○

شب خون

فرح کامران (نیویارک)

رات اندھیری
یادنے اسکی
زور سے دروازہ کھڑکایا
میں نے دل کے حجرے کی
چلمن سرکائی
وہ آنکھوں میں دیپ جلائے
من آنگن میں جھانک رہا تھا

جاؤ مجھ کو سو جانے دو
رات بہت ہے
صبح سویرے کام بہت ہیں
دل کے دروازے پر میں نے قفل لگا کر
آنکھوں کے پردوں کو گرایا
لیکن پھر بھی نیند نہ آئی
اس کی یاد تو خاموشی سے
دل کے تہہ خانے کا زینہ اتر چکی تھی

چُھپن چُھپائی

فیصل عظیم (کینیڈا)

اپنے اک رُخ پہ ہتھیلی کا بنا کر پردہ
وہ مرے پاس سے گزری ہے ابھی کہتے ہوئے
''میں یہاں سے کبھی گزری ہی نہیں
تم کہاں۔۔۔مجھ کو کبھی دیکھا کہاں۔۔۔
میں یہاں ہوں ہی نہیں
تم تو یہاں ہو ہی نہیں''
مجھے آواز کی پہچان نہیں ہو گویا
اس کی نازک سی ہتھیلی پہ گماں تک نہیں ہو
اس کے دلگیر سراپا سے شناسائی نہ ہو!
میں بھی بن جاتا ہوں پھر،
جیسے کہ وہ آئی نہ ہو۔

قطعات

علی شاہد دلکش (بہار)

الہامی کتابیں ہوئیں باطل سبھی لیکن
قرآن تھا ، قرآن ہے ، قرآن رہے گا
حکمت ہے ہدایت بھی،فضیلت کی ہے کثرت
بندوں پہ سدا جاری یہ فیضان رہے گا

مٹا کر ظلمتیں دل کی چلو روشن کریں دل کو
ہٹا کر خار دل سے بغض کا ،گلشن کریں دل کو
شکایت،طنز،غیبت ختم ہو خود دل کے پارے سے
دِکھے اچھائیوں کا عکس وہ درپن کریں دل کو

نگاہوں کو ملانا چاہتا ہوں
میں تھوڑا مسکرانا چاہتا ہوں
بہت دن رہ چکا ہوں میں فلک پر
زمیں پر لوٹ جانا چاہتا ہوں

ہمارے یار کی ابرو ہلال کی صورت
قسم ہے چاند سی صورت کمال کی صورت
وہ کون لوگ ہیں ہنس کر جو رو دیئے پل میں
عجب نہاں ہے خوشی میں ملال کی صورت

شام ڈھلے

ڈاکٹر نزہت شاہ (نیویارک)

میں نے رستہ دیکھا سارا دن تم شام ڈھلے بھی نہ آئے
بڑا بے کل گذرا میرا دن تم شام ڈھلے بھی نہ آئے
بنا لمحہ لمحہ گھنٹوں سا، ہر پہر کہ جیسے سال ہوا
ہوا صدیوں جتنا پورا دن تم شام ڈھلے بھی نہ آئے
کُھلا گجرا اور پھر ٹوٹ گیا میری آنکھ کا کجرا بھیگ گیا
بڑی آس لیئے تھا کیسا دن تم شام ڈھلے بھی نہ آئے
اک دیا جو دل میں روشن تھا وہ راہ میں تیری رکھ آئی
تھا شب سے بڑھ کے تیرہ دن تم شام ڈھلے بھی نہ آئے
وہ گھور گھٹا وہ اُڑی پَون وہ نیل گگن سے برسا نیر
گیا بدلی، ساون، برکھا دن تم شام ڈھلے بھی نہ آئے

پریتی اگیات
(احمدآباد)
مترجم : خان حسنین عاقب
(مہاراشٹر)

بوجھ

ڈوبتی سانسوں کی نگرانی کرتے
سمجھداری کے کوّے
اب سب کی نگاہوں سے بچ کر
زندگی کو قطرہ قطرہ پینے لگے ہیں
وہ ذمہ داریوں کو
اپنی سلامتی کا ذمہ دار ٹھہرا کر بے نیاز ہوجانا چاہتے ہیں
کیونکہ ان کے مضبوط ہاتھوں نے ہی دفن کئے رکھا ہوگا اسے
زمین میں کہیں
چند تصویروں پر ٹھہری ہوئی نگاہیں
کھسیانی بلی سی
شکرگزار ہونے لگتی ہیں
ان قرضوں کی بھی
جن سے نجات پانا ابھی باقی ہے
نہیں بننا اسے عظیم
اسے مریادا کے کھوکھلے حفاظتی غلاف کی آڑ میں
جو اندر ہی اندر چیر دیتا ہے

ذمہ داریاں بھی، خیر!
کوری بزدلی پر آہ بھرتے ہوئے
چند لفظوں کی چاشنی کا
لجلجا لیپ ہی تو ہیں

نہ رہے بھرم کی کوئی علامت باقی
تو ضروری ہے
اسی جنم میں ہر قرض سے نجات پا جانا
پنر جنم، پھر ملیں گے
رشتہ جنم جنم کا، پکا وعدہ
سچا پیار۔۔
یہ سب موضوعات ہیں اصلی کرداروں کی
جھوٹی، مغالطہ آمیز نظموں کے
حقیقت کی زمین پر یہ ٹھگی اور جذباتی کھیل کے علاوہ کچھ بھی
نہیں

سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے
جینا ہوگا اسے پھر بھی
جب تک ہر بوجھ ہلکا نہ ہوجائے
یا پھر اس بوجھ کو ڈھونا بھاری نہ لگے!

○

ٹوٹا ہوا آدمی

ٹوٹا ہوا آدمی
پیار کا مارا ہے
پیار میں ہارا ہے
ڈرتا ہے لکیروں سے
اور چپ چاپ کرتا ہے پیار
ٹوٹا ہوا آدمی
منہ کھول کے ہنستا ہے
لکھتا جیون ہے اور
سو بار وہ مرتا ہے
ٹوٹا ہوا آدمی
سورج کی طرح سانجھ سویرے
ڈوبتا نکلتا ہے
تھما کر آسمان سب کو
دور گہرے دریا میں اترتا ہے
ٹوٹا ہوا آدمی
سپنے ٹوٹ جانے پر بھی
نہیں ہارتا
ٹوٹ کر کرتا ہے پیار
قطرہ قطرہ بکھرتا ہے

○

اک معدوم کہانی

سعید اختر ملک
(جھنگ)

سیمیں کرن مشہور معروف کہنہ مشق افسانہ نگار، ناول نگار اور کالم نگار ہیں۔

سیمیں کرن نے اپنا تازہ ترین ناول ''اک معدوم کہانی'' مجھے کچھ دن پہلے بھیجا۔۔۔میری تساہل پسند طبیعت سے وہ کچھ کچھ واقف بھی ہیں اس لئے تین چار دن قبل میسج کر کے ناول کے بارے میں ابتدائی تاثرات جاننا چاہا۔۔۔ میں ابھی تعریف کرنے کی تمہید باندھ ہی رہا تھا کہ انہوں نے پوچھا کہ کتنا پڑھا ہے اور کب تک پڑھ لوگے۔؟

اب میرے لئے صاف گوئی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ فوراً ہی ذہن میں شرعی قسم کے عذر کا خیال آیا اور عرض کیا۔۔۔کہ دراصل چند دنوں تک لندن جانے کا پروگرام ہے اس لیے سوچ رہا ہوں کہ واپسی پہ آرام سکوں سے سارا پڑھ کے تاثرات بیان کردوں۔

یہ سنتے ہی سیمیں کرن نے مخصوص خلوص محبت بھرے انداز میں دھمکی دے ڈالی کہ لندن جانے سے پہلے ناول کو پورا پڑھنا پڑے گا۔

یہ دھونس خاصی کارگر ثابت ہوئی اور یوں دو چار دنوں میں ناول کی ایک ایک سطر پڑھ لی۔

قارئین کرام۔۔۔میں نہ تو سکہ بند تنقید نگار ہوں۔نہ میرے پاس تنقید نگاری کے مروجہ دو چار قسم کے سانچے گھڑے ہوئے ہیں جن میں فقط نام و مقام بدل کے کام چلایا جاسکتا ہے۔

میری بدقسمتی کہہ لیجئے کہ ادب کو بطور مضمون با قائدہ پڑھا ہوا نہیں ہے اس لئے لکھتے ہوئے بہت ساری رسمی قباحتوں کو نبھانے کا مکلف بھی نہیں ٹھہرتا ہوں۔مجھے یہ بھی تسلیم کہ۔۔۔شعری ونثری اصناف کے بنیادی اور مروجہ اصول و ضوابط اور رموز سے نابلد ہوں اس لیے محترم میرے قریبی ادبی احباب اس کوتاہی کو کھلے دل سے اکثر معاف رکھتے ہیں۔

سیمیں کرن کا یہ ناول ''اک معدوم کہانی'' مروجہ پلاٹ و کردار کی ڈگر سے ہٹ کے ہے۔یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سیمیں کرن کتنی پر اعتماد لکھاری ہے اور جو وہ سوچتی ہے بلا کم کاست اور بے دھڑک لکھ دیتی ہیں۔

مجھے ذاتی طور پہ ''ٹراؤٹ مچھلی'' صرف اس لیے اچھی نہیں لگتی کہ اس کا ذائقہ بہت لذیذ ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ یہ صاف پانی میں رہتی ہے اور اسکی سب سے بڑی خوبی اور سرشت کہ پانی کے بہاؤ کے مخالف تیرتی ہے اور مشکل ترین چیلنج قبول کرتی ہے۔بعین ہی سیمیں کرن نے اس ناول کی ساخت و ہیئت میں بہت سارے نئے تجربے کئے ہیں۔ناول کے بارے میں گزارشات تین عنوانات کے تحت کروں گا۔

پلاٹ

''اک معدوم کہانی'' کا پلاٹ بہت وسیع اور کرہ ارض کے دو خطوں تک پھیلا ہوا ہے یہ زمینی فاصلہ اتنا اہم نہیں جتنا زمانہ قدیم سے دور جدید کے موجودہ حال تک بکھری کڑیاں ملانا آسان نہیں تھا۔سیمیں کرن مشکل پسند ہے۔ اس نے الجھاؤ کو سلجھاؤ میں بدلنے کے لئے بہت محنت اور عرق ریزی سے ڈائنوسار عہد کو کھنگال ڈالا ہے۔انسانی فطرت اور تہذیبی رویئے سے پیدا ہونے والی گہری نفسیاتی پیچیدگی اور انکی عملی حساسیت کے اثرات اصل موضوع ہے۔ ماضی اور حال کے گھن چکر کو اتنی باریک بینی اور کمال مہارت سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری اسے سرسری پڑھ کے آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔۔۔اس ناول میں سوچ کے اتنے زاویے ہیں کہ کسی بھی اچھے شعر کی طرح معانی کی تہہ داری اور پرتیں حیرت زدہ کر دینے والی ہیں۔ناول کا پلاٹ۔۔۔ڈائنوسار کے عہد معدومیت سے شروع ہوتا ہے اور اسکے بعد کے ادوار میں روایات کی جہاں داغ بیل ڈالی جارہی ہوتی ہے وہاں پہ معدومیت کا تسلسل بھی اسی شدت سے جاری رہتا ہے۔بلکہ یوں کہیے کہ ایک جھیل ہے جس میں ایک طرف تازہ پانی کی آمد تو دوسری طرف اسی رفتار سے خروج کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔

پلاٹ کے بادے میں یوں بھی کہا جاسکتا ہوں کہ اس ناول کا کینوس ایک ایسے دائرے پہ محیط ہے جس میں دو مختلف تہذیبوں کے قدیم و جدید رنگ بیک وقت ضم بھی ہونے لگتے ہیں اور بکھرنے کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔

منظر نامہ

ناول کا منظر نامہ بہت متنوع ہے۔ڈرائینگ روم سے نکل کر امریکہ کی ریاستوں کے تاریخی عجائب گھروں سے ہوتا ہوا لائل پور کے گھنٹہ گھر اور اٹھ بازاروں کا منظر اتنا مسحور کن ہے کہ قاری تاریخ کے جھروکوں میں بیٹھ کے خود کو اسی فضا میں کھویا ہوا پاتا ہے۔

کردار

سیمیں کرن کے ناول ''اک معدوم کہانی'' کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں بلاضرورت کرداروں کی بھرمار نہیں۔روحا، ہاشم، کنول، وسیم ،لنڈا کے علاوہ انٹی لنڈا، سیم گپتا، البرٹ، اعنیتا، ایوا، ایما رشید چچا اور آفتاب احمد۔۔۔اپنی اپنی جگہ نگینے کی طرح فٹ ہیں۔ہر کردار اپنی جگہ پہ اپنے ماضی کی روایات سے جڑا ہوا اور اپنے نظریات وخیالات میں راسخ۔۔۔لیکن دوسرے کے نکتہ نظر کو کھلے دل و دماغ کے ساتھ قبول و برداشت کرتا ہوا۔

ناول کے شروع میں روحا اور ہاشم کی باہمی گفتگو اور خیالات و عادات اور رویئے کو علم نفسیات سے دلچسپی رکھنے والے طالبعلم کیس سٹڈی (ریسرچ) کے طور پہ مطالعہ کرسکتا ہے۔میاں بیوی کی باہمی کشمکش اور روحا کے لاشعور میں رچے بسے ماضی کی بازگشت اور عہد قدیم کی بازیافت قاری کو بہت

متجسس رکھتی ہے۔ پھر پہلی ڈائیری اور دوسری ڈایئری میں پاکستان کی سیاسی تاریخی واقعات اور انکے دوررس اثرات کا بھی خوب تجزیہ اور احاطہ کیا گیا ہے۔ پہلی ڈائری اور دوسری ڈائری کے کرداروں سے تیسرا کردار جنم لیتا ہے جو ناول میں کسی حدتک مرکزی کردار بن کے ابھرتا ہے

ناول میں کچھ کردار۔۔۔انکل رشید اور۔۔۔ان سے مافوق الفطرت اور محیرالعقول واقعات اور ان کہی پراسرار باتیں جدید دور کے قاری کو چونکا دینے والی ہیں۔ یہاں پڑھتے ہوئے پتہ نہیں کیوں مجھے اشفاق احمد اور قدرت اللہ شہاب کے کرداروں میں کہیں کہیں مماثلت دکھائی دی۔

ناول کا مختصر ترین خلاصہ

پہلے باب میں۔۔۔روحا کی شادی ہاشم سے ہوتی ہے دونوں امریکہ جاتے ہیں۔۔۔وہاں پہ روحا جو ماضی کے دھندلکوں اور ڈائینوسار عہد میں خود کو کسی بھٹکی ہوئی روح کا حصہ محسوس کرتی ہے وہ لاشعوری طور پہ کچھ مقامات دیکھ کے اس کیفیت میں کھو جاتی ہے ہاشم اسکی اس عادت سے بے چین ضرور ہوتا ہے مگر وہ کھلے دل سے اسکی دلجوئی بھی کرتا رہتا ہے۔

دوسرا باب۔۔۔زیادہ تر دو ڈائیریوں پہ مشتمل ہے۔پہلی ڈائری اور دوسری ڈائری۔۔۔سال و تاریخ کے حساب سے بہت دلچسپ ہے۔ قاری اس مخصوص سال میں رونما ہونے والے ملکی سطح کے واقعات کی جھلک کے ساتھ ساتھ انکے اثرات سے بھی بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔مریم اور وسیم کی لکھی گئی یہ ڈائریاں ندی کے بہتے دو کنارے لگتے ہیں اور قاری شدت سے منتظر ہوتا ہے کہ انکا سنگم کس مقام پہ اور کب ہوگا۔

تیسرا باب لائل پور کے تاریخی مقامات، شخصیات کے بارے بالکل انوکھے انداز سے ذکر کیا گیا ہے۔گھنٹہ گھر اور اس کے اردگرد پھیلے اٹھ بازار۔۔۔ ثقافتی، سماجی اور معاشرتی رویوں کے استعارے بن کر لائل پور کی خوب نمائیدگی کرتے ہیں۔

اسی کے آخر میں۔۔۔ناول کے تین مرکزی کردار۔۔روحا مریم اور وسیم ایک بڑے دائرے میں گھومتے گھومتے تیزی کے ساتھ مرکزی نقطہ کی جانب گردش کرنے لگتے ہیں۔ یہاں ان صفحات کو پڑھتے ہوئے قاری ناقابل یقیں حدتک رونما ہونے والے واقعات سے چونک اٹھتا ہے۔

ناول کے وہ پہلو جس کی کمی مجھے محسوس ہوئی ضروری نہیں کہ ہر قاری اسی کیفیت سے گزرے۔ یہ سطور لکھتے ہوئے مجھے ایک لحظہ بھی سوچنا نہیں پڑ رہا۔۔۔کہ سیمیں کرن سے مروت وادب اور اخلاص بھرا جو تعلق ہے اس میں دراڑ پڑے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ مجھے۔معلوم ہے کہ اسے نہ تو میری تعریف سے فرق پڑے گا نہ میری تنقید سے۔ کیونکہ سیمیں کرن نے یہ ادبی مقام و رتبہ اور قد کاٹھ اپنی بے پناہ محنت اور اللہ کے فضل سے بنایا ہے اس کی ادبی شہرت اور مقام کو ذرہ برابر بھی زک نہیں پہنچے گی۔

ناول پڑھتے ہوئے مجھے کچھ پہلو جو کمزور لگے۔آپ اسے میری کم فہمی اور محدود سوچ بوجھ سمجھ کے آسانی سے صرف نظر ہی کر سکتے ہیں۔ میری دانست میں ناول کے کردار روحا اور ہاشم اتنے جاندار، متحرک اور ہمہ جہت تھے کہ فقط ان کی مدد سے ہی ناول کو آگے بڑھایا جا سکتا تھا۔ مجھے حیرت اس وقت ہوئی جب ہاشم جیسا مضبوط کردار بتدریج ماند پڑتا گیا حتیٰ کہ اخر میں بغیر کسی ٹھوس وجہ کے معدوم کر دیا گیا۔ اسکے مقابل۔۔۔آگے چل کر روحا کی ماں مریم اور وسیم زیادہ ابھرتے چلے گئے۔جس میں بظاہر کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے کہ مصنفہ جس طرح چاہے کرداروں سے کام لے لیکن یہاں ہاشم جیسے کردار کا غائب ہو جانا مجھے کھٹکتا رہا ہے۔

دوسرا پہلو جسے کسی اور زاویے سے بھی پیش کیا جا سکتا تھا۔وہ ناول ''اک معدوم کہانی'' میں Oedpusi کی طرز پہ ٹریجیڈی کا پیش کیا جانا جس میں انیتا۔۔۔اور وسیم کا غیر فطری تعلق دکھایا گیا جس کے بارے میں یہ گماں بھی پیدا کیا گیا کہ وہ بہن بھائی بھی ہو سکتے ہیں۔اور آخری بات جو میرے جیسے قاری کو ہضم نہیں ہو پا رہی وہ یہ کہ مصنفہ کو کیا جلدی پڑ گئی تھی کہ ناول کے خوبصورت کینوس پہ بکھرے رنگوں کو اک دم سے سمیٹ دیا جائے۔آخری صفحات میں بہت تیزی کے ساتھ واقعات کا بہاؤ، قاری کا سانس پھولنے لگتا ہے۔البتہ قاری کی بڑھتی دلچسپی کی وجہ سے اسے آپ خوبی بھی متصور کر سکتے ہیں۔

ناول کی خوبیاں

سیمیں کرن کے اس ناول۔۔۔''اک معدوم کہانی'' میں انداز بیاں کے ساتھ ساتھ خوبصورت مرصع نثر خاصے کی چیز ہے۔ میرا خیال ہے اس عہد کے بہت کم لوگ اس اعلیٰ پایہ کی نثر لکھنے پہ عبور رکھتے ہیں۔

دوسری خوبی کہ منظر نگاری کی بے جا طوالت کا شکار ہوئے بغیر سیمیں کرن نے کرداروں سے نظریات کو خوبصورتی سے مکالمات، خود کلامی اور خیال آفرینی سے صفحات کو سجایا ہے۔۔یہ اس ناول کا سب سے مضبوط پہلو ہے۔تیسری خوبی کہ ناول غیر ضروری کرداروں کی بھرمار سے پاک ہے۔ چند ایک گنے چنے کردار جو اپنا رول بہت مختلف مگر جامعیت کے ساتھ نبھاتے ہیں۔چوتھی خوبی۔۔۔تاریخی واقعات اور معلومات کا بیش بہا خزانہ اس ناول میں سمو دیا گیا ہے۔پانچویں خوبی۔۔۔نفسیاتی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے بہترین کیس سٹڈی ہے۔چھٹی خوبی۔۔۔ڈائینوسار کو جہان علامت کے طور پہ سیمیں کرن نے اسے برتا ہے امریکہ کے تناظر میں وہاں پہ اس کا حال میں بھی تسلسل بہت معنی خیز ہے یہ مصنفہ کی کمال مہارت اور مضبوط گرفت کا واضح ثبوت ہے۔ساتویں خوبی۔۔۔ عالمی استعماری رویوں کی نشاندہی بغیر کسی لگی لپٹی کے کر دی گئی ہے۔آٹھویں خوبی۔۔۔مصنفہ نے پوری تحقیق اور ذمہ داری سے واقعات کی تاریخی حیثیت کو اجاگر کرتے ہوئے جو نتائج مرتب کئے ہیں وہ بالکل قرینِ قیاس لگتے ہیں۔نویں خوبی۔۔۔مصنفہ نے فکشن کو اس کمال خوبصورتی و مہارت سے لکھا ہے کہ کچھ بھی غیر حقیقی نہیں لگتا۔دسویں خوبی۔۔۔سیمیں کرن کی ناول میں پلاٹ پہ آخر تک گرفت مضبوط رہتی ہے۔کہیں جھول نظر نہیں آتا۔

ایک صدی کا قصّہ

چندولال شاہ

دیپک کنول (ممبئی)

فلم ''چلتی کا نام گاڑی'' کا ایک مشہور گانا تھا۔ہم تھے وہ تھی اور سماں رنگین سمجھ گئے نا۔جاتے تھے جاپان پہنچ گئے چین سمجھ گئے نا۔آج کے کردار کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔گجرات کے جام نگر کا ایک نوجوان سن 1920 میں کپاس کے بیوپار کے لئے بمبئی چلا آیا پر یہاں وہ کپاس کا دھندہ کرنے کی بجائے فلم نگری میں نہ چاہ کر بھی پہنچ گیا۔اس نوجوان کا نام چندولال شاہ تھا۔

رنجیت موی ٹون کے بانی چندولال شاہ کو کون نہیں جانتا۔رنجیت اسٹوڈیو جو آج بھی ممبئی کے دادر علاقے میں اپنی خاموش زبان سے اپنے تاریخ بیان کر رہا ہے چندولال شاہ کی شب و روز محنت کا ثمر ہے۔چندولال شاہ ایک برگزیدہ شخصیت کا نام تھا جس نے سرخیل بن کر فلسازوں کی رہنمائی کی۔چندو لال شاہ 13 اپریل 1898 کو گجرات کے شہر جام نگر میں پیدا ہوا۔شروع کی پڑھائی اُسنے اپنے آبائی شہر میں کی۔اُسکے بعد وہ بمبئی چلا آیا اور سینڈنم کالج بمبئی سے اُس نے گریجویشن کیا۔1924 میں اُسے بمبئی کے اسٹاک ایکس چینج میں نوکری ملی۔قسمت کا کھیل دیکھئے کی اُسی سال لکشمی فلم کمپنی نے اُسے اپنی ایک فلم کی ہدایت دینے کے لئے بلایا۔ہوا یوں کی لکشمی فلم کمپنی نے ''وملا'' نام کی ایک فلم شروع کی تھی جسکی ہدایت کاری کا ذمہ ہدایت کار منی لال جوشی کو دیا گیا تھا۔بدقسمتی سے وہ بیمار ہو گیا۔فلم کو ہر حال میں پورا کرنا تھا اسلئے یہ کام چندولال شاہ کو سونپا گیا۔اس فلم کے مرکزی کردار میں راجہ سنڈیو اور پتلی تھے۔اُسنے یہ فلم پوری کی اور 1925 میں یہ فلم ریلیز ہوگئی۔یادرہے کہ یہ خاموش فلموں کا دور تھا۔فلساز اُسکے کام سے اتنے خوش ہوئے کہ اُسے مزید دو فلمیں ڈائرکٹ کرنے کا موقع ملا۔یہ فلمیں تھیں سن 1925 کی ''پانچ ڈانڈا'' اور 1926 کی ''مادھو کام کنڈالا''۔یہ دونوں فلمیں پوری کرنے کے بعد اُسنے لکشمی فلم کمپنی کو الوداع کہا اور پھر سے وہ اپنی اسٹاک ایکس چینج کی نوکری پر چلا گیا۔

چندولال شاہ جتنا اس فلم نگری سے دور بھاگ رہا تھا وہ اُسکے پیچھے اُسی رفتار سے پڑی تھی۔ابھی وہ اسٹال ایکس چینج میں اپنے پاؤں جمانے بھی نہ پایا تھا کہ اُسکا سولسیٹر دوست امر چند شروف جو کہ لکشمی فلم کمپنی سے منسلک تھا اُسے کوہ نور فلم کمپنی میں لے آیا جہاں اُسکی پہلی ملاقات گوہر سے ہوئی جو بعد میں اُسکی زندگی کا جزو لانفیک بن کر رہ گئی۔کوہ نور فلمز کے لئے اُسنے بطور ہدایت کار جو پہلی فلم بنائی، اُس فلم کا نام ''ٹائپسٹ گرل'' تھا۔اس فلم کے مکھیہ اداکاروں میں سلوچنا اور گوہر تھے۔یہ فلم سترہ دن میں بن کر تیار ہوگئی۔اس فلم نے بہت اچھا بزنس کیا۔

اس فلم کی کامیابی سے خوش ہو کر کوہ نور فلم کمپنی نے اُسے پانچ فلمیں ڈائرکٹ کرنے کا موقع عطا کیا۔دلچسپ بات یہ تھی کہ ان سبھی فلموں میں اُسکی جان جہاں گوہر کام کر رہی تھی۔ان پانچ فلموں میں سب سے زیادہ کامیاب فلم ''گن سندری'' تھی جو 1927 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم میں گوہر نے ایک اُجڈ گنوار بیوی کا کردار نبھایا تھا جس کا شوہر کسی دوسری عورت کے موہ جال میں پھنستا ہے۔گوہر اپنے آپ کو یکسر بدل دیتی ہے اور اپنے شوہر کو واپس پا لیتی ہے۔اس خاموش فلم نے ریکارڑ توڑ بزنس کیا۔اسی فلم کو چندولال شاہ نے تین مرتبہ بنالیا۔دو مرتبہ اُنہوں نے خود اسکی ڈائرکشن کی۔اس سبجکٹ کو کئی سارے فلسازوں نے تھوڑی بہت ردوبدل کے بعد جب بھی فلم میں ڈھالا، فلم کامیاب رہی۔حال ہی میں اسی موضوع پر راکیش روشن نے فلم ''خون بھری مانگ'' بنائی جس نے باکس آفس پر دھوم مچائی۔

کوہ نور فلمز میں شاہ کی مقبولیت اور گوہر سے اُسکی قربت دیکھ کر کئی سارے ورکروں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔وہ شاہ اور گوہر سے خار کھانے لگے۔شاہ نے محسوس کیا کہ کوہ نور میں اب اُسکی قدر و منزلت میں کمی ہونے لگی ہے اسلئے اُس نے کوہ نور فلمز کو خیر باد کہا اور وہ جگدیش فلم کارپوریشن میں چلا گیا جہاں شاہ کو چار فلموں کی آفر ملی۔اُسنے یہ فلمیں نہ صرف لکھیں بلکہ انہیں خود ہی ڈائرکٹ بھی کیا، ان سبھی فلموں کی ہیروئن گوہر تھی۔1929 میں اُسنے جگدیش فلمز کو بھی الوداع کہا اور اپنی ذاتی فلم کمپنی کھولنے کا فیصلہ کیا۔

اسی سال خوش قسمتی سے اُسے ایک فائنانسر ملا جس کا نام وٹھل داس ٹھاکر داس تھا۔وٹھل بھائی شاہ کے اسٹوڈیو پر سرمایہ لگانے کے لئے تیار ہوگیا۔اس کے علاوہ جام نگر کے راجہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھی اسٹوڈیو کی تعمیر میں چندولال شاہ کی مالی مدد کی۔مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اس مدد کے عوض چندولال نے بطور خراج تحسین اپنے اسٹوڈیو کا نام رنجیت فلم کمپنی رکھ دیا اور اس طرح گوہر کی ساجھے داری میں رنجیت فلم کمپنی کی نیو پڑ گئی۔1929 سے لیکر 1932 کے تین سال کے مختصر عرصے میں چندولال شاہ نے اُنتالیس خاموش فلمیں بنائیں جو کہ ایک ریکارڑ تھا۔اسی دوران فلمیں اپنے ارتقائی مدارج میں داخل ہو چکی تھیں۔متکلم فلموں کا دور شروع ہوا تھا۔چندولال شاہ نے اپنی فلم کمپنی کا نام رنجیت فلم کمپنی سے رنجیت موی ٹون کر دیا۔شاہ نے چار ساؤنڈ پروف اسٹیج تیار کروائے اور کمپنی کے قرارداد میں یہ طے پایا گیا کہ ہر سال کم سے کم چھ فلمیں بنائیں جائیں گی۔فلمیں بنانے کا یہ سلسلہ ایک دہائی تک بنا کسی رکاوٹ کے چلتا رہا۔اسی بیچ رنجیت موی ٹون نے سات سو کے قریب تیکنیشنوں کو باقاعدہ اچھی اچھی تنخواہوں پر ملازم رکھا۔اُن دنوں اس کی مثال ایسے دی جاتی تھی کہ آسمان میں جتنے ستارے ہیں اُتنے ہی رنجیت موی ٹون میں ہیں۔ان ستاروں میں پرتھوی راج کپور، کندن لال سہگل، مادھوری، سلوچنا، موتی لال، کیدار شرما، چارلی، دکشت، گوری، خورشید، اُستاد جھنڈے خان (جن کی شاگردی میں نوشاد علی نے کام کیا)، بلوسی رانی، نانو بھائی وکیل، جینت ڈیسائی، ڈی این مدھوک، ترلوک کپور، کھیم چند پرکاش وغیرہ شامل تھے۔

اس کمپنی نے ہر طرح کی فلمیں بنائیں۔صرف ہندی میں نہیں بلکہ پنجابی اور گجراتی میں بھی فلمیں بنائی گئیں۔

چندو لال شاہ نے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کیا جس کے تحت بہت کم بجٹ میں فلمیں بنانا مقصود تھا۔ اولیت سماجی فلموں کو دی گئی۔ اُسکے بعد اصلاحی فلمیں اور سب سے آخیر میں اسٹنٹ فلمیں ۔رنجیت موی ٹون کو اسٹنٹ فلمیں بنانے میں کمال کی مہارت حاصل تھی۔ یہ فلمیں مالی اعتبار سے محفوظ سمجھی جاتی تھیں کیونکہ ان کے دیکھنے والوں کا اپنا ایک حلقہ تھا۔

اسی دوران دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ فلمیں بھی جنگی اثرات سے متاثر ہونے لگیں۔لوگوں میں دیش بھگتی کا جذبہ اُمڈنے لگا۔ چندو لال شاہ بہت بڑا نباض تھا۔ اُسنے وقت کی نبض پہچان لی تھی اسلئے اُسنے کئی ایسے موضوع چنے جو اُنہیں وقت کی نزاکت کو دیکھ کر بڑے موزوں لگے۔نروپا رائے دھارمک فلموں میں نام کمانے لگی تھی۔ چندو لال شاہ نے موتی لال ، کندن لال سہگل اور نروپا رائے کو لے کر کئی کامیاب فلمیں بنائیں۔یاد رہے کہ کے۔ایل۔سہگل بھی رنجیت موی ٹون کے تنخواہ دار تھے۔سن 1932 میں اُنکی پہلی سماجی فلم ''ستی ساوتری'' ریلیز ہوئی۔1935 میں ''بیرسٹر کی بیوی'' 1940 میں ''اچھوت'' 1943 میں ''تان سین'' اور ''مورتی''۔''تان سین'' وہ فلم تھی جس کے گانے کیدار شرما نے لکھے تھے اور انہیں سنگیت سے آراستہ کھیم چند پرکاش نے کیا تھا۔اس کے گانوں نے اُس زمانے میں کسقدر دھوم مچائی تھی، بیان کرنا مشکل ہے۔

1947 میں ہندوستان برٹش راج کے تسلط سے آزاد ہوا۔اس آزادی کے ساتھ بٹوارے کا المیہ گزرا جس نے انسانیت کو شرمسار کر کے رکھ دیا۔بہت سارے ٹیکنیشن اور کلاکار ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ سب کچھ بکھر گیا۔ایک موتی کی لڑی کی طرح۔کوئی موتی کہیں گرا کوئی کہیں۔بقول مرحوم قمر جلال آبادی کے اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے۔کوئی یہاں گرا،کوئی وہاں گرا۔کئی فلم کمپنیاں بٹوارے کی مار جھیل نہ پائیں۔کئی ایک ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔ملکہ ترنم نور جہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان کو خیر باد کہہ کے پاکستان چلی گئی تھیں ۔ بہت سارے مسلم اداکار وطن چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوئے اور اُنہوں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔اُن میں ایک دلیپ کمار تھے۔ دلیپ کمار چندو لال شاہ کو سیٹھ جی کے نام سے بلاتے تھے۔سیٹھ جی کا فلم انڈسٹری میں کافی دبدبہ تھا۔لوگ اُن کا نیاز پانے کے لئے ترستے تھے۔

چندو لال شاہ نے ایک انگریزی فلم دیکھی تھی جسمیں ایک آدمی ایک راہبہ کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اُسے اُس دنیا سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ چندو لال شاہ کو یہ فلم اتنی بھا گئی کہ اُسنے اسے ہندی میں بنانے کا فیصلہ کیا۔سیٹھ چندو لال شاہ نے اُسوقت کے دو کامیاب ڈائرکٹرس متن بوس اور مہیش کول کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور اُنہیں اس کہانی کا خاکہ سنایا اور اُن سے کہا کہ وہ اس کہانی پر اُسکے لئے ایک ایک فلم بنائیں۔وہ دونوں یہ کہانی سن کر ہنس پڑے اور چندو لال شاہ سے تہدیدی انداز میں بولے کہ اگر خدا بھی چاہے گا تو وہ بھی اس کہانی سے ایک کامیاب فلم نہیں بنا سکتا۔ یہ کہہ کر وہ دونوں چل دئے۔کیدار شرما جو اُن دنوں چندو لال شاہ کے کسی اور پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا، باہر کھڑا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔اُسے بڑا رنج وافسوس ہوا۔رنج اس بات کا تھا کہ ان دونوں نے سیٹھ چندو لال کی پیشکش ٹھکرا دی تھی اور افسوس اس بات کا تھا کہ چندو لال شاہ نے اُس سے اس کہانی کا کبھی تزکرہ نہ کیا۔خیر وہ لوگ جب وہاں سے چلے گئے تو چندو لال شاہ کا نوکر اُن کے پسندیدہ پان لے کر اندر چلا گیا۔کیدار شرما نے سوچا کہ یہی موقع ہے جب سیٹھ جی سے ملنا چاہے۔وہ اندر گھسا اور ایک پان کی گلوری اُٹھا کر چندو لال سے بولا۔''سیٹھ جی کیا میں اس کہانی پر کام کرنے کا بیڑہ اُٹھا لوں'' چندو لال شاہ نے کیدار شرما کے سراپا کا ایک طائرانہ جائزہ لیا اور پھر بڑی ہی رقت بھری آواز میں بولا۔''ہاں مگر ایک بات میری غور سے سن لو۔میرے گھر میں صرف ایک مہینے کا راشن بچا ہے۔اگر یہ فلم فلاپ ہوگئی تو میں کہیں کا نہیں رہ جاؤں گا۔میرا یہ اسٹوڈیو رنجیت موی ٹون بک جائے گا اور میں سڑک پر آجاؤں گا۔'' کیدار شرما نے چندو لال شاہ کا یہ چیلنج قبول کیا۔

کیدار شرما اس فلم میں دلیپ کمار اور نرگس کو کاسٹ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔سیٹھ چندو لال شاہ کی فلم میں کام کرنا اعزاز کی بات تصور کی جاتی تھی۔ چندو لال شاہ کو انڈسٹری والے سردار چندو لال شاہ کے نام سے جانتے تھے۔یہ لقب اُسے اُس وقت کے جانے مانے جرنلسٹ بابوراؤ پٹیل نے دیا تھا ۔وہ رنجیت کا بانی ہی نہیں بلکہ انڈسٹری کا سرخیل بھی تھا اسلئے کوئی اُسکا حکم ٹال نہیں سکتا تھا۔کیدار شرما اس فلم میں دلیپ صاحب کو لینا چاہتے تھے۔بہت دنوں سے اُس کے دل میں یہ تمنا انگڑائیاں لے رہی تھی کہ کاش وہ دلیپ کمار کے ساتھ کام کر پاتے۔اب جب مالک نے اُسے ایک سنہرا موقع بخشا تھا اُس نے چندو لال شاہ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔سردار چندو لال شاہ کا ایسا غلغلہ تھا کہ کوئی بھی کلاکار اُن کے حکم کو ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔کہا جاتا ہے کہ جب اُس نے دلیپ صاحب سے اپنی فلم میں کام کرنے کے لئے کہا تو دلیپ صاحب نے سیٹھ جی کا حکم سر آنکھوں پر لیا پر شرط یہ رکھی کہ وہ اس فلم کا کوئی معاوضہ نہیں لیں گے۔شاید وہ سیٹھ چندو لال شاہ کی مالی حالت سے واقف ہو چکے تھے۔کیدار شرما کے من کی مراد پوری ہوئی۔فلم کیلئے چندو لال شاہ نے ایک مہینے کا شیڈول طے کیا۔کمال کی بات یہ ہے کہ یہ فلم اپنے طے شدہ شیڈول سے بھی ایک دن کم میں بن کر تیار ہوئی یعنی 29 دن میں۔اتنی بڑی اسٹار کاسٹ کی فلم بن کر تیار ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ کیدار شرما کی لگن کا ہی کمال تھا کہ وہ اتنی سیریس فلم کو اتنے کم وقت میں مکمل کرنے میں کامیاب ہوا۔یہ فلم 1950 میں ریلیز ہوئی اور اسکی خوب سراہنا کی گئی نرگس نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ کہہ کر سب کو چونکا دیا تھا کہ ساری دنیا کے لئے ''مدر انڈیا'' اُنکی بہترین اور لاجواب فلم تصور کی جاتی ہے مگر وہ ''جوگن'' کو اپنی سب سے بہترین اور لاجواب فلم مانتی ہے۔وجہ یہ ہے کہ جسطرح کیدار شرما نے اُس کی

اداکارانہ صلاحیتوں کو اُجاگر کیا، محبوب خان اُس حد تک کامیاب نہ ہوا۔ ''جوگن'' نرگس کے فلمی کیریئر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

دلیپ صاحب نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ فلم کامیاب رہی پھر بھی اُنہوں نے ایک روپیہ سیٹھ چندولال شاہ سے نہ لیا۔ سردار چندولال شاہ بھی شاہانہ طبعیت رکھتا تھا۔ کہتے ہیں کہ عید کا تیوہار آنے والا تھا تو سردار چندولال شاہ نے دلیپ صاحب سے کہا کہ کیا وہ عید کے موقع پر اُسے سوئیاں کھلا رہا ہے کہ نہیں۔ دلیپ صاحب نے سیٹھ چندولال شاہ کے لئے سوئیاں تیار کروائیں اور انہیں ڈبے میں بھر کر اُنکے دفتر میں پہنچ گئے۔ سیٹھ جی سیوئیاں پا کر نہال ہوگئے اور دلیپ صاحب کو گلے سے لگایا۔ جب وہ جانے لگے تو چندولال شاہ نے ایک لفافہ جیب سے نکالا اور دلیپ صاحب کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہاری عیدی ہے'' دلیپ صاحب بہت دیر تک وہ لفافہ لینے سے انکار کرتے رہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اُس لفافے میں ہے کیا۔ چندولال شاہ نے ایک بزرگ کی طرح ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ تم بڑوں کی دی ہوئی عیدی ٹھکرا دو گے۔ دلیپ صاحب کو چار و نا چار وہ لفافہ لینا پڑا۔ جب وہ گھر پہنچے تو اُنہوں نے وہ لفافہ کھول کر دیکھا۔ اُسمیں ایک چیک تھا۔ وہ بھی پچیس ہزار کا۔ اُس زمانے میں ایک سپر اسٹار کا معاوضہ بیس پچیس ہزار سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔ وہ چیک دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ چندولال شاہ نے آخر اُسکا معاوضہ اُسے بڑی چالاکی سے ادا کیا ہی تھا۔ کہتے ہیں کہ دلیپ صاحب نے وہ چیک بنک میں ڈالا ہی نہیں بلکہ اسے اپنے پاس ایک امانت کے طور پر رکھا۔ ایسے تھے اُس دور کے فلمساز اور اداکار۔

''جوگن'' کی کامیابی سے چندولال شاہ کے مالی حالات سدھر گئے۔ وہ جس مالی بحران سے گزر رہا تھا وہ اُس سے باہر نکل آیا تھا۔ اس برے وقت میں اُسکی جان بہار گوہر جان اُسکے پیچھے چٹان کی طرح کھڑی رہی۔ ''جوگن'' کی کامیابی سے سرشار ہو کر چندولال شاہ نے ایک بار پھر ہدایت کاری کی کمان سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔ پچھلے تیرہ سال سے وہ ہدایت کاری سے دور رہا تھا۔ بطور ہدایت کار اُسکی آخری فلم 1940 کی اُچھوت تھی جو گوہر جان کی بھی بطور اداکارہ آخری فلم تھی۔ ہدایت کاری سے تیرہ سال کا بن باس لینے کے بعد اُسنے ایک بار پھر ہدایت کاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس بار وہ اچھی اسٹار کاسٹ کے ساتھ میدان میں اُتر جانا چاہتا تھا۔ اُسنے راج کپور اور نرگس کو اپنی فلم کے لئے سائن کیا۔ فلم کا نام ''پاپی'' رکھا گیا۔ اُن کے علاوہ دلاری اور جگدیپ کو بھی اس فلم میں شامل کیا گیا۔ اس فلم کے لئے موسیقار ایس مہندر کو سائن کیا گیا۔ فلم میں راج کپور کا ڈبل رول تھا۔ یہ وہ دور تھا جب نرگس اور راج کپور کا پیار سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ اس جوڑی کو فلمی شائقین بیحد پسند کرتے تھے۔ فلم ٹھیک ٹھاک رہی۔

اس فلم کے بعد چندولال شاہ نے تین اور فلمیں بنائیں جن میں ایک ''اوٹ پٹانگ'' تھی۔ اس فلم کے کلاکار تھے آغا اور اوشا کرن۔ یہ فلم 1955 میں ریلیز ہوئی۔ یہ فلم کوئی کمال نہ کر سکی۔ اس کے بعد چندولال شاہ نے دوسری فلم ''زمین کے تارے'' بنائی۔ اس فلم کے اداکار تھے موتی لال، آغا، اچلا سچدیو، ڈیزی ایرانی انور حسین، ممتاز اور بنی ایرانی۔ اس فلم کا موسیقار ایس۔ مہندر تھا۔ یہ فلم 1960 میں ریلیز ہوئی۔ یہ فلم بھی کچھ خاص نہ چلی۔ آخری اور تیسری فلم ''اکیلی مت جیئو'' تھی۔ یہ فلم 1963 میں ریلیز ہوئی۔

سن 1965 میں چندولال شاہ نے ایک اور فلم کا اعلان کیا جس کا نام ''بہروپیا'' تھا۔ اس فلم کے مرکزی کرداروں کے لئے راج کپور اور وجینتی مالا کو سائن کیا گیا اور موسیقی کے لئے شنکر جے کشن کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ایک گانا بھی ریکارڈ کیا گیا تھا جو راج کپور اور وجینتی مالا پر فلمایا گیا تھا۔ بعد میں نہ جانے کن وجوہات کے بنا پر اس فلم کو رد کیا گیا۔

چندولال شاہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جب اپنے عروج پر تھا تو کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ فلم ''انارکلی'' کے ریلیز کے بعد موسیقار نوشاد علی نے لتا منگیشکر کے گانوں کا ٹیپ چندولال شاہ کو سننے کے لئے بھیجا دیا۔ جب اُسنے گانا ''محبت میں ایسے قدم لڑکھڑائے، زمانہ یہ سمجھا کہ ہم پی کے آئے'' سنا تو وہ یہ گانا سن کر اسقدر برہم ہوا کہ اُسنے بھرے اسٹاف کے سامنے لتا منگیشکر کی تعریف یوں کی کہ یہ گانا لگتا ہے کسی گٹھیا طوائف نے گایا ہے۔ اتفاق سے اُس وقت کے جانے مانے موسیقار کھیم چندر پرکاش کمرے میں موجود تھا۔ اس طرح کے جملے سن کر اُسے بڑی گہری چوٹ پہنچی۔ وہ چندولال شاہ سے ایسے بیہودہ ریمارک سن کر اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ اُس نے برملا کہہ دیا۔ ''سیٹھ جی آج آپ کو جو آواز طوائفوں جیسی لگتی ہے، لکھ کر رکھئے یہی آواز ایک دن پوری دنیا میں گونجے گی اور لوگ اس آواز کو سن کر جھوم اُٹھیں گے۔'' چندولال شاہ کو کھیم چند پرکاش کی یہ گستاخی پسند نہ آئی۔ اُسنے اُسے اپنی اگلی فلم سے نکال دیا۔ کھیم چند پرکاش نے اپنی پیشن گوئی کو بہت جلد سچ ثابت کر کے دکھایا، جب اُسے فلم ''محل'' کی موسیقی دینے کا موقع نصیب ہوا۔ لتا راتوں رات اسٹار بن چکی تھی۔ پھر ایک دور ایسا بھی آیا جب چندولال شاہ کو لتا سے معافی مانگنی پڑی۔

چندولال شاہ ایک قابل ایڈمنسٹر تھا، البتہ وہ ایک جوہر شناس فلم ساز نہ تھا۔ اُسنے فلم انڈسٹری کو کوئی جوہر کھوج کے نہیں دیا۔ اس معاملے میں دیویکا بوس اور ششدھر مکھر جی کی تعریف کرنی ہوگی جنہوں نے فلم انڈسٹری کو کچھ نایاب ہیرے کھوج کے دئے۔ چندولال شاہ حالانکہ شادی شدہ تھا پھر بھی اُس نے گوہر کو رکھیل بنا کر رکھا۔ وہ اُسکے پیار میں اسقدر پاگل ہو گیا کہ اُسنے اپنی ساری جائیداد میں اُسے شریک بنا لیا۔ یہاں پر میں گوہر جان کے بارے میں کچھ اہم تفصیلات بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ گوہر جان 26 جون 1873 کو یو۔پی کے ایک قصبے اعظم گڑھ میں پیدا ہوئی تھی۔ اُسکا اصلی نام انجیلنا یو وارڈ تھا۔ اُسکا امریکن نژاد باپ ولیم رابرٹ یو وارڈ ابرف کی ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اُسنے 1872 میں وکٹوریہ ہیمنگس نامی ایک انگریز خاتون سے شادی کی جس کا جنم ہندوستان میں ہوا تھا۔ بچپن میں اُسنے رقص اور سنگیت کی تعلیم حاصل کی

تھی۔1879 میں میاں بیوی کے درمیان اسقدر اختلافات بڑھے کہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ماں بیٹی کسمپرسی کی حالت میں جینے لگے۔ایسا بھی وقت آیا جب وہ دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔اس مشکل دور میں خورشید نام کا ایک آدمی ان کی مدد کے لئے آگے آیا اور وہ اُنہیں 1881 میں بنارس لے کر چلا گیا۔بعد میں وکٹوریہ نے اسلام قبول کرلیا اور اپنا نام ملکہ جان اور بیٹی کا نام گوہر جان ماماجی رکھ دیا۔خورشید نے ملکہ جان کو پیشہ ورانہ طور پر گانا گانے کی تحریک و ترغیب دی۔وہ ہر قدم پر اُسکی حوصلہ افزائی کرتا رہا۔دیکھتے ہی دیکھتے ملکہ جان محفلوں کی شان بننے لگی۔اُسکے رقص اور گانے کے لوگ دیوانے ہونے لگے۔وہ بڑی ملکہ جان کے نام سے مشہور ہوگئی۔

1883 میں ملکہ جان کلکتہ منتقل ہوگئی۔اُسکی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی اسلئے جب وہ کلکتہ پہنچی تو نواب واجد علی شاہ نے اُسے اپنی محفل میں شامل کر لیا۔ملکہ جان کے شاہی دربار میں رسائی پانے کے بعد پو بارہ ہونے لگے۔اُسنے کلکتہ میں چالیس ہزار روپے کے عوض ایک شاندار کوٹھی خرید لی جہاں پر گوہر جان کو سنگیت کی تعلیم دی جانے لگی۔اُسنے 1887 میں دھربھنگہ کے راج دربار میں پہلی بار اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔اُسکے بعد اُسنے پلٹ کے نہیں دیکھا۔وہ کامیابی کی سیڑھیاں ایک کے بعد ایک طے کرتی چلی گئی۔

پھر قسمت اُسے بمبئی لے آئی جہاں اُسکی ملاقات چندولال شاہ سے ہوئی۔چندولال شاہ پہلی ہی نظر میں اُسے دل دے بیٹھا اور پھر وہ چندولال شاہ کی زندگی کا ایک ناقابل تنسیخ حصہ بن کر رہ گئی۔چندولال شاہ ریس کھیلنے کا بیحد شوقین تھا۔اُسکے دو چہیتے گھوڑے تھے بالم اور چکوری۔وہ کبھی نہیں ہارتے تھے۔چندو لال شاہ کی خوداعتمادی نے اُسے اس قدر بے خوف اور بے فکر بنا دیا تھا کہ وہ بڑے بڑے داؤ اس یقین کے ساتھ کھیلتا تھا کہ جیت اُسی کی ہوگی۔وہ اسٹاک ایکس چینج میں بھی سرمایہ لگاتا تھا۔مسلسل مالی زیاں کے باوجود وہ اس علت سے چھٹکارہ پانے کیلئے تیار نہ تھا۔وہ فاضل اوقات میں فلم انڈسٹری کی بقاو بہبود کے لئے بھی پوری سرگرمی سے کام کرتا رہتا تھا۔وہ کئی اسیشنوں کا قائد بھی تھا اور رہنما بھی۔یہ چندولال شاہ ہی ہے جس نے فلم انڈسٹری کی سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی منانے کی روایت قائم کی۔وہ فلم فیڈریشن آف انڈیا کا پہلا صدر تھا جسکی تشکیل 1951 میں ہوئی۔1952 میں اُسی کی رہنمائی میں ہندوستانی فلم سازوں کا ایک وفد ھالی وڈ کے دورے پر گیا۔

گوہر جان پیشے سے طوائف سہی مگر اُسکی رگوں میں طوایفوں کا خون نہیں دوڑتا تھا۔وہ چاہتی تو چندولال شاہ کی چندھیا سے ایک ایک بال نوچ لیتی۔ ایسا کرنا اُسکے لئے بڑا آسان تھا کیونکہ چندولال شاہ اُسکے زلف گرہ گیر کا ایسا اسیر ہو چکا تھا کہ وہ اُسکی خاطر کچھ بھی کرسکتا تھا مگر اُس نے ایسا نہ کیا۔جب چندولال شاہ نے ایک دن میں ایک کروڑ پچیس لاکھ کپاس کے کاروبار میں کھودئے۔وہ ایک جھٹکے میں عرش سے فرش پر آگئے۔یہ اتنا بڑا مالی زیاں تھا کہ وہ اُس کے بعد اُٹھ نہیں پایا۔یہ سن 1944 کا واقعہ ہے۔اس واقعے کے ساتھ ہی وہ سارے لوگ اُس سے منہ پھیر کے چلے گئے جن کو چندولال شاہ نے بنایا تھا۔بس ایک گوہر تھی۔ وہ نہ صرف زندگی کے ہر موڑ پر اُسکے ساتھ رہی تب بھی جب اُسکا بال بال قرض میں ڈوب گیا۔اپنی ساکھ بنائے رکھنے کے لئے اور اسٹوڈیو کو چلانے کے لئے چندولال شاہ نے رنجیت اسٹوڈیو کے ساتھ ساتھ گوہر جان کا کئی منزلہ بنگلہ ایشین انشورنس کمپنی (آج کی لائف انشورنس کمپنی) کے پاس گروی رکھا۔اس کے بعد کئی فلمیں بنائی گئیں مگر یہ فلمیں رنجیت کی خوشحالی لے کر نہیں آئیں۔اسٹوڈیو کے اخراجات پورے کرنے کے لئے سات تکنیشنوں نے جو کہ رنجیت میں ملازم تھے مل کر رنجیت اسٹوڈیو کے کئی فلور دوسرے فلمسازوں کی شوٹنگ کے لئے تیار کئے ۔اس آمدنی سے رنجیت کے خرچے پورے کئے جانے لگے۔

چندولال شاہ رنجیت اسٹوڈیو کو انشورنس کمپنی سے چھڑا نہ سکا۔ایک دن اُنہوں نے یہ ساری جائیداد اپنے قبضے میں لے لی۔رنجیت اسٹوڑیو اُسکے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔پہلے سبھی ساتھی ساتھ چھوڑ کے چلے گئے تھے۔اب اسٹوڈیو نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔بس ایک گوہر جان تھی جس نے اپنے بالم کا ساتھ نہ چھوڑا۔وہ چٹان کی طرح اُسکے پیچھے کھڑی رہی۔چندولال شاہ کی مالی حالت اس حد تک ابتر ہو چکی تھی کہ اُسے آخری ایام میں بسوں میں سفر کرنا پڑا۔

''اچھوت'' گوہر جان کی آخری فلم تھی جو 1940 میں ریلیز ہوئی۔ اس کے بعد اُس نے اداکاری ترک کی اور اسٹوڈیو کی دیکھ ریکھ میں لگی رہی۔ساٹھ ستر اور اسی کی دہائی میں رنجیت اسٹوڑیو ملک بھر کے اسٹرگلروں کے لئے مہاتیرتھ کا درجہ رکھتا تھا۔اس اسٹوڑیو سے کئی گم نام لڑکے اسٹار بن کر نکلے تھے۔یہ وہ زمانہ تھا جب فلمسازوں کے بیشتر دفتر اسی اسٹوڈیو میں ہوا کرتے تھے۔اس کے عقب میں شری ساونڈ اسٹوڑیو تھا۔رنجیت سے آگے چل کر روپ تارا اسٹوڈیو تھا مگر جو دبدبہ رنجیت کا تھا وہ کسی اور اسٹوڈیو کا نہیں تھا۔میں بھی دس بارہ سال تک اس اسٹوڈیو کا طواف کرتا رہا۔یہیں پر میری ملاقات کیدار شرما سے ہوا کرتی تھی۔اسی اسٹوڈیو میں فلم رائٹرس ایسوسیشن کا دفتر بھی تھا اس لئے اس جگہ اپنا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔آج یہ اسٹوڈیو ویران پڑا ہے۔وہ اپنی خاموش زبان سے اپنا اتہاس بیان کر رہا ہے۔کیا دن تھے اس اسٹوڈیو کے۔کیا غلغلہ رہتا تھا یہاں۔اب وہ دن کہاں لوٹ کر آئیں گے۔

رنجیت موی ٹون نے 153 فلمیں بنائیں جن میں صرف سات فلمیں بازار میں دستیاب ہیں ۔ یہ فلمیں ہیں ''تان سین''''جوگن'' ''ہم لوگ''''فٹ پاتھ'' ''پاپی''''زمین کے تارے''اور''اکیلی مت جائیو''۔باقی فلموں کا نگیٹو اسٹوڈیو میں لگی آگ میں جل کر راکھ ہوگئے۔یہی وجہ ہے کہ اُن فلموں کا کہیں پر تذکرہ نہیں ہوتا۔سردار چندولال شاہ نے اس دنیائے فانی کو 25۔نومبر 1975 میں الوداع کہہ دیا جب کہ گوہر جان ماماجی والا کا انتقال 1984 میں ہوا۔

رس را بطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار

(راولپنڈی)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم،

''چہارسو'' کا جونمبر آپ نے خاکسار پر شائع کیا ہے اس کے لیے دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔ شمارہ بہت عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ آپ نے جو عزت اور محبت مجھ کو بخشی ہے میں اس کے قابل نہ تھا۔ شمارے کی ڈیزائننگ میں جگہ جگہ آپ کے اعلیٰ ذوق اور تخلیقی صلاحیت کے سراغ نظر آتے ہیں۔ ابتدا سے اختتام تک آپ کے جمالیاتی ذوق اور ذہنی وسعت کی فضا بکھری ہوئی ہے۔

اس شمارے سے قطع نظر بھی میں نے چہارسو کے جو خصوصی شمارے دیکھے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ آپ جس نظر سے مضامین اور تخلیقی تحریروں کا انتخاب کرتے ہوئے سارے مواد کو ایک کولاج یا اسمبلاژ کی شکل دے دیتے ہیں۔ اس کی تعریف میں جتنا بھی کہا جائے کم ہے۔ انٹرویو کے حوالے سے مجھے ڈر تھا کہ میرے بعض جوابات سے کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں مگر آپ نے جس خندہ پیشانی اور وسیع القلبی کے ساتھ انہیں شائع کیا وہ ایک نہایت ہی ایماندار اور باضمیر مدیر ہونے کی نشانی ہے۔ مجھے اس شمارے کو دیکھ کر سچی مسرت ہوئی ہے۔ ایک بار پھر صمیم قلب سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ آپ کی یہ محنت، لگن اور جستجو ہمیشہ قائم رہے۔ سلامت رہیں۔

خالد جاوید

گلزار بھائی، السلام علیکم۔

خالد جاوید کیا کمال کے انسان ہیں اس بات کا اندازہ اس باران کے نام قرطاس اعزاز پڑھ کر ہوا۔ وہ اپنے دور کے مانے ہوئے فکشن کے لکھاری ہیں۔ لیکن شمارے میں ان کا فون نمبر نہیں تھا شاید وہ اپنا فون نمبر سب کو نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس بار بھی دوستوں کو پڑھا اور پڑھ کر سر دھنا اور آپ کے لیے جو جو دعائیں یا دُعائیں ساری کی ساری کر ڈالیں۔ رعنا کوثر سے لے کر رینو جی تک نے اپنی تمام ادبی صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے اپنے افسانوں سے شمارہ سجایا ہے۔ نسیم اور ریاض بھائی نے اپنی اپنی شاعری سے سنوارا ہے اور پھر پیر جی نے اس بار نہ صرف کلکتہ کی سیر کرائی بلکہ وہاں کے تھیٹر کی تاریخ کے کئی ابواب یاد دلائے۔ مزہ آ گیا، بھئی کیا کہنے اور پھر اوپر سے مثالے دار چٹخارے شامل کر کے شمارے کو حسبِ سابق ایک نیا ذائقہ دیا۔ ہر بار کی طرح یہ شمارہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔

تابش خانزادہ (لاس اینجلس)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام اور آداب۔

خالد جاوید نمبر نے خوب ذہنی مشق کرائی۔ انٹرویو اور ان کا افسانہ ''مٹی کے تعاقب میں'' دونوں ہی آپ کو نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھانے والے ہیں۔ مجھ سے لوگ میری بعض نظموں کے بارے میں کہتے تھے کہ ان میں مایوسی ہے، قنوطیت ہے اور میں سوچتا تھا کہ یہ لوگ زندگی کی تصویر کیوں نہیں دیکھتے اور اس میں مایوسی ہی کیوں دیکھتے ہیں، آخر حقیقت بھی کوئی شے ہے اور موت بھی تو ایک حقیقت اور زندگی کا حصّہ ہے۔ سو، اس انٹرویو سے اطمینان ہوا کہ اگر خالد جاوید صاحب جیسے معتبر تخلیق کار کو بھی ایسی ہی باتیں سننی پڑتی ہیں تو الجھنے کی کوئی بات نہیں۔ بلکہ افسانہ ''مٹی کے تعاقب میں'' پڑھ کر تو مجھے ایک آدھ بار تو ایڈگر ایلن پو کا خیال آیا جو اذیّت کی تصویر کشی بڑے انہماک سے کرتا معلوم ہوتا ہے۔ موت تو آ گئی مگر اس کے بعد کی کہانی اور ہم کلامی نے لایعنیت کی کیفیت سے پُر کر دیا ہے ہے ان کے افسانے کو جس کا خلاصہ ہے کہ ''کاش کہ میں ڈگڈگی بجا کر تماشا دکھانے والے کسی مداری کا ایک معمولی سا بندر ہوتا۔۔۔'' میرے خیال میں اس افسانے کا نچوڑ ان دو ٹکڑوں میں ہے ''ظاہر ہے آپ میرا ایک لفظ بھی نہیں سن پائے ہیں۔ آپ کو تو صرف شور سننے کی عادت ہے۔ آپ صرف وہی سن پاتے ہیں جو دیکھ پاتے ہیں۔۔۔'' اور ''کاش کہ آپ کی دنیا میں باہر کی آوازوں کے لیے بھی تھوڑی سی جگہ ہوتی۔۔۔''

شعری حصّے میں طارق نعیم کی غزل میں انفرادیت محسوس ہوئی۔ نوید سروش کی غزل کے تین شعر خوب تھے ''دور ہے صحنِ چمن، تجھ سے ابھی موسمِ گل/ سازشیں ہونے لگیں خشک شجر میں کیا کیا''، ''آیئے آج جلاتے ہیں اجالے میں چراغ/ دیکھتے ہیں کہ تغیّر ہیں، سحر میں کیا کیا'' اور ''ایک احساس لیے جاتا ہے دروازے پر/ راز پوشیدہ ہوئے دستکِ در میں کیا کیا''۔ اس کے علاوہ ولاء جمال العسیلی کا مقطع، خالد احمد سجّاد کا شعر ''کیا کوئی اور بنائے گا دوبارہ مجھ سا/ کوزہ گر کچھ تو بتا چاک پہ گارا کیا ہے'' اور احمد ساقی کا مطلع اور نیچے سے دوسرا اور تیسرا شعر خوب ہے۔ مہناز انجم کی نظم ''ٹریش کین'' ابھی نظم ہے۔ العدروس کی ''امن کی فاختہ'' اپنے مضمون کی وجہ سے خوب لگی۔

میں ناول ''خاکِ شفا'' کے مکمّل ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔ قسط وار بھی پڑھا تو مگر ناول کے درمیان اتنا لمبا وقفہ کھلتا ہے اس لیے دوبارہ پورا ناول ایک ساتھ پڑھ کر اس کا اصل مزہ آئے گا۔ اس ناول کے مکالمے اتنے مزے دار ہیں اور بہاؤ کچھ ایسا ہے کہ اس کی ڈرامائی تشکیل بہت اچھی ہو سکتی ہے اور اس پر ایک دلچسپ ڈرامہ سیریل بن سکتا ہے۔ تاہم ایک بات جو بار بار کھٹکتی ہے وہ یہ کہ اس میں جو تاریخ نویسی کا عنصر ہے وہ کہانی پن کے لطف کو متاثر کرتا ہے۔ میرے خیال میں یہ تاریخی حوالے اگر معلومات کی شکل میں ناول کا حصّہ نہ ہوتے یا تفصیلات کے بجائے ایسے ٹکڑے برسبیلِ تذکرہ مختصراً مکالمے میں سموئے ہوتے تو بہتر ہوتا کہ اس طرح تاریخی مضمون کا تاثر کہانی کے تسلسل کو زک نہ پہنچاتا۔ اس

بات کو چھوٹا منہ بڑی بات کی گستاخی سمجھ کر معافی مل جائے تو ممنون ہوں گا۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

برادرِ عزیز گلزار جاوید جی۔ سلام مسنون۔

چہارسُو کا شمارہ کئی دن قبل مل گیا تھا مگر اسے پڑھنے کے لیے جی ڈھونڈتا رہا وہی فرصت کے رات دن، جو ادبی و دیگر مصروفیات میں کم کم ہی نصیب ہوتے ہیں۔

اس مرتبہ ہندوستان کے جس فکشن نگار خالد جاوید پر قرطاسِ اعزاز کی کہکشاں سجی ہے ان سے میرا تعارف تو بہت پہلے سے ہے کہ ان کی نظمیں اور افسانے ہندوستان سے ملنے والے جرائد میں پڑھنے کا موقع جدہ میں بہت ملتا رہا۔ تاہم ان کی شخصیت اور کام کے بارے میں پہلی بار تفصیلی علم ہوا اور اُن سے آپ کی براہِ راست گفتگو بھی گویا 'چہارسُو یا گو ہُو' پھیل گئی، اور جب یہ معلوم ہوا کہ ۲۰۲۲ء کا JCB ایوارڈ ان کے ناول ''نعمت خانہ'' کو ملا ہے جو کہ ہندوستان کی ۲۸ زبانوں میں اس سال پہلی بار اردو زبان کو ملا ہے تو پھر جناب خالد جاوید کو داد تو بنتی ہے کہ انہیں ملنے والا یہ اعزاز اردو زبان کو ملا ہے۔

چہارسُو کے بیک ٹائٹل پر شائع ہونے والے اس اعلان نے شاد باد کر دیا کہ جناب تابش خان زادہ کا ناول زہریلا انسان شائع ہو چکا ہے، اور کل آپ کے اس فون نے تو گویا منزلِ مراد کا سا منظر بنا دیا کہ اس کا ایک نسخہ آپ کے لیے اور دوسرا میرے لیے آپ تک پہنچ چکا ہے اور ایک دو دن میں مجھ تک پہنچ جائے گا۔ یہ بہت ہی دلچسپ ناول ''چہارسُو'' میں قسط وار پڑھ چکا ہوں مگر اب ایک ہی بار پڑھنے کا کچھ اور لطف ہوگا۔

غزلوں کے حصے میں سے بہت ہی اختصار کے ساتھ کچھ شعر جو بہت اچھے لگے، لکھ رہا ہوں:

جس کی گردن میں ہے پھندا، وہی انسان بڑا
سُولیوں سے یہاں پیمائشِ قد ہوتی ہے
(مظفر حنفی)

موجوں سے گفتگو رہی اپنی تمام رات
بزمِ سخن بپا رہی دریا کے شور میں
(محمود شام)

بات جو بھی ہو کہانی میں ہوا کرتی ہے
کوئی کردار ہ، کردار میں ہوتا کیا ہے
(طارق نعیم)

میری نسبت ہے چراغوں کے قبیلے سے میاں
میں ہمیشہ ہی سرِ ظلمتِ شب آیا ہوں
(احمد ساقی)

ایک نظم ''امن کی فاختہ'' پر شاعر کا نام 'عِد روس' دیکھا تو جی چاہا کچھ تصحیح کر دوں کہ میرے اس بہت اچھے دوست کا پورا نام ''عمر سالم العدروس'' ہے اور ان کا اختصاص یہ ہے کہ وہ کئی عشروں سے عربی کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی شعر کہہ رہے ہیں۔

پسِ تحریر یا پیشِ تحریر کے طور پر کہتا چلوں کہ دو تین دن سے پی ڈی ایف اور اِن پیج پر کوشش کے باوجود چہارسو کا یہ شمارہ پرنٹ نہیں ہو سکا، لیپ ٹاپ پر کھل بھی نہیں رہا لہٰذا اس کا سرسری سا مطالعہ کر کے اور بہت سی تخلیقات کی خواندگی فردا پہ ٹال کر جتنا کچھ موبائل فون کی سکرین پر پڑھ سکا اس پر اظہارِ خیال کر کے اجازت چاہتا ہوں۔ سلامت رہیں۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

چہارسو اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے جس تواتر اور تسلسل سے پابندیٔ وقت بلکہ قبل از وقت شائع ہو رہا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یوں تو چہارسو کا ہر شمارہ آپ کی محنت اور لگن کا آئینہ دار ہوتا ہے مگر خالد جاوید صاحب سے منسوب تازہ چہارسو نہایت شاندار اشاعت ہے جسے پڑھ کر بے ساختہ آپ اور خالد جاوید صاحب کے لیے دل سے دعائیں نکل رہی ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ اور آپ کے رفقائے کار اسی جواں مردی سے چہارسو کے سفر کو آگے بڑھاتے رہیں اور اردو ادب کے وقار میں اضافہ کرتے رہیں۔

پرویز شہریار (دہلی)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ خالد جاوید نمبر بے انتہا خوبصورت اور دلچسپ شمارہ ہے۔ خالد جاوید صاحب بلکل منفرد مصنف ہیں ان کی تحریر ''تفریح کی ایک دوپہر'' پڑھی تھی، تب سے ان کی برجستہ اور بے ساختہ تخیل کی مداح ہوں اور ان کی تحریروں کے جتنے بھی اقتباس نظر سے گزرے ہیں اچھوتے انوکھے اور دلچسپ ہیں اور خالد صاحب کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں ان کی ذات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کچھ بھی لکھیں کوئی قدغن نہیں مگر اس انداز سے کہیں کہ قاری کے دل میں اتر جائیں، کمال مصنف اور کمال شمارہ۔ بہترین معلومات فراہم کرنے والا اور مجھ سمیت دیگر نو آموز لکھاریوں کو متعارف کروانے والا انتہائی انوکھا اور منفرد جریدہ ''چہارسو'' جس کی خوشبو واقعی چہارسو پھیلی ہوئی ہے اور اس کے معیار پر پورا اترنا خود ایک معیار ہے اور زیرک مصنف اپنی تحریر اس رسالے میں بھیجنے سے پہلے خود کو تول لیتا ہے کہ کیا واقعی اس رسالے میں اسکی تحریر قابل اشاعت ہے؟ اگر تحریر شائع ہوگئی تو سمجھ جایئے کہ وہ کچھ معیاری لکھنے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ ''چہارسو'' وہ پارس پتھر ہے جو مٹی کو سونا بنا دے اور سونے کو کندن صلاحیتوں کو پرکھنے اور جلا بخشنے والے " چہارسو" کے لیے ڈھیروں دعائیں اور نیک خواہشات۔ معیار پر سمجھوتہ نہ کرنے والے مدیران اور تمام ممبران کے لیے بہت داد اور دعائیں۔ اللہ اس رسالے کو بہت ترقی اور کامیابی عطا کرے اور ساری دنیا

''چہارسُو''

میں اس میں لکھنے والے اور شائع کرنے والوں کا اقبال بلند ہو۔

ارم رحمٰن (لاہور)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ (جلد ۳۲۔شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۲۳ء) پر معروف و منفرد ناول و افسانہ نگار خالد جاوید کی تصویر یعنی گوشہ دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی۔ ''براہِ راست'' کی گفتگو بڑی توجہ سے دوبار پڑھی۔ ایسے قلم کار کی فکر کو سمجھنے کے لیے قاری کو بھی صاحب مطالعہ اور تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے۔ خالد جاوید صاحب کا خود کا یہی خیال ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے قارئین خود پیدا کیے ہیں۔ پھر اُن کا یہ ارشاد:

''تخلیقی عمل پُر اسرار شے ہے اور دوسروں پر اس کے پڑنے والے اثرات بھی پُر اسرار ہیں۔''

گارشیا مارکیز، گوگول، دوستووسکی، فرائڈ، ڈی ایچ لارنس ہو تو میں ٹی ایس ایلیٹ، ڈیل کارینگی کے حوالے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف ان سے متاثر ہیں بلکہ گھول کر پی گئے۔ چند مغربی لکھاریوں کو رد بھی کیا ہے۔ آپ کے سوال کے جواب میں خالد جاوید کا اعتراف کہ:

''میری کئی کہانیوں میں ڈبلیو ڈبلیو جیکب کے حوالے سے ہی استعمال ہوا ہے۔'' (ص۔۱۲)

اُن کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ ''ہر عہد کا اپنا ایک بیانیہ ہوتا ہے'' خالد جاوید کے اس نظریے پر بات ہو سکتی ہے سوچا جا سکتا ہے:

''فلسفہ اور ادب میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں یہ ایک ندی کے دو کنارے ہیں۔'' (ص۔۱۵)

آپ کے سوالات کا کمال رہا کہ ایسی گہری اور علمی گفتگو پڑھنے کو ملی آپ نے ''براہِ راست'' کے تعارف میں درست لکھا ہے:

''چہارسو کی ادارت کے تیس برسوں میں اس قدر بامعنی، پُر مغز اور پُر تاثیر تنقید سے روبرو ہونے کا موقع پہلی بار میسر آیا۔'' (ص۔۸)

مضامین کا بھی جواب نہیں سید خالد قادری، آصف فرخی، عتیق اللہ اور قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی کی تحریریں جہاں صاحبِ گوشہ کے فکر و فن کی تفہیم اور اعتراف ہے وہاں ہمارے علم میں بھی اضافے کا سبب ہے گوشے سے پہلے میں نے صرف ان کا ناول ''نعمت خانہ'' پڑھا تھا جس کے لیے شمس الرحمان فاروقی کا قول ہے ''ایسا ناول اردو ادب کیا انگریزی ادب میں بھی نہیں لکھا گیا۔ گلزار بھائی زندہ باد، ہزار ہا تحسین۔

''خاکِ شفا'' کی موجودہ قسط بھی گزشتہ قسطوں کی طرح پُر اثر اور دلچسپ، محسوس ہوئی کہ اب کہانی نئے موڑ کی جانب رواں ہے۔ اس قسط میں بھی ایک جہان آباد ہے کلکتہ (کول کتہ) تھیٹر یعنی دامیو یلے ہاؤس۔۔۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے جارج ولیم سن کے ہاتھوں افتتاح۔۔۔ ایکشن کی مقبولیت۔۔۔ نسوانی کرداروں کی کمی کا مسئلہ۔۔۔ بنگال میں گریش چندر کی تھیٹر کمپنی اور شاعری، مسلسل محنت، خدمت۔۔۔ بابائے ڈرامہ کہلانے والے مولانا آزاد کا ذکر اُن کے یہ لفظ شیر علی خان کے طنز کے جواب میں کہے:

''صاحب زادے۔۔۔ تم نے نیا پاکستان حاصل کیا ہے۔ اگر وہ مقصد اور نصب العین درست شکل میں نافذ نہ کیا تو تمہاری عمر۔۔۔ پچیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔'' (ص۔۱۱۴۔۱۱۳)

رابندر ناتھ ٹیگور اور اُن کے والد مہارشی دیوبندر کا شانتی نکیتن کا نصب العین، علم و ادب کی جستجو، یونیورسٹی میں موسیقی، رقص، مصوری، مجسمہ سازی، آرٹ وغیرہ۔ فورٹ ولیم کالج کا تذکرہ، گوہر جان کا ذکر۔۔۔ یہ ناول علم و ادب و ثقافت اور فن کے مختلف شعبوں کی تاریخ اور تبدیلیوں کو بیان کر رہا ہے ایسا لگ رہا ہے بلکہ یقین ہے کہ یہ اردو ادب کا ایک اہم اور بڑا ناول ہوگا۔ بہت خوب۔

رینو بہل کا افسانہ ''شور برپا ہے'' میں مہارت سے پہلے رشتوں کی ناقدری اور بے حسی اور پھر فن کار امبر اور سنبل کی بغیر کسی لالچ طوفانی محبت کا ذکر ہے نہ سماج، نہ مذہب اور ذات کوئی شے درمیان نہیں، موت نے محبت کو امر کر دیا۔ رعنا کوثر کا افسانہ کسی بھی انسان کے کسی جذبے کے شدید دباؤ کے پس منظر میں رونما ہونے والے واقعے کا شاخسانہ ہے۔ قانون کی بالا دستی مقدم ہے مگر انسان کی نفسیات اور اخلاقیات کو دیکھ سزا میں کمی۔ ارم رحمٰن کا زبردست افسانہ اور زعفرانی کھیر کیا زبردست علامتی نام رکھا ہے۔ خوب صورتی، گھریلو تہذیب، حقوق نسواں کی پائمالی، تہواروں کی اہمیت اور رونق مگر سب اشاروں کنایوں میں نسیمہ کا کردار بے مثال تخلیق کیا ہے۔ نسیمہ اپنے اندر کیا کیا دکھ چھپائے چہرے پر مسکراہٹ لیے حیاتِ مستعار کے دن گزارتی رہی اختتام بھی خوب کیا ہے۔ بہت اچھا افسانہ۔

دیپک کنول نے معروف و مقبول اداکارہ کی داستانِ حیات، کامیابیاں، محبت، شادی میں ناکامی، اپنا بھرپور بچن سے محبت نہیں ہار وغیرہ اس قسط میں مختصر لکھا۔ ریکھا کی آخری شادی اور کچھ خاص فلموں کا ذکر نہیں کیا۔

نسیم سحر صاحب اور شہزاد عالم شہزاد صاحب کی نعت میں محبت، عقیدت اور ایک سپردگی کی کیفیات ہیں۔ ''طلسمات'' عبداللہ جاوید کی نظم انسان کی بے قدری کے حوالے سے فکری تخلیق ہے۔ پروین شیر صاحبہ نے نظم ''آج'' ہمارے ماضی اور سائنس کی ایجاد میں انسان وقتی پناہ گاہ تلاش کر رہا ہے۔ مہناز انجم کی نظم ''ٹریش کین'' میں محترمہ نے پرانی، بے مصرف اور بوسیدہ چہروں سے اپنے اندر کی دنیا کا حال اور اپنی کیفیات بیان کی ہیں۔ ''ہونٹوں کی خوشی'' اور ''صحنِ چمن'' کے عنوانات سے غزلوں کا انتخاب لاجواب ہے۔ چنیدہ اشعار دینے سے خط کی طوالت کے سبب قاصر ہوں۔ ڈاکٹر ریاض احمد، رعنا کوثر، قیصر مسعود جعفری کے خط تحریروں کا اچھا تجزیہ ہیں۔

نوید سروش (میرپور خاص)

''چہارسُو''

جناب گلزار جاوید، آداب۔

تازہ شمارہ خالد جاوید صاحب کے نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سوالات اور جواب دلچسپ ہی نہیں بلکہ ٹکر کے تھے۔ اُن کا اندازِ بیان عام روش سے ذرا ہٹ کر ہے۔ تحریر پڑھ کر محسوس ہوا کہ یہ عام قاری کی پکڑ میں آسانی سے آنے والا نہیں۔ مٹی کے تعاقب کو پڑھ کر ایسا ہی لگا۔ خالد جاوید صاحب اور آپ کو کامیاب شمارہ نکالنے کے لیے، بہت مبارک۔

اس مرتبہ صرف تین افسانے ہی شامل ہیں۔ رعنا کوثر کا افسانہ امریکہ میں ہوئے دلخراش واقعے پر مبنی لگتا ہے جسے بڑی خوبصورتی سے کوثر صاحبہ نے بُنا ہے۔ ''زعفرانی کھیر'' دلچسپ کہانی ہے۔

ایک صدی کا قصہ میں ریکھا کے متعلق اچھی جانکاری ملی۔ اس مرتبہ ترجمہ کا افسانہ بھی پڑھنے کو نہیں ملا۔ شاعری حصہ بھی معیاری اور دلچسپ لگی۔

بات خاکِ شفا کی کریں تو پیرزادہ صاحب نے ممبئی کے بعد کلکتہ کی بھی خوب سیر کرائی۔ معلومات بھی بڑی مفید دی ہیں۔ کلکتہ تھیٹر، فورٹ ولیم کالج، شانتی نکیتن، مولانا عبدالکلام آزاد کی تفصیل اچھی لگی۔ ناول کے باب میں ڈرامے کا رنگ پسند آیا۔ اختتام ڈرامے کے انداز میں اچھا تھا اور آگے کی کہانی جاننے کا تجسس بھی بڑھ گیا۔

رینو بہل (چندی گڑھ)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ خالد جاوید صاحب سے موسوم ہے جو منفرد انداز میں باریک سے باریک جذبات اور احساسات کو اپنے دلچسپ افسانوں میں الفاظ کا جامعہ پہنا کر پیش کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اردو ادب میں خالد جاوید صاحب کی نمایاں خدمات کی تفصیل سے قارئین چہارسو کو متعارف کرنا قابلِ تحسین ہے۔

شمارہ میں اچھے افسانے اور شاعری بھی شامل کی گئی ہے۔ ''پیکر خاکی'' رعنا کوثر کا افسانہ ان حالات اور واقعات کی عکاسی کرتا ہے جو صدیاں گزرنے کے بعد بھی بظاہر ایک مہذب معاشرہ میں اب بھی موجود ہیں۔ پچھلی صدی اور اس سے پہلے ایک ایسا خوفناک دور تھا جب افریقہ میں سیاہ فام باشندوں کو بلاتمیز زبردستی پکڑ کر بحری جہازوں میں لاد کر امریکہ لایا جاتا اور وہاں مختلف شہروں کے مقرر شدہ مقامات پر انہیں فروخت کے لیے رکھا جاتا جہاں سے سفید فام امریکی انہیں ذاتی غلام کے طور پر خرید کر لے جاتے اور ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جاتے اور ان سے جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا۔ اس کے بعد بار بار کے احتجاج اور تحاریک کے بعد پچھلی صدی میں بظاہر کچھ بہتری آئی لیکن عملی طور پر انسانی حقوق کے علمبردار ملک امریکہ میں سیاہ فام باشندوں کو اب بھی نفرت اور بے رحمی کا نشانہ بنایا جاتا ہے جس کی ایک مثال کہانی میں بیان کی گئی ہے جب ایک پولیس والے نے معمولی بات پر ایک سیاہ فام امریکی کی گردن پر پاؤں رکھا اور تب ہٹایا جب وہ مر چکا تھا اس پر اگرچہ امریکہ میں خاص طور پر بہت احتجاج ہوا لیکن منافرت کی دیوار بدستور دلوں میں قائم ہے۔

''خاکِ شفا'' پیرزادہ آل انوار کی تحریر کردہ یہ قسط نہایت دلچسپ اور مختلف معاملات پر حیرت انگیز اور تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ مصنف کا گہرا مطالعہ، مشاہدہ، فنی مہارت اور اسلوب تحریر قابلِ تعریف ہے۔

رینو بہل کا افسانہ ''شور برپا ہے'' ایک نہایت دلچسپ اور عمدہ تحریر ہے جسے شروع کرنے کے بعد ختم کرنے سے پہلے ممکن نہ تھا۔

شاعری میں ولاء جمال العسیلی، مرزا ارشد سلطان، سیدہ نسیم بخاری، پروین شیر، محمود شام، مظفر وارثی (مرحوم) اور نسیم سحر کا کلام عمدہ اور متاثر کن ہے۔ اس ساری کاوش کے نتیجے میں ''چہارسو'' کا خوبصورت شمارہ ترتیب دے کر قارئین کی نذر کرنے پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

خالد جاوید نمبر بہت عمدہ تھا۔ اس صدی کے بہترین ناول نگار سے مکمل تعارف حاصل ہوا چونکہ چہارسو کے ذریعے تعارف حاصل ہوتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اپنے ہی ہیں۔

مولانا ابوالفضل صدیقی کے بھانجے ہیں خالد صاحب اور انہوں نے اپنے ماموں کا نام روشن کیا ہے۔ ان کی تعلیمی قابلیت ان کے لکھنے کا انداز سب ہی انہیں ایک اچھے گھرانے کا فرزند ثابت کرتے ہیں۔ براہِ راست میں آپ نے جو بھی چبھتے ہوئے سوال پوچھے ہیں اسی ذہانت سے کرارا جواب دیا گیا ہے۔ ایک مصنف کی اپنے لکھنے کے شوق سے دیانتداری کا یہ عالم ہے کہ ناول لکھنے سے پہلے انہوں نے پاگل خانوں کا دورہ کیا۔ یہ بھی بہت ہمت کی بات ہے۔ ادیب اتنا سنجیدہ ہو تو ایوارڈ کیوں نہ ملے۔ ان کے ناولوں سے متعلق مضامین بھی پڑھے مگر ابھی بہت کچھ پڑھنا باقی ہے۔ مکتوب لکھنے کا ایک وقت ہوتا ہے پڑھنے کا نہیں۔ لہٰذا بہت غور سے سب کچھ پڑھنا ہے۔

ناول خاکِ شفا بہت ہی اچھا لگتا ہے کیونکہ اس میں معلومات کا ایک خزانہ ہے اور یوں بھی نہیں لگتا کہ ہم تاریخ پڑھ رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ناول انفرادی ہے مثلاً تھیٹر کے بارے میں معلومات ملیں، فورٹ ولیم کالج کا قیام کیسے عمل میں آیا، ٹیگور خاندان کی علوم وفنون سے محبت، گوہر جان جیسی خواتین اور ان کا رہن سہن، سب سے بڑھ کر مولانا ابوالکلام آزاد کا آزادی کی جنگ میں حصہ اور تاریخی کلمات مصنف بہت کامیابی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

میں اس بات کی بے حد شکر گزار ہوں کہ اتنے اہم شمارے میں صرف تین افسانوں میں میرا افسانہ بھی قابلِ اشاعت سمجھا گیا۔ رینو بہل کا افسانہ ''شور برپا ہے'' خوبصورت جذبوں کی کہانی ہے۔ محبت اور ایثار کی کہانی وہ کردار جو معاشرے میں ناپسند کیے جاتے ہیں ان کے معصوم چہرے رینول بہل دکھاتی ہیں۔ ارم رحمٰن کا ''زعفرانی کھیر'' بھی اچھا افسانہ تھا۔ چھوٹی اور گھریلو لڑکیوں کی

آئیڈیل کوئی سچی سنوری عورت ہی ہوتی ہے۔اس کا کیا کردار ہے وہ نہیں جانتیں۔
محمود شام، راجیش ریڈی، ڈاکٹر ریاض احمد اور سارے شعراء کے کلام اچھے اور جامع۔پروین شیر کا کلام عمدہ۔
ایک صدی کا قصہ ''ریکھا'' کے بارے میں بہت دلچسپ لگا۔رس رابطے تو ہوتے ہی بہت اچھے ہیں۔تمام قارئین کو میرا سلام پہنچے۔

رعنا کوثر (نیویارک)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔
اس بار فکشن نگار پروفیسر خالد جاوید صاحب کا خصوصی شمارہ زیرِ نظر ہے ادبی باذوق قارئین کے لیے یہ ایک قیمتی خزانہ ہے۔میرے لیے اس گوشے میں سب سے بڑا اٹریکشن اس کا سوال نامہ ہے۔سوالات مدیرانہ صلاحیتوں کا نچوڑ وخم ہیں تو جوابات فکشن نگار کی زندگی سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر دو بہ دو تلخ اور جارحانہ ملاقات ہے۔
قرطاس اعزاز میں ارشد عبدالحمید ہوں، اشعر نجمی، آصف فرخی یا پھر پروفیسر عتیق اللہ یا پروفیسر شمیم حنفی اور دوسرے ناقدین ان سب کو پڑھ کر فکشن کے سلسلے میں بہت سے جھروکے اور روشندان کھلتے جاتے ہیں۔تنقید کے ایسے مختلف پہلو اور نظریات جو واہ واہی سے بہت دور ہیں۔ان کی تحریر ان کی تنقید یہ باور کراتی ہے کہ خالد جاوید منفرد کیوں ہیں؟
''قرطاسِ اعزاز'' میں ''براہِ راست'' گلزار جاوید یہ لکھتے ہیں کہ:
''چہارسو کی ادارت کے بتیس برسوں میں اس قدر بامعنی، پرمغز اور پرتاثیر تنقید سے روبرو ہونے کا موقع پہلی بار میسر آیا''
بلا شبہ ان تمام تحاریر کو یکجا کر کے قارئین تک پہنچانے کا اس کی ترسیل کا سہرا گلزار جاوید صاحب کے ہی سر ہے۔جیسے خالد جاوید نایاب ہیں گلزار جاوید بھی کمیاب ہی ہیں۔
افسانوی حصے میں تین افسانے ہیں اچھا انتخاب ہے۔رینو بہل کا افسانہ ''شور برپا ہے'' کا بیانیہ بہت اچھا ہے۔ثناء حضور صلی اللہ علیہ وسلم سبحان اللہ۔۔۔کیا کہنے۔
''خاک شفا'' بہت دلچسپ چل رہا ہے پندرہویں قسط کا انتظار رہے گا۔ابھی بس اتنا ہی پڑھ سکی مجھے ذرا وقت درکار ہوتا ہے۔باہر تا اندر اس خوبصورت شمارے کے لیے آپ کو پروفیسر خالد جاوید کو ہم سب کو دلی مبارکباد۔
ایک مرتبہ پھر آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کو سلام۔سلامت رہیں بیش قیمتی ہیں آپ، ادب کی ایسی بے لوث خدمات انجام دے رہے ہیں جس کا کوئی ثانی نہیں۔

نگار عظیم (دہلی)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔
اراکین چہارسُو اور قارئین چہارسو کی خدمت میں بہت بہت سلام عرض کرتی ہوں۔
ایک طویل غیر حاضری کے بعد پھر بزمِ چہارسُو میں حاضر ہوئی ہوں جس کے لیے بہت معذرت۔۔۔نجی مصروفیات اور زندگی کی بھاگ دوڑ اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ چہارسُو اور کئی دوسرے رسالوں سے تعلق منقطع ہو گیا تھا لیکن پھر خود کو جھنجھوڑ ڈالا کہ کہیں ادب سے دور نہ ہو جاؤں اور بے ادب لوگوں میں میرا نام نہ آجائے بس یہی سوچ کر جاوید بھائی آپ کا بھیجا ہوا چہارسُو بغور پڑھنے کی کوشش کی۔ایک بھرپور حُسنِ ادب کے دلکش جھلملاتے جلوے لیے مُسکرا رہا تھا۔ہمیشہ کی طرح اس بار بھی منجھے ہوئے افسانہ نگاروں کے دل میں اُتر جانے والے افسانے، بہترین تبصرہ نگاروں کے کُچھ تفصیلی اور کُچھ مختصر مگر دلچسپ تبصرے اور کہنہ مشق اور قابل شعراء کی اعلیٰ معیار کی خوبصورت پیغام لیے شاعری پڑھنے کو ملی۔دل بہت خوش ہوا کہ آج کے بھاگتے دوڑتے اور فاسٹ میڈیا کے دور میں ایسا بھرپور مواد پیش کرنے والے بھی کُچھ لوگ موجود ہیں جو قارئین کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے بہترین مواد سامنے لا رہے ہیں۔

ڈاکٹر نزہت شاہ (نیویارک)

Letters to editor

پاکستان کے ورلڈ ریکارڈز میں سے ایک حکیم سید ارشاد کا بھی ہے۔انہیں گنیز بک کی طرف سے یہ اعزاز اخبارات میں سب سے زیادہ مراسلات لکھنے پر ملا۔گجرات کے ماہر تعلیم حکیم سید ارشاد نے 1947ء سے 1987ء کے دوران مختلف سماجی اور قومی مسائل پر سینکڑوں مراسلات، قومی اخبارات کے مدیران کے نام تحریر کیے جن میں سے 602 خطوط پاکستان ٹائمز اور دیگر اخبارات میں شائع ہوئے۔گنیز بک آف ریکارڈز نے اپنے 2001ء کے ایڈیشن میں انہیں دنیا میں سب سے زیادہ Letters to editor لکھنے والا شخص قرار دیا۔1963 میں ان کے سب سے زیادہ 42 خطوط شائع ہوئے۔حکیم سید ارشاد کے یہ تمام خطوط 5 جلدوں میں کتابی شکل میں بھی اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔حکیم سید ارشاد 8 فروری 1908ء کو مالیر کوٹلہ میں پیدا ہوئے تھے اور 18 اکتوبر 1987ء کو وفات پا گئے۔وہ گجرات میں قبرستان متصل دربار سائیں کانواں والی میں آسودۂ خاک ہیں۔

..... تفکیر .....

جمیل احمد عدیل صاحب کی تازہ دو کتب موصول ہوئیں، تفکیر کے دو تین مضامین زیر مطالعہ آئے گو کہ اس سے پہلے میں انکے ایک افسانوی مجموعے، انکے سفر نامے اور ایک کالم کی کتب کا مطالعہ کر چکی ہوں اور انکی ذہنی اپروچ اور حیران کن استعداد کا اندازہ ہے مجھے، یہ استعداد نہ صرف انکے کالمز اور سفر نامے میں اٹھائے گئے سوالات میں نظر آتی ہے بلکہ انکے منفرد اور قدرے مشکل ڈکشن جسے میں ازراہ تفنن جناتی ڈکشن کہتی ہوں میں نکھر کر سامنے آتی ہے، ایسا ڈکشن اس سے پہلے ابوالکلام آزاد اور علامہ ضیا حسین ضیا کے ہاں نظر آتا ہے۔ اچھا یہاں مجھے ایک اعتراف کر لینے دیجیے، گزشتہ دنوں اپنے چھوٹے بیٹے کو اپنا ایک افسانہ دیا کہ پڑھ کر مجھے بتاؤ کیا سمجھ آیا، چار صفحات کے بعد کہنے لگا یہی باتیں سارا دن ہم سے کرتی ہیں اور یہی لکھ رہی ہیں آپکو سنتا تو ہوں تو Jameel Ahmad Adeel صاحب سے گفتگو کرنے والے سب لوگ یہ اعتراف کریں گے کہ یہ شخص گفتار و تحریر میں یکساں ہے اور جو لکھتا ہے اس میں بناوٹ نہیں ہے بلکہ یہ خالص اسکی فکری اور باطنی استعداد ہے۔

محمد حمید شاہد جیسا معتبر ادیب و نقاد کوزے میں دریا بند کرتا ہے اور انہیں شائستہ نقاد کہتا ہے اور بہت درست کہتا ہے، تنقید کو جو وقار جمیل احمد عدیل بخش رہے ہیں یہ اپنی جگہ ایک قابل ستائش عمل ہے اور انکے مطالعے کے بعد یہ آپ با آسانی کہہ سکتے ہیں کہ نقاد کسی نظریے کی ترویج نہیں کر رہا بلکہ بہت ایمانداری سے تحریر کا تجزیہ اپنے وسیع مطالعہ کی رو سے کر رہا ہے یہ عمل بالکل تحلیل نفسی جیسا ہے

ڈاکٹر وحید الرحمن کہتے ہیں کہ چائے و سگار کے شوق سے عاری "وہ کتابوں کی دنیا کا درویش ہے" تو بالکل درست فرمایا، جمیل احمد عدیل خود کو محض ایک سچا قاری سمجھتے ہیں اور انکے دن رات مطالعے میں ہی بسر ہوتے ہیں اور میں دعا کرتی ہوں کہ انکا یہ "مرض" چھوت کا مرض ہو اور اس مطالعے کی عادت میں بے شمار قاری پیدا ہوں۔

ان مضامین کو جس قدر عرق ریزی اور محبت سے لکھا گیا ہے اور جا بجا مختلف کتب سے حوالہ جات مہیا کیے گئے ہیں تو جمیل احمد عدیل ن م راشد کی نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ "محبّ کی تمنا ہوتی ہے کہ جو اسے دکھاء دے رہا ہے، محبوب کی آنکھیں نہ صرف وہی دیکھی بلکہ اسی طرح دیکھیں جیسے وہ دیکھ رہا ہے" تو تفکیر کے یہ مضامین جمیل احمد عدیل کی محبت کا شاخسانہ ہیں جن میں انہوں نے اپنے قاری کو بھی شریک کر لیا ہے

نصیر احمد ناصر مدیر تسطیر اور ایک معتبر شاعر ہیں یقیناً ان پہ بہت کچھ لکھا گیا ہوگا مگر یہ مضمون "نصیر احمد ناصر کا سخن زار۔ طائرانہ نظر" چیزے دگر است۔۔ ایک ایسا عمیق اور عمدہ تجزیاتی مضمون ہے کہ کوء بھی تخلیق کار اس طرح کے مضمون پہ فخر کر سکتا ہے۔

جمیل احمد عدیل کی شستہ اور نفیس زبان اور بے لاگ تنقید اس بات کی متقاضی ہے کہ انکے یہ مضامین کسی نہ کیسی لیول پہ اردو ادب کے سلیبس کا حصہ بنا دیے جائیں تا کہ وہ اردو جو عربی و فارسی اصطلاحات کے ساتھ بچی اب مر رہی ہے اور متروک کی جا رہی ہے وہ زندہ رہ سکے اور اردو ادب کے طلبا جان سکیں کہ تنقید یوں بھی لکھی اور کی جا سکتی ہے۔ ناقد ہونا آساں نہیں یارو کہ یہ حاشیے میں رہنے کا عمل ہے یہ تخلیق کے بعد جنم لینے والا عمل ہے اور ایک تخلیق کار تخلیق سے زیادہ تنقید اور مطالعے پہ وقت صرف کرے تو اسے مرد درویش ہی کہنا چاہیے کیونکہ تخلیق تو بڑے ناز سے اپنے ہونے کا اعلان کرتی ہے، خلق ہونے کا کرنے کا مان مگر ناقد اور جمیل احمد عدیل جیسا ناقد خاموشی سے وقت کے کاسے میں بنا کسی ستائش کی چاہ کیے سکے گرائے جا رہا ہے۔ یہ کتاب یقیناً اردو ادب کے ریسرچ سکالرز کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔ میری خوش بختی ہے کہ میرے ناول کو "تفکیر" میں جگہ ملی اور جمیل احمد عدیل صاحب نے مفصل اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا۔ مضمون آپکے ذوق مطالعہ کی نذر ہے۔

..... سیمیں کرن

..... بیگم سمرو .....

تازہ کتاب بیگم سمرو کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔ اس کی داستان میرٹھ میں پیدا ہونے والی لڑکی کے بارے میں جس کا نام فرزانہ تھا۔ وہ چھ برس کی تھی کہ باپ چل بسے، سوتیلے بھائیوں نے نہ صرف بچی بلکہ اس کی ماں کا بھی جینا دوبھر کر دیا۔ آخر دونوں کہ دلی کے بازار حسن میں پناہ ملی۔ بچی کا بوٹا سا قد اور دل کش ناک نقشہ ایک یورپین فوجی کو اتنا بھایا کہ اس کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ اس کے بعد تاریخ پر یقین نہیں آتا۔

..... رضا علی عابدی

یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی ہے اور تمام بڑے بک اسٹورز سے دستیاب ہے۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
کسی خواب کا نصیب
نظم کے ساحل پر
پاکستان میں انتخابات کی تاریخ
اشرف جاوید
رہ نوردِ شوق
نسیم سحر
متاعِ کتب
جلاوطن کہانیاں
وقت